

ماہنامہ اسلامیک

خواجہ عسکرا اللہ اختر
(رہیق ادارہ ثقافت اسلامیہ)

4833

مطبوعات ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
(پاکستان)

ایگزٹ

۱۹۵۲ء

ج اول

DATA ENTERED

19237

NAME

4733

فہرست مضامین ذہبِ اسلامیہ

نمبر صفحہ	مضمون	بار
۱ تا ۱۶	مؤرخین اسلام	۱
۱۶ تا ۲۷	ذہبِ اسلامیہ	۱
۱۶ تا ۲۰	(۱) شیعہ ذہب	۱
	سبائیت و کیسائیت و عارثیت و بہائیت و منصوریت و خطابیت اور اسکی شاخیں در اوتدیہ و عیسویت و مغیرت و باقرت و جعفریت و اسماعیلیت و امامت اثنا عشرت	
۲۰ تا ۲۷	(۲) خوارج	۲
	ازارت و نجدات عازریہ و پرستیت و عجاروہ و صلینت و میمونیت و حمزیت و اطرافیت و خلفیت و خازمیت و شعیبیت و مغلوبیت و ثعلبیت و شعیبائیت باقیہ امرجیت	
۲۸ تا ۵۰	اسباب تفرقہ	۳
۵۰ تا ۵۶	تقابل	۳
۵۶ تا ۶۵	سیاسیات	۳
۶۵ تا ۷۰	فلسفہ	۳

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۷	عصمتِ انبیاء	۸۰ تا ۸۰
۸	شفاعت	۹۰ تا ۸۰
۹	امامت	۱۱۰ تا ۹۱
۱۰	شجرہٴ نسبِ امامانِ شیعہ	۱۱۲ تا ۱۱۱
۱۱	انتباه	۱۱۲ تا ۱۱۳
۱۲	مذہبِ شیعہ	۱۱۴ تا ۱۰۵
	مختاریہ	۱۱۸ تا ۱۱۲
	اشمیہ	۱۲۱ تا ۱۱۹
	زراعیہ	۱۲۳ تا ۱۲۲
	کمالیہ	۱۲۵ تا ۱۲۲
	علیائیہ	۱۲۵
	مغیریہ	۱۲۶ تا ۱۲۵
	منصوریہ	۱۲۹ تا ۱۲۸
	خطابیہ	۱۳۹ تا ۱۲۹
	مسئلہٴ تثنیت	۱۴۲ تا ۱۳۹
	تحقیق لفظِ سید	۱۴۲ تا ۱۴۳
	قرمطیہ	۱۴۴ تا ۱۴۲
	اشناخشریہ	۱۴۶ تا ۱۴۴
	فرامیہ	۱۴۸
	راوندیہ	۱۴۸
	ربعیہ	۱۴۸
	زیدیہ	۱۴۸ تا ۱۵۰

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
.. ..	کریمیہ	۱۵۰ تا ۱۵۷
.. ..	ماقریدیہ	۱۵۷
.. ..	شیخ احمد حسانی	۱۵۷ تا ۱۶۲
.. ..	سید علی محمد باب	۱۶۲ تا ۱۷۵
.. ..	۱۳ کے غوراج :-	۱۷۴
.. ..	ازار قہ وغیرہ	۱۷۴ تا ۱۸۳
.. ..	۱۳ کے معتزلہ :-	۱۸۳ تا ۱۸۷
.. ..	۲۷۶	۱۸۷
.. ..	نواصلیہ	۱۸۷ تا ۱۹۹
.. ..	مشکلہ تقدیر	۱۹۹ تا ۲۰۵
.. ..	ہدیہ	۲۰۵ تا ۲۰۹
.. ..	نظامیہ	۲۰۹ تا ۲۰۷
.. ..	بشریہ	۲۰۷ تا ۲۰۸
.. ..	شامیہ	۲۰۸
.. ..	ہشامیہ	۲۰۸ تا ۲۰۹
.. ..	بحاخطیہ	۲۰۹ تا ۲۱۰
.. ..	خیاظیہ	۲۱۰ تا ۲۱۱
.. ..	۱۵ - جبریتہ :-	۲۱۲ تا ۲۱۳
.. ..	ہمینیہ	۲۱۳ تا ۲۱۴
.. ..	نجاتیہ	۲۱۴ تا ۲۱۶
.. ..	برغوثیہ	۲۱۶
.. ..	ذعفرانیہ	۲۱۶ تا ۲۱۸
.. ..	ضراحتیہ	۲۱۸

مضمون

نمبر شمار

نمبر صفحہ

۲۲۰ تا ۲۱۹	۱۴	صفائیتہ :-
۲۲۸ و ۲۲۰	۱۷	ابوالحسن اشعری :-
۲۲۹	۱۸	مسئلہ امیری (معراج)
۲۲۰	۱۹	مذہب اسلامیت حاضرہ
۲۸۲ و ۲۷۵		مرسید احمد خاں عفریہ
۲۸۶ و ۲۸۲		حقیقت وحی
۲۸۷ و ۲۸۶		پنجاب
۲۸۸		اہل قرآن
۳۰۸ و ۲۹۶		[Redacted]
۳۰۹		تبصرہ
۳۳۳ و ۳۱۳		عالم انسانی کا آئینہ مذہب

دیگر مطبوعاتِ ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

انگریزی :-

- ۸۰۸ (۱) اسلامک ایجوکیشنل سوسائٹی (مؤلفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے ایل ایل بی بی بی ایچ ڈی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۲) فنڈ مینٹل ہیومن ریٹرنڈ (مؤلفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے ایل ایل بی بی بی ایچ ڈی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۳) وی ٹیلیسی آف مارکسزم (ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے بی بی ایچ ڈی) ۸۰۸

اردو :-

- ۸۰۸ (۴) عقائد و اعمال (مؤلفہ محمد مظہر الدین صدیقی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۵) اسلام میں حریت، مساوات، اخوت (مؤلفہ خواجہ عباد اللہ اختر) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۶) اسلام اور حقوقِ انسانی (مؤلفہ خواجہ عباد اللہ اختر) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۷) اسلام کا معاشی نظریہ (مؤلفہ محمد مظہر الدین صدیقی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۸) دینِ فطرت (مؤلفہ خواجہ عباد اللہ اختر) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۹) اسلام کی بنیادی حقیقتیں (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم و دیگر رفقاء ادارہ) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۰) اسلام کا نظریہ تعلیم (مؤلفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے بی بی ایچ ڈی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۱) اسلام کا نظریہ اخلاقی (مؤلفہ محمد مظہر الدین صدیقی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۲) علم تصوف (مؤلفہ خواجہ عباد اللہ اختر) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۳) مقام سنت (مولانا محمد جعفر ندوی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۴) خلافتِ اسلامیہ (مؤلفہ خواجہ عباد اللہ اختر) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۵) اصول فقہ اسلامی - حدود اللہ و تعزیرات (مؤلفہ خواجہ عباد اللہ اختر) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۶) اسلام کا نظریہ تاریخ (مؤلفہ محمد مظہر الدین صدیقی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۷) تہذیب و تمدنِ اسلامی (حصہ اول) (مؤلفہ رشید اختر ندوی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۸) تہذیب و تمدنِ اسلامی (حصہ دوم) (مؤلفہ خواجہ عباد اللہ اختر) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۱۹) مسئلہ اجتہاد (مؤلفہ مولانا محمد حنیف ندوی) ۸۰۸
 ۸۰۸ (۲۰) قرآن اور علم جاہد (مؤلفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے بی بی ایچ ڈی) ۸۰۸

زیادہ طبع کتابیں

(۸) تہذیب و تمدنِ اسلامی (حصہ سوم)	(۱) فقہ عمر
(۹) اسلام میں حیثیت نسواں	(۲) بیدل
(۱۰) مسئلہ زمین	(۳) اصول الفقہ (اردو ترجمہ)
(۱۱) جدید اسلامی ریاست	(۴) الطرق الحکمیۃ (اردو ترجمہ)
(۱۲) پنجاب	(۵) اسلام اور فطرت
(۱۳) ۶۰ یمن ان اسلام	(۶) طبیب العرب
(۱۴) اسلام اینڈ کامیونزم	(۷) انبیاء

ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ - کلک روڈ - لاہور

کے
علاقہ
منا
کے
علاقہ
امون

مؤرخین اسلام

مؤرخین اسلام نے اپنی تواریخ عمومی میں ان مذہبی فرقوں کے حالات کم و بیش لکھے ہیں جو مسلمانوں میں عقائد کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ لیکن بعض مؤرخین کی تاریخ کا یہ خاص موضوع ہے۔ ان میں سے بعض مؤرخین کی کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں۔ ان کے نام تذکروں میں زندہ ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں مؤرخین کی تواریخ عمومی اور خصوصی سے جو کچھ لیا ہے۔ اس کا حوالہ علیحدہ علیحدہ نہیں دیا۔ قابل ذکر چند نام ہیں۔ جن کی کتابیں خاص شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ مؤرخین اور ان کی کتابوں کا مختصر تذکرہ سر دست کافی ہے۔

ابو منصور عبدالقادر ابن طاهر البغدادی
(متوفی ۴۲۹ھ)

تیسری صدی ہجری میں مامون خلیفہ عباسی کے عہد میں علماء و حکماء اسلام کی توجہ خاص کر مذاہب اقوام عالم

کی طرف مبذول ہوئی۔ خود خلیفہ علم دوست تھا۔ اس نے مختلف مذاہب کے علماء کو دعوت عام دے رکھی تھی کہ اپنے اپنے مذہبی عقائد کا اظہار مجالس مباحثہ و مناظرہ میں آزادانہ کریں۔ جسے مذہبی آزادی کہتے ہیں وہ تو "لا اکراہ فی الدین" کے تحت ہر شے کو حاصل تھی۔ لیکن مباحثہ و مناظرہ میں اپنے مذہبی عقائد کی صداقت اور دوسرے مذاہب کے خلاف ابھی تک کسی نے کچھ نہ کہا تھا۔ اس کی طرح مامون نے ڈالی۔ اس وقت تک اگر کسی نے اپنے مذہب کی تائید میں کچھ لکھا تھا

تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک مذہبی فرقہ کے نمائندہ یا ایک فرد کی ذاتی رائے تھی۔

اب دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں مورخین اسلام نے تاریخ مذاہب لکھتی شروع کی۔ ہر ایک مورخ کا تعلق کسی نہ کسی مذہب یا فرقے سے تھا۔ غیر مذاہب کا تذکرہ لکھتے وقت جب وہ دیکھتا کہ اس کے اپنے عقائد پر بھی زور پڑتی تو وہ غیر مذاہب کی تردید بھی ضمناً کرتا۔ اس طبقہ کے مورخین میں سے ابن حزم کی کتاب "الفضل" اور ابوالمعالی کی "بیان الادیان" اور سید مرتضیٰ رازی کی "تبصرۃ العوام فی معرفۃ مقالات الانام" اور ابو منصور بغدادی (متوفی ۱۰۳۷ء) کی کتاب "الفرق بین الفرق" مشہور ہیں۔

بغدادی کا تعلق فرقہ "اشعریہ" سے تھا جو مسلمانوں میں کٹر (ORTHODOX) سمجھا گیا ہے۔ اس نے ایک ضخیم کتاب بنام "اصول الدین" لکھی۔ اسی کا خلاصہ

کی تاریخ خصوصی "الفرق بین الفرق" ہے۔ اس کتاب میں بغدادی مسلمانوں کے

ان فرقوں کے عقائد کا فرق واضح کرتا ہے جو اس کے اپنے زمانے میں موجود تھے

ان کے عقائد کی تردید بلاشبہ وہ برہان اور دلائل معقول و منقول سے کرتا ہے

سابقہ ہی "لعنہ اللہ علیہم اجمعین" کا بھی اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اس کے تعصب

کا یہ عالم ہے کہ امام فخر الدین رازی صاحب "تفسیر کبیر" جو خود بھی تعصب میں

سے کم نہیں اپنی کتاب "مناظرات" میں لکھتا ہے کہ

"ایک دن شرف الدین مسعودی میرے پاس شادان فرما آیا۔ میں

نے پوچھا کہ آج کیا بات ہے کہ آپ خوشی سے جامہ میں پھولے نہیں

سماتے۔ کہا کہ خوش قسمتی سے چند کتابیں ہاتھ لگی ہیں۔ میں نے منہ

مانگی قیمت کتب فروش کو دی۔ اور یہ خزانہ بے ہماستے داموں مول

لیا۔ میں نے پوچھا کہ میں بھی تیسوں ان کتابوں کا نام کیا ہے؟ اس نے

ان کا نام بتایا۔ ان میں سے ایک شہرستانی کی کتاب "ملل و نحل" بھی تھی

میں نے کہا کہ شہرستانی نے اس کتاب میں مذاہب اہل عالم کا ذکر کیا

ضرور کیا ہے مگر قابل اعتماد نہیں۔ اس لئے کہ جہاں تک مذاہب اسلامی کا تذکرہ ہے۔ اس نے ایو منصور بغدادی کی کتاب الفرق بین الفرق کی نقل کی ہے۔ اور بغدادی سخت متعصب اشعری ہے جس نے حقیقت کی صورت ہی مسخ کر دی۔ اور شہرستانی نے اسی پر اعتماد کیا۔ اس لئے وہ خود بھی قابل اعتماد نہیں۔

امام صاحب نے اپنے دوست کے جذبات مسرت کو جس بیدردی سے کچلا ہے تو اس کا دل ہی جانتا ہوگا۔ لیکن سرورست ہمیں اس کتاب میں بغدادی کی ذاتی رائے یا عقیدہ سے بحث نہیں۔ ہمارے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ بغدادی نے راجح الوقت اسلامی مذاہب کی تاریخ لکھی اور وہ کیا ہیں؟ ہمیں دیگر ذرائع سے بھی ان کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اصول تحقیق پر رکھے جا سکتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی بلاشبہ بلند پایہ عالم ہے اور فن تنقید میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ اس فن میں آپ کی کتاب مناظرات "حیدرآباد دکن میں ۱۳۵۵ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں آپ نے حسن بن صباح کے عقائد کا کھنڈن دل کھول کر کیا ہے۔ امام صاحب کی تنقید کی کیفیت ہے کہ مخالفت آپ کو امام المشککین (SCEPTICES) کہتے ہیں۔ اور عارف رومی کا ارشاد ہے کہ

گر باسند لال کارویں بدے فخر رازی راز دارویں بدے

پلئے استدالیان چو میں بود پائے چو میں سخت بے تمکین بود

امام صاحب نے حسن بن صباح کی کتاب "فصول چہار گانہ کی تردید لکھی ہے کتاب "فصول" فارسی میں تھی۔ مگر آج اس کا نشان نہیں ملتا۔ ہمیں امام صاحب کا ٹکڑا گزار ہونا چاہیے کہ اس کتاب کے اقتباسات شرح و بسط سے محفوظ کر دتے یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ آپ نے ناوانستہ یادداشتہ حسن کے برہان کو کہاں تک مسخ کیا ہے۔

بغدادی کی کتاب "الفرق بین الفرق" کی قدر و منزلت اس لئے بھی ہے۔ کہ

شہرستانی اور دیگر مورخین نے جو بعد میں آئے اسی کا حوالہ زیادہ تر دیا ہے۔ بغدادی کی
 غرض تو صرف اتنی تھی کہ مختلف اسلامی فرقوں کے عقائد کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح
 کرے کہ ان کا باہمی اختلاف کس حد تک ہے اور اس کے اپنے مذہب "اشعریہ"
 کے کس حد تک مخالف ہیں۔ ان فرقوں کا مفصل مذکور مناسب مقام پر
 کریں گے۔

عبد الکریم شہرستان میں

۱۲۶۰ھ میں پیدا ہوا

شہرستان صوبہ خراسان واقع

ایران کا ایک شہر ہے۔

سید تاج الدین ابوالفتح محمد بن ابی القاسم

عبد الکریم بن ابی بکر احمد شہرستانی

نوارزم (خیوان) اور مرو اور نیشاپور کے درمیان ہے۔ شہرستانی کی تصنیفات
 سے اکثر زمانہ کی دستبرد سے فہائع ہو گئیں۔ علم کلام میں تصنیف "نہایتہ الاقدار"
 اور "المصداغۃ الفاسفہ" موجود ہیں۔ شہرستانی نے "المصارعۃ" شیخ الرئیس کے
 بوعلی سینا کے رویں لکھی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے شہرستانی کے رویں "مصابر
 المصارع" لکھی۔ اس کے علاوہ شہرستانی نے تفسیر قرآن "مفاتیح الدار" اور
 "مصابیح الابدار" بھی لکھی جو آخر سورہ بقرہ تک ہے۔ اس کے بارے میں ابوالحی
 بیہقی لکھتا ہے کہ:-

"اصول حکمت کے موافق آیات کی تاویل کی گئی ہے۔ میں نے اسے لکھا کہ

یہ صحیح طریقہ نہیں، تاویل وہی صحیح ہے جو صحابہ یا تابعین نے کی ہے۔ حکمت

کا ربط تفسیر و تاویل قرآن سے نہیں ہے اور جس خوبی سے غزالی نے شریعت و

حکمت میں ربط دیا ہے تجھ سے نہ ہو سکا۔"

لیکن شہرستانی کی شہرت اس کی کتاب "المسلل والنحل" کی وجہ سے ہے۔ اس

ترجمہ عربی اور انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے ماخذ "صفوان الحکمتہ"

"ادیان العرب" اور "فصول چہارگانہ" وغیرہ ہیں۔ "صفوان الحکمتہ" فلسفہ میں ہے۔

اس کتاب اب نایاب ہے۔ "فصول چہارگانہ" بھی بے نشان ہے۔ "ادیان العرب" فطوح جاحظ کی تالیف ہے۔

شہرستانی سلطان سنجر سجوقی کے مقربین میں سے تھا۔ آخر عمر میں گوشہ عزلت تیار کیا۔ ۵۴۹ھ میں وفات پائی اور شہرستان میں دفن ہوا۔

سن فانی | محسن فانی کی اصل کشمیر ہے۔ کتاب "دبستان مذاہب" اس سے منسوب ہے۔ اس کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ مؤلف ان مذاہب

کے علماء سے ملا جن کا ذکر اس کتاب میں کرتا ہے۔ جو کچھ ان علماء نے اپنے مذہب کے

میں بتایا وہی کچھ بلفطہ لکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص اپنے ہی مذہب کی خوبیاں بیان

کرتا ہے۔ اس لئے اس کتاب کے مطالعہ سے مذاہب مذکورہ کی خوبیاں جو کچھ ان کے

ذہن میں تھیں، واضح ہوتی ہیں۔ دبستان مذاہب میں ایک خاص قابل توجہ بات ایرانی

ریقوں کی سرگرمی کا تذکرہ ہے۔ جو مسلمانوں کے لباس میں کفر و الجاد کی اشاعت کر رہے

تھے۔ مؤلف ان سے بلا اور ان کے حالات پوسٹ کنندہ بیان کرتا ہے۔ اس کی تائید

فارسی زبان میں قاسم زادہ ایرانی نے بھی اپنی کتاب "مجلوہ ریزی روح ایران" میں کی ہے۔

سم زادہ کہتا ہے کہ :-

"اب جب کہ ہماری قومی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ ہمیں علانیہ عربی زبان اور

عربی دین اسلام کو ترک کرنا چاہیے۔ اور وہی پنا سیدھا سا مذاہب زرتشت از سر نو اختیار کرنا

چاہیے۔ عربی الفاظ کو زبان پارسی سے خارج کرنے کی مہم تو ایران میں عرصہ سے شروع

ہو چکی تھی۔ اب فارسی جدید ژند کے قریب آرہی ہے۔

بو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الظاہری | ابن حزم ہسپانیہ کے مشہور شہر

قرطبہ میں ۳۸۴ھ میں پیدا ہوا۔

عبد و کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ مورث اعلیٰ معدان یزید بن ابی سفیان صحابہ حرم بن امیہ

بن عبد شمس اموی کا مولیٰ تھا۔ ابن حزم کی اصل فارس ہے۔ حافظ قرآن اور علوم حدیث

و فقه کا بہت بڑا عالم تھا۔ ابتدا میں شافعی المذہب تھا۔ پھر اہل الظاہر کا مذہب اختیار

کیا۔ پاپ اور یہ دونوں حکومت کے اعلیٰ مناسبت پر فائز رہے۔ ابن حزم جب دنیوی ریاست سے کنارہ کش ہو گیا تو تحصیل علوم اور عبادت میں لگ گیا۔ وہ خود بہت کتابوں کا مصنف و مؤلف ہے۔ اور سب اسلامیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ فقہ حدیث میں

"الایصال الی فہمہ المفصل الجامعہ لجمہل شرایع الاسلام" ہے۔ اس میں اس نے

صحابہ اور تابعین اور ائمہ دین کے اقوال کا جا بجا حوالہ دیا ہے۔ ایک اور ضخیم کتاب میں

مسائل فقہ اور مختلف مذاہب کے عقاید پر تنقید کی ہے مشہور تصنیف "الاحکام

لاصول الاحکام" ہے۔ ابن حزم نے اپنے زمانہ اور اس سے پیشتر مسلمانوں کے اکثر

فروق کا تذکرہ جو گزرے یا جن کے آثار موجود تھے، اپنی کتاب "الفصل فی الملل والاعطواء

الملل" میں کیا ہے۔ شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں ابن حزم کا اکثر حوالہ

دیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن حزم کی اور بھی بہت تصانیف ہیں۔

ابن خلیکان بحوالہ ابن بشکوالی: ابن حزم کے حق میں لکھتا ہے کہ علوم اسلامیہ میں اور

علوم اللسان اور بلاغت اور شعر اور تاریخ و سیر میں اس کا جواب نہیں۔

کہتے ہیں کہ اس کی تالیفات کی تعداد چار سو ہے جو آٹھ ہزار اوراق پر مشتمل ہیں۔ ابن

حزم کی زبان اور حجاج بن یوسف کی تلوار ان ایام میں ضرب المثل تھی۔ وفات ۴۵۶ھ

۱۰۶۴ء میں واقع ہوئی۔

ابن حزم نے منطق محمد بن حسن المذہبی قرطبی المعروف بابن الکنانی سے پڑھی، جو

ادیب شاعر اور طبیب بھی تھا اور طب اور ادب میں رسائل لکھے ابن حزم نے اپنی تصانیف

میں منطق سے بہت کام لیا۔ الفصل فی الملل میں لکھتا ہے کہ

"وحدت کا وجود واجب ہے کیونکہ یہ تمام اعداد کی اصل ہے، اس مادی دنیا میں واحد

کا وجود مفقود ہے کیونکہ ہر ایک شے قابل تقسیم ہے اور اس طرح کثرت میں رونما ہوتی ہے۔

اس لئے وحدت مجردہ اس دنیا میں نہیں۔ لیکن چونکہ اس کا وجود واجب ہے اس لئے

اس مادی دنیا سے باہر ہے۔ اور یہ اللہ ہے۔ اللہ کی ذات حقیقت واحدہ ہے۔ چار نام ہیں

تفاضل عقل اس کی ذات کے ہیں۔ "احد" اور "اول" اور "حق" اور "خالق"۔ اس کا جسم

نہیں۔ کیونکہ جو جسم خلق کرتا ہے خود جسم نہیں ہو سکتا۔ وہ نہ تو متحرک ہے نہ ساکن۔ ایسی کمثلہ
 شیعہ اس کا علم اور دوسری صفات ہماری صفات کی طرح نہیں۔ بحث فی الصفات
 باری تعالیٰ ایک بدعت ہے جس کی طرح معتزلہ اور جہا بن الحکمہ اور دوسرے ائمہ
 سے ڈالی۔ اللہ کی صفت ہے کہ وہ خلق فرماتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ اس کے لئے مجبوز
 بھی ہو جائے تو خلق نہ فرمائے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ چونکہ وہ خالق ہے اس لئے بغیر
 خلق نہیں رہ سکتا تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ عالم بھی علی سبیل بدلیت قدیم ہے۔ اس طرح
 شرک فی الوجود لازم آئے گا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ ان تعلقات کی ضرورت ہی کیسے ہے۔ اگر
 اب عالم موجود ہے اور اس کی موجودگی سے شرک فی الوجود لازم نہیں آتا تو اگر سبیل بدلیت
 مان بھی لیا جائے تو کیا قباحت ہے حقیقت یہی ہے کہ عالم بذاتہ قائم اور مستقل نہیں، قائم
 بالحق ہے اور ہمیشہ اس پر تغیرات واقع ہوتے ہیں اور معرض فنا میں ہے اور یہ بھی حقیقت
 ہے کہ جسے ہم قدیم یا حادث کہتے ہیں وہ وجود ہی کی دو صفات ہیں۔ اس موضوع پر
 ہم نے اپنی کتاب "علم تصوف" میں بحث کی ہے۔ اور ان اوراق میں بھی مناسب مقامات
 پر بحث کی جائے گی۔ لیکن ابن حزم کا نظریہ صحیح ہے کہ خواہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ظہور
 نہ ہو اس صفت کی نفی نہیں ہو سکتی۔ ظہور تو ہمارا ہی شعور ہے۔ ورنہ ظاہر و باطن وغیرہ
 اصطلاحات نسبتی امور ہیں اور عالم انہی نسبتی امور کا مجموعہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو عالم
 بھی نہ ہو۔ اسلامی فرقوں بالخصوص معتزلہ نے یونانی فلسفہ کے زیر اثر جو بحث صفات
 تعالیٰ کے بارہ میں کی ہے وہ محض وماغی تعیش ہے۔

یوہم چندوچہ دچوں بیچ بے ہودہ :

ہمیں بس است کہ من بندہ او خدا خداست

(مولف)

ان فلسفیوں اور ان کے حامیوں کو اتنا شعور نہیں کہ بقول ہر برٹ سپنسر کسی زمانہ
 میں حکما کے نظریوں پر حکما کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو واجب ہے کہ خلف
 سلف سے اختلاف کرے ورنہ ذہنی ارتقا رک جائے گا۔ اس موضوع پر ہم معتزلہ کے
 تحت بحث کریں گے۔ فلسفیوں کے خلاف تمام انبیاء و رسل کا توحید پر اتفاق قابل ہے

دیگر مورخین اسلام

مورخین اسلام کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی فرقہ سے رہا۔ ہماری طرح وہ فرقہ بندی سے بالاتر نہ تھے اس لئے انہوں نے زیادہ تر وہی باتیں لکھیں جو ان کو اپنے عقائد کے خلاف دکھانی دین اور ان کی تردید بھی کی۔ مگر یہ سوچنے کی بات ہے کہ ان فرقوں کے عقائد میں یا ان باتوں میں جو وہ منوانا چاہتے تھے کچھ ایسی کشتش ضرور ہوتی چاہئے کہ لوگ کھپے چلے آتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی سیاسی اعتراضات کی تکمیل کے لئے چالاک لوگ اہلہ قریب باتیں بناتے رہتے ہیں اور وہ اسلامی فرقے جو اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان میں سے بعض کامیاب بھی ہوئے، مستثنیٰ نہیں ہیں۔ لیکن جو وہ کہتے اور لوگ تسلیم کرتے دیکھنا یہ ہے کہ اس میں صداقت کہاں تک ہے۔ انسانی فطرت اور ہر ایک زمانہ کی انسانی ذہنیت کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ آج بھی اسی فطرت اور ذہنیت کا مظاہرہ ہے جو آج سے ایک ہزار سال پہلے دنیا اسلام کر رہی تھی۔ ہم نے "لیگ آف نیشن" کو بننے اور بگڑتے دیکھا۔ امن کے نام پر قائم ہوئی اور زیادہ سے زیادہ بدامنی کا موزہ بنی۔ اس کی جگہ "یو، این، او" نے لی اور موجود ہے۔ یہ بھی امن کی علم بردار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ارض میں وہ فتنہ و شر اور جنگ و جدل جو آج رونما ہو رہا ہے، پہلے تاریخی زمانہ میں کبھی اس وسیع پیمانہ پر نہیں ہوا جو آج شائع ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر "امن" بہر حال پسندیدہ ہے اور اس میں کشتش ہے کہ اکثر حکومتیں اس میں شامل ہیں۔

یہ عمل لوگوں کی باتیں کہتی ہیں اہلہ قریب

واعظان امن کی ہنگامہ آرائی کو دیکھ (المولف)

وہ اسلامی فرقے جن کے عقائد میں سیاسی اعتراضات کارفرما تھیں، مذہب کے نام پر اٹھے۔ اس لئے کہ مسلمانان عالم کا اور دھنا بچھونا صرف دین اسلام ہے اور مختلف قوموں میں نسلی امتیاز کے ہوتے ان میں رابطہ صرف اسی دین کی وجہ سے قائم ہے۔ بلاشبہ انہوں نے مذہب کو سیاست کا غلام بنایا۔ لیکن جو کچھ مذہب نے پیش کیا اس میں کچھ نہ کچھ صحیح دین کی صداقت کی بھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ لہذا ہم نے ان اوراق میں اکثر فرقوں کا ذکر

کیا ہے ان میں سے بڑے فرقے شیعہ اور خوارج اور معتزلہ اور اہل سنت والجماعت ہیں اور یہی فرقہ در فرقہ تقسیم ہوتے چلے گئے۔ ان مذاہب پر قرآنی مثال شجرہ طییبہ اور شجرہ خبیثہ کی عاید ہوتی ہے۔ یہ مذاہب درخت کی شاخیں اور پتے ہیں جو اپنے وقت پر پھوٹی رہیں اور سر سبز رہیں اور پھولتی اور پھلتی رہیں آخر ٹوٹ گئیں اور پتے خشک ہو کر چھڑتے گئے۔ پھول کچھ مرجھا گئے اور پھل کچھ حواض سے خام ہی گزے اور جو پختہ ہوئے وہ زیادہ دیر نہ رہ سکے۔ لیکن اصل جوں کی توں ہے اور حیب تک زمین میں ثابت ہے اس کی فرع شاخیں وغیرہ اسی طرح آسمان کی طرف بلند ہوتی رہیں گی۔ یہ سب باتیں درخت کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ تقاضائے فطرت ہے۔ خواہ یہ اختلاف کی صورت میں ہو۔ ایک درخت کے دو پتوں میں اگرچہ مشابہت کامل ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ یکساں نہیں ہوتے۔ فطرت سخت اختلاف پسند واقع ہوتی ہے اور اختلاف اور کثرت لازم و ملزوم ہیں۔

اسے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن فطرت کے پیدا کردہ اختلاف میں شر نہیں، ارتقا ہے۔ اور ارتقا فطری ہے کہ "الدخرة خیرة والبقیة شجرة خبیثة کوزمین پر قرار نہیں رہتا۔ وہ جلد ہی فنا ہو جاتا ہے لیکن جس شے کو قرار ہو اس کو برقرار رکھنے والی ایک شے ایسی ہے جس کو صداقت کہتے ہیں اور لسان قرآن میں "حق سے موسوم ہے۔ اصل دین حق ہے۔ باقی سب فروع جو ہنگامی اور وقتی ہیں لیکن حق ان میں بھی رونما ہوتا ہے خواہ وقتی ہی ہو۔

ارشاد قرآن ہے کہ

"یضرب الله الحق والباطل، فاما الزید فید حب جفاماً واما ینفم الناس

فیملک فی الارض" (۱۳۱)

"اللہ حق و باطل کی مثال بیان فرماتا ہے تو جو جھاگ (پانی کے ریلے اور آگ میں سونے کے اوپر ظاہر ہوتی ہے)، وہ ناکارہ اور فنا ہو جاتی ہے۔ اور جو شے لوگوں کے نفع کی ہو۔ وہ باقی رہتی ہے۔

باطل کی تعریف قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ

”ما یبدی الباطل وما یعبد“ (۲۲)

باطل سے نہ کچھ پیدا ہوتا ہے اور نہ پیدا کس و ہرانا ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو حق و باطل میں تمیز بھی کر سکتے ہیں۔ فرقہ بندی اور تفرقہ کی تاریخ سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اصل دین سے واقف ہوں اور یہ قرآن عظیم میں مفصل مذکور ہے اور اسی پر ہر ایک مذہب کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے کسی نے دریافت کیا کہ احادیث اکثر بیشتر شائع ہو رہی ہیں ان کی صداقت پر کھنے کا معیار کیا ہے۔ فرمایا کہ قرآن پر پیش کرو اگر قرآن اسے قبول کرتا ہے تو قبول کرو اور اگر رد کرتا ہے تو مردود قرار دو۔ حدیث یا ہر ایک حادثہ شے وہی قابل قبول ہے جو اصل قرآن سے لگا لگاتی ہو۔ شیعہ فرقوں میں امام کو جو درجہ الوہیت دیا گیا۔ وہ آخر باب ہمارا اللہ پر ختم ہوا۔ اگر یہ اصل شے ہوتی تو اصل سے جدا نہ ہوتی۔ اس کو یونہی کیا گیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اصل نے اس کو رد کر دیا۔ ہم خلافت راشدہ کے بعد ہر ایک دور میں ہمارے زمانہ تک جو کچھ فرقہ اور تفرقہ کی صورت رہی ان اوراق میں بیان کریں گے۔ یہ حالات ان مورخین نے بیان کئے ہیں جو ان ایام میں موجود تھے۔ بیان کے زمانہ میں یہ فرقے موجود تھے اور وہ ان کے حالات سے واقف تھے۔ اکثر مورخین تاریخ عمومی میں ان فرقوں کا ہٹنا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی بہ تعلق سیاسیات، فرقوں کی تاریخ خصوصاً بہت عرصہ بعد لکھی گئی۔ بہر حال یہی مواد ہے جو مورخین نے جمع کیا۔ اور اسی سے ہم کچھ باتوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (متوفی ۲۲۰ھ) نے اپنی تاریخ عمومی میں باطنی فرقہ کے حالات لکھے ہیں۔ ان کے عقائد صیغہ رازی میں تھے۔ اس لئے اس معلوم نہ ہو سکے وہ یہ کہتا ہے کہ قرامطہ اپنے آپ کو محمد بن اسمعیل بن امام جعفر صادق کی اولاد کہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہم نے ان اوراق میں مناسب مقام پر بحث کی ہے طبری کی تاریخ ۲۹۲ھ سے ۲۹۶ھ پر جہاں تک ان شیعہ فرقوں کا تعلق ہے ختم ہو جاتی ہے۔

عرب ابن سعد (متوفی ۲۰۹ھ) نے اپنے زمانہ کے حالات طبری کے بیان کردہ واقعات کے سلسلے میں بیان کیے ہیں۔ قرامطہ نے بحرین میں جس سرگرمی کا مظاہرہ ابو سعید اور ابو طاہر کے تحت کیا عرب اسے مفصل بیان کرتا ہے۔ نیز فاطمی داعیوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو شمالی افریقہ میں بنو فاطمہ کے نام پر تبلیغ میں مصروف تھے۔ علیہ اللہ الامدی کی کامیابی ختم ہوئی۔

مسعودی (متوفی ۳۴۲ھ/۹۵۶ء) اپنی کتاب "تنبیہ" اور "مروج الذهب" میں شیعہ فرقوں بالخصوص قرمطیوں کے حالات ابو طاہر قرمطی کی موت تک لکھتا ہے۔ جو ۳۳۲ھ/۹۴۴ء میں واقع ہوئی۔ مسعودی کچھ باطنی فرقہ کے عقائد سے بھی واقف معلوم ہوتا ہے اور انہوں نے جو درجات تعلیم و تعلم کے مقرر کر رکھے تھے جو قرنی مسین کے مشابہہ ہے، بیان کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی قرامطہ سے ملتا رہا اور جو کچھ انہوں نے اپنی نسبت کہا قلم بند کر دیا۔

حمزہ اصفہانی جو تھنی صدی ہجری میں گذرا ہے۔ اس کی تاریخ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں دنیا اسلام اور بالخصوص عراق اور بغداد میں کیسا طوفان بدتمیزی برپا تھا اور ایسا زمانہ عموماً ہر ایک ابن الوقت کے لئے سازگار ہوتا ہے۔

ثابت بن سنان (متوفی ۳۶۵ھ/۹۷۱ء) صابی تھا۔ اس کا اور اس کے والد حکیم ثابت بن قرہ کا ذکر ابن خلکان نے میں بھی کیا ہے۔ اس نے تاریخ القرامطہ لکھی ہے یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ برنارڈ لوئیس (BERNARD LEWIS) کو مصر میں اس کا ایک نسخہ ہاتھ لگا۔ اس کا ذکر اس نے فرقہ اسمعیلیہ کے ضمن میں کیا ہے۔ ثابت قرامطہ کے حالات بہ تعلق بحرین اور شام اور عراق اپنی وفات تک بیان کرتا ہے۔ وہ فاطمی خلیفہ المعز اور قرامطہ کی باہمی لڑائیوں کے حالات چشم دید لکھتا ہے۔ ثابت صابی ہے اس لئے اس کی تاریخ اس لئے زیادہ معتبر ہے کہ اس کا کسی فرقہ سے تعلق نہ تھا۔

ابو عبد اللہ بن رزام بھی جو تھنی صدی ہجری میں گذرا ہے۔ اس کا حوالہ نظام الملک وزیر سلجوق سلطان ملک شاہ نے "سیاست نامہ" میں ابن شداد اور ابوالفدا اور

رشید الدین نے جامع التواریخ میں دیا ہے۔ ابن رزم کی تاریخ اب ناپید ہے لیکن ابو
 محسن علوی اس کا حوالہ کرتا ہے۔ ابو محسن فاطمی خلیفہ المعز کا ہم عصر تھا۔ مقرر نے خطا
 اور "مقتی" میں ابن رزم اور ابو محسن ہی کا حوالہ دیتا ہے مگر جو کچھ فاطمی خلفاء کے حسب
 کے متعلق انہوں نے لکھا ہے اسے غیر معتبر قرار دیتا ہے۔ "نویسی" (متوفی ۳۳۲ھ) نے
 نہایت الحزب میں ابن رزم کا اقتباس کرتا ہے۔ ابن ندیم نے "فہرست" میں
 ابن رزم کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ ابن رزم فرقہ اسمعیلیہ یا باطنیہ اور قرامطہ کے حالات
 سے واقف تھا جو کچھ اس نے لکھا ہے خود اسمعیلی کتب سے اس کی تائید اور تصدیق
 ہوتی ہے۔ ۳۰۶ھ میں ایک مشہور بغدادی میں خلفاء فاطمیہ کے حسب و نسب پر شائع
 ہوا۔ اس میں ابن رزم ہی کا حوالہ دیا گیا تھا کہ عبید اللہ المہدی اول فاطمی خلیفہ دراصل
 "ویسان" (سیمون القلاح) کی نسل سے تھا اور اس کا اصل نام "سعید" تھا۔
 بہار الدین الجندی (متوفی ۳۳۲ھ) نے کتاب السلوک لکھی۔ وہ ابو عبد اللہ
 محمد بن مالک بن ابی القباہل کا حوالہ دیتا ہے جو یمن میں ایک مشہور فقیہ سنی تھا۔
 ابو عبد اللہ ابتدا میں فرقہ قرامطہ میں شامل ہو گیا۔ لیکن عالم اور فقیہ تھا جب اس
 فرقہ کے اصلی حالات سے واقف ہوا تو کنارہ کیا اور ان کے رازوں پر پردہ کو فاش کیا
 غرض یہ تھی ان لوگوں کی چکنی چٹری باتوں میں آکر لوگ گمراہ نہ ہوں۔ "برنارڈ لوئیس"
 لکھتا ہے کہ ۹۳۹ء میں قاہرہ میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام "اسرار الباطنیہ
 والاشیاء القرامطہ" ہے مصنف کا نام محمد بن مالک بن ابی القباہل الہمدانی الیمینی لکھا
 ہے۔ اس کتاب کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف فاطمی خلیفہ مستنصر (متوفی ۳۴۰ھ)
 مطابق ۹۲۵-۳۵ھ کا ہم عصر تھا۔ بطور ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس کا حوالہ الجندی دیتا ہے وہ
 یہی کتاب ہے۔

ابو محسن الاشعری (متوفی ۳۳۲ھ) نے مقالات الاسدیین میں اپنے زمانہ
 تک اسلامی فرقوں کے عقائد لکھے ہیں عموماً مورخین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔
 ابو منصور بغدادی (متوفی ۳۲۹ھ) اور عبد الکریم شہرستانی (متوفی ۵۲۰ھ) کے حالات

ہم لکھ چکے ہیں۔ ہم نے ان اوراق میں اکثر و بیشتر انہی کا حوالہ دیا ہے۔ یہ یاد رہے کہ شہرستانی
پر بھی شبہ تھا کہ وہ اگر اسماعیلی نہیں تو ان کا خیر خواہ ہے۔

”برنارڈ لوٹیس کی کتاب ”دی اوریجن آف اسماعیلیزم“ سے بھی ہم نے استفادہ
کیا ہے۔ قاضی القضاات عبد الجبار بن محمد بن عبد الجبار معتزلی (متوفی ۴۱۶ھ) کی کتاب
”ثبوت دلائل النبوت سیدنا محمدؐ“ کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ یہ مسودہ استنبول کی لائبریری میں
موجود ہے۔ اس حد تک تو ہم نے ان مورخین کا ذکر کیا جو بلحاظ عقائد سنی ہیں۔ لیکن شیعہ

امامیہ اگرچہ اسماعیلہ کے مخالف ہیں مگر ان کے حالات سے بہتر واقف ہیں اور شیعہ
ابوالخطاب اور میمون القدرح کا احترام کرتے ہیں چونکہ دونوں امام جعفر صادق سے ملنے
والے تھے اس لئے ان سے جو احادیث مروی ہیں تسلیم کرتے ہیں حالانکہ دونوں فرقہ
باطنیہ کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اور اول خلیفہ فاطمی عبید اللہ المہدی تو محمد بن میمون القدرح

کا بیٹا سمجھا جاتا ہے۔ شیعہ امامیہ میں ابو عمر و محمد بن عمر بن عبد العزیز الکشی جو تہمی صدی ہجری
میں گذرا ہے۔ اس نے ”معارف اخبار الرجال“ لکھی۔ کشی نے مشاہیر کے اقوال جمع کئے

اور ان روایات کو بھی قلم بند کیا جو ان مشاہیر کے حالات میں لکھی گئیں یا زبان زد تھیں۔
کشی شیعہ عالم ابوالقاسم نصر بن صباح البلیخی اور ابوالنصر محمد بن مسعود الحیاشی السمرقندی

کا شاگرد تھا۔ طوسی نے ان کتب کی فہرست دی ہے جو شیعوں نے لکھیں اور کشی کی کتاب
کا خلاصہ بھی دیگر کتب کے ساتھ دیا ہے۔ شیعہ علماء میں طوسی (متوفی ۴۶۰ھ) نجاشی

(متوفی ۴۵۰ھ) ابن شہر آشوب (متوفی ۵۸۵ھ) اور استرآبادی (متوفی ۱۰۲۸ھ) نے
سوانح حیات بانیان فرقہ شیعہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ عموماً جس مورخ کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ

ابو محمد الحسن بن موسیٰ النوبختی (متوفی ۳۰۹ھ) اور اس کی کتاب ”فرق الشیعہ“ کا حوالہ
دیا جاتا ہے۔ اس میں نوبختی نے حضرت علیؑ سے لے کر تمام اماموں کے حالات لکھے

ہیں جو محمد المہدی امام قائم منتظر تک ہے۔ آخر الذکر امام عسکری گیارھویں امام کا بیٹا
ہے اور سامرہ میں روپوش ہو گیا۔ شیعہ عقائد کے مطابق یہ زندہ ہے اور کسی وقت اس کا

ظہور ہوگا۔ اگرچہ بخاری میں ہمدی کے بارہ میں کوئی حدیث نہیں مگر اہل سنت والجماعت

بھی مہدی کے منتظر ہیں۔ ایک اور کتاب "تبصرة العوام" سید مرتضیٰ بن داعی حسنی رازی سے منسوب ہے جو ساتویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے۔

اسماعیلی علماء کی کوئی کتاب معتبر ابتدائی صدیوں میں لکھی ہوئی نہیں ملتی،

"عیون الاخبار" سات مجلدات میں داعی اور یسعی نے حضرت علیؑ سے لے کر اپنے

زمانہ (ناویں صدی ہجری) تک لکھی فاطمی خلیفہ المعز کے قاضی القضاة ابو حنیفہ نعمان

نے "افتتاح الدعوه والابتداء للدولہ" لکھی اس میں فاطمی دعوت جو بین اور شمالی فرقہ

میں شائع ہو رہی تھی اس وقت تک سے فاطمی خلافت کے استقلال تک بیان

کی گئی ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ "برنارڈ ٹوٹین" کو ملا۔ اس نے اس کا حوالہ دیا

ہے اور ہم نے اسی کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ اسماعیلی کتابیں اور بھی ہیں ان میں سے

شرف علی کی کتاب "ریاض الجنۃ" بمبئی میں ۱۸۶۰ء میں شائع ہوئی۔ شیخ عبداللہ

بن مرتضیٰ اسماعیلی کی کتاب "الفیصل الدوار فی سمار الائمہ الاثار" حلب میں ۱۹۳۳ء

ہمارے زمانہ میں شائع ہوئی ہے۔ یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ اسماعیلی کتب

میں سے کتب تواریخ تو موجود ہیں مگر ان میں اسماعیلی عقائد کا ذکر نہیں یہ صحیحہ راز میں

میں ہیں لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ عقائد پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان کو عوام کی

واقفیت کے لئے شائع نہیں کیا جاتا۔ وہ صرف خاص خاص اشخاص کے فائدہ کے

لئے ہیں۔ "عمایت الموالید الخطاب" سے منسوب ہے اس میں علید اللہ المہدی کی

نسبت تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ فاطمی نہ تھا۔ اس موضوع پر ہم نے ان اوراق میں بحث

کی ہے۔

انگریزی میں متشرقین نے اسلامی فرقوں اور ان کے عقائد کے بارہ میں جو لکھا

ہے وہ انہی کتابوں سے اخذ کیا ہے۔ ہم نے ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ "کدوہ ازین

مجدد الف تانی" شیخ احمد سرہندی کے مقالات اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتاب

"تحفة اثنا عشریہ" اور اس کا رد اور دو کا جواب آیات بیانات "از نواب مہدی علی

محسن الملک بھی ہمارے مطالعہ میں رہا ہے۔ لیکن یہ کتب مناظرہ و مباحثہ پر مشتمل ہیں

اہل سنت والجماعت کے عقائد پر نجم الدین النسفی (متوفی ۵۳۷ھ) نے ایک کتاب لکھی۔ اس کی شرح علاء الدین التفتازانی (متوفی ۷۹۱ھ) نے لکھی جو آج بھی مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس پر حاشیہ آرائی عرب شاہ اسفہر تین اسلام الدین اور احمد بن موسیٰ النجیالی وغیرہ نے کی۔ تفتازانی کے متعلق اس کاہم عصر ابن خلدون لکھتا ہے کہ "میرے زمانہ میں علوم عقلیہ پر مشہور و معروف شخصیت سعد الدین تفتازانی نے بہت کتابیں لکھیں جو مصر میں بھی پڑھی جاتی ہیں۔ تفتازانی ہرات واقع خراسان کا رہنے والا ہے۔ ان میں سے بعض علم کلام پر ہیں جو اصول فقہ کی تشریح پر مبنی ہے۔ ان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شخص علوم فلسفہ سے خوب واقف ہے اور اپنے زمانہ کے علمائے جہاں تک عقلیات کا تعلق ہے اس کا پایہ بلند تر ہے۔"

تفتازانی ماہ صفر ۷۲۲ھ میں تفتازان میں پیدا ہوا جو خراسان میں واقع ہے۔ علاء الدین اعجمی اور قطب الدین کے حلقہ درس میں شامل رہا۔ اس کی تصانیف میں "مطول" اس نے ۷۴۸ھ اور "مختصر المعانی" ۷۵۶ھ اور "تلویح" ۷۵۸ھ میں لکھی "شرح العقائد النسفیہ" ۷۶۸ھ میں خوارزم (خیوا) میں مکمل کی جب تیمور نے خوارزم پر حملہ کیا۔ پیر محمد بن غیاث الدین پیر علی تیمور کی ملازمت میں تھا۔ تیمور کا دستور تھا کہ جہاں بھی فتوحات کے سلسلہ میں جانا وہاں کے اہل علم و حکمت کو اپنی ملازمت میں لے لیتا۔ اس کا سیاسی فائدہ اسے بہت ہوا۔ پیر محمد کا چچا ملک محمد سرخی بن ملک معز الدین حسین گرت خود بہت بڑا عالم تھا۔ بھتیجے کے ذریعے تیمور کو تفتازانی کی طلبی کے لئے کہا۔ چچا تو یہ چاہتا تھا کہ تفتازانی سرخس میں آکر اس کے پاس قیام کرے لیکن جب تیمور کو تفتازانی کے علم و فضل کا حال غائبانہ معلوم ہوا تو سمرقند میں طلب کیا۔ تفتازانی نے عذر کیا کہ میرا راہ حجاز جانے کا ہے۔ یہ عذر مسموع نہ ہوا تو ناچار آنا ہی پڑا۔ تیمور نے شیراز ۷۸۹ھ میں فتح کیا تو تفتازانی کا پیرانا دوست السید الشریف البحر جانی بھی سمرقند میں اس سے آملار عقاید پر دونوں کا اتفاق ہے جیسا کہ بحر جانی کی کتاب "التعریفات" سے

واضح ہوتا ہے۔ لیکن بعض باتوں میں اختلاف بھی ہے۔ ان میں مناظرہ بھی اکثر ہوتا۔
اور اختلاف رائے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بیگانہ بھی ہوتا گیا۔

ہم نے اس کتاب میں ان مورخین بالخصوص تقی زانی کا اکثر حوالہ دیا ہے۔
خواجہ نصیر الدین محمد بن حسن طوسی دو واسطہ سے شیخ بوعلی سینا کے شاگرد تھے
محقق طوسی کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کی تصانیف میں سے علم عقاید و کلام
میں متن تجرید ہے۔ اس کی زندگی پر آشوب زمانہ میں گزری۔ حسن بن صباح کے فدائیوں
ملاحظہ اسماعیلیہ کی قید میں بھی کچھ عرصہ رہا۔ جب اہل خانہ نے ان پر قابو پایا تو
خواجہ بھی رہا ہوا۔ اور اسی کے ہمراہ رہا۔ وہ بھی نوازشات شاہانہ کرتا رہا۔ بہتر سال
سال کی عمر میں ۶۶۲ھ میں فوت ہوا اور حسب وصیت کاظمین میں مدفون ہوا۔
خواجہ فکر شعر بھی کرتا۔ آزادی فکر عقاید کی زنجیریں توڑنا چاہتی تھی، کفر سے متہم ہوا

نظام بے نظام اور کافر خواندہ چراغ کذب را بنود فروغ

مسلمان خوانمش زیر اکہ نبود سزاوار دروغ جرموروغ

ایک رباعی بابا افضل کاشانی کی خدمت میں لکھ کر بھیجی

اجزائے پیالہ کہ در ہم پیوست بشکستن اکن روانمیدار دوست

چندین سرو پائے نازنین و سر دوست از ہر چہ ساخت وزیرانی چہ شکست

عارف کاشانی نے جواب دیا

تا گو ہر جاں در صدق تن پیوست از آب حیات صورت آدم بست

گو ہر چہ تمام شد صدق تا شکست بر طرف کلہ گوشہ سلطان نہ نشست

عادی پوسٹ بکس ۲۷ لاہور

تشریح و تفسیر

مذہبِ اسلامیہ

Harmanad

25.3.75

مسلمانوں میں فرقہ بندی نے جو تفریق ۳۵ھ سے آج تک پیدا کر رکھی ہے اس کا مفصل تذکرہ ان اوراق کا موضوع نہیں اور نہ ہر ایک فرقہ کے حالات نام بنام قلمبند کرنا مقصود ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ بڑے بڑے مذہب، معتزلہ اور شیعہ اور خوارج اور اہل سنت والجماعت کے تحت جو فرقے بنے اور بگڑے عام واقفیت کے لئے ذیل میں ان کے نام اور ماہِ الاقتیاز عقیدہ کا ذکر کیا جائے۔

شیعہ

۱۔ "سبائیہ" یا "سبئیہ" — یہ فرقہ عبد اللہ بن سبا سے منسوب ہے حضرت علیؑ کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ اُس حضرت کی وفات کے بعد امام برحق ہیں اور فوت نہیں ہوئے، دوبارہ تشریف لائیں گے اور یہ کہ علیؑ اللہ ہے۔ (مغوذ باللہ)

۲۔ "کیسانیہ" یا "مختاریہ" — یہ فرقہ مختار ثقفی سے منسوب ہے کیسان مختار کا لقب ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے بعد آپ کا بیٹا محمد، جو قبیلہ حنفی کی ایک عورت کے بطن سے ہے اور حنجر بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہے، امام رہے اور ابھی تک زندہ ہے۔ (۱) حضرت علیؑ کے بعد حضرت حسنؑ اور آپ کے بعد

حضرت حسینؑ میں امام ہیں حضرت حسینؑ کے بعد امام محمد بن
حنفیہ ہے۔ اول الذکر دو حضرت حسن اور حسین دراصل بن
حنفیہ کے تحت فرمان تھے۔ ان ایام میں وہ امام غائب تھا
(۲) کربلا۔ محمد بن حنفیہ ابھی تک زندہ ہے اور جبل رضوی
میں روپوش ہے، دوبارہ آئے گا۔

(۳) ہاشمیہ۔ محمد بن حنفیہ فوت ہو چکا ہے۔ اس کا بیٹا
ابن ہاشم امام ہے۔ ابن ہاشم فوت نہیں ہوا۔ دوبارہ آئے گا۔
(۴) علویہ۔ ابن ہاشم فوت ہو چکا ہے۔ اس کا بیٹا علی
امام ہے اور اس کے بعد اس کی اولاد میں سے حسن اور علی اور
سن امام ہیں۔

۳۔ حاشیہ۔ ابن ہاشم نے اپنا جانشین بذریعہ وصیت معاویہ بن عبد
نامزد کیا اور وہی امام ہے اور جبل صفہان میں زندہ روپوش ہے
اور یہی مہدی ہے۔

۴۔ ابن ہاشم نے اپنا جانشین بذریعہ وصیت حضرت عباسؑ
عم آرزو کرتے کی اولاد میں عبد اللہ السفار کو نامزد کیا۔
اس نے امامت بنو عباس میں منتقل ہو گئی۔

۵۔ ہاشمیہ یا بنانیہ۔ ابن ہاشم بن محمد بن حنفیہ مہدی ہے۔

۶۔ ابن ہاشم نے بذریعہ وصیت حضرت علیؑ المعروف
زین العابدین کے بیٹے محمد باقر کو اپنا جانشین نامزد کیا۔

۷۔ امام محمد باقر نے ابو منصور کو اپنے بعد امام نامزد کیا۔

۸۔ امام جعفر صادقؑ آتدے اور اس کا رسول ابوالخیرؑ

بذریعہ۔ امام جعفر صادقؑ آتدے اور رسول مبعوث فرمائے

"بدیع" رسول ہے۔

"بلیہ" — (۳) ابی الخطاب کے بعد امام مفضل صیرفی ہے۔ اور رسول ہے۔

"معمریہ" — (۴) امام جعفر صادق اللہ فی السماء ہے۔ اور معمر اللہ فی الارض ہے۔

۹۔ "راوندیہ" — (۱) خرمیہ } یہ تین فرقے راوندیہ کی شاخیں ہیں۔ ابو مسلم خراسانی
(۲) رزامیہ } کو مظہر لوہیت اور حکیم مقنع وغیرہ جو بعد میں ہوئے
(۳) ہریریہ } انہی مذاہب کے بانی ہیں۔

"عیسویہ" — عیسیٰ ابن موسیٰ عباسی خلیفہ منصور کا برابر زادہ تھا۔ اور

افواج عباسیہ کا سپہ سالار تھا۔ منصور کا بیٹا محمد المہدی امام اور عیسیٰ کا بیٹے قتل ظہور احادیث میں مذکور ہے۔ عیسوی فرقہ عیسیٰ کو امام تسلیم کرتا ہے۔

"مغیریہ" — محمد نفس زکیہ امام ہے۔ عیسیٰ بن موسیٰ عباسی سپہ سالار کے مقابلہ میں مارا گیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ وہ مہدی ہے اور زندہ ہے۔ اور دوبارہ آئے گا۔

۱۰۔ "باقریہ" — محمد باقر امام ہے۔

۱۱۔ "جعفریہ" — جعفر صادق امام ہے۔

(۱) نویسیہ۔ امام جعفر صادق زندہ ہے اور امام غائب ہے۔

(۲) "اسماعیلیہ" — امام جعفر صادق کا بڑا بیٹا اسماعیل امام ہے۔

۱۲۔ "امامیہ اثنا عشریہ" — اسمعیل امام جعفر صادق کی زندگی میں فوت ہو گیا۔

امام برحق موسیٰ الکاظم ہے اور آپ کے بعد آپ کی اولاد

تا امام مہدی، جو روپوش ہے اور کسی وقت ظاہر ہوگا۔

مورخین اسلام بغدادی اور شہرستانی اور زونختی وغیرہ نے ساٹھ سے زیادہ فرقوں

۱۲

کے حالات لکھے ہیں جو شیعہ ہیں۔ ہم نے اختصار سے کام لیا ہے۔ آگے چل کر بعض فرقوں کے حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کئے جائیں گے۔

خوارج

خوارج کے حالات ہم نے اپنی کتاب "دمشق" اور خلافت اسلامیہ میں لکھے ہیں۔ اس لئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ خوارج ان کو ان کے مخالف کہتے تھے یہ اپنے آپ کو "اصحاب شری" سے موسوم کرتے اور یہ لقب قرآن کی آیات سے اخذ کیا سنا ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واهوالهم بان لهم الجحيم ط يقاتلون في سبيل الله فيقتلون ويقتلون وعدا عليه حقا في التوراة والانجيل والقرآن ط ومن ادنى بعدة من الله فاستبشروا ببيعكم الذي بايعتم به ط وذلك هو الفوز العظيم ط اتقوا بنون العباد والمجاهدون الساعون السراخون الساجدون كالمرون بالمعروف والناهون عن المنكر والحافظون لحدود الله ويطروا المؤمنين وما كان للنبي والذين آمنوا ان يستغفروا للمشركين ولو كانوا اولى قربى من بعد ما تبين لهم انهم اصحاب الجحيم ط (۱۱)

ان آیات میں خوارج کے تمام فرقوں کے عقاید آجاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم فی سبیل اللہ جہاد کرتے ہیں۔ دوسرے ہمارے جان و مال اللہ کی راہ میں وقف ہیں۔ ان میں سے اکثر حافظ قرآن تھے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سختی سے کرتے۔ مشرکین ان کے نزدیک سب تھے جو ان کے عقائد سے لگانہ کھاتے۔ اس لئے بعض فرقوں میں نابالغ لڑکوں کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ چونکہ احکام قرآن سے واقف نہیں اس لئے وہ بھی مشرک ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف تھا کہ وہ جہنم کے لائق ہیں یا نہیں۔ اس پر اتفاق تھا کہ جنت میں نہیں جائیں گے۔ ان کے عقیدہ میں یہ نمایاں ہے کہ زنا اور سرورہ ایسے گناہ ہیں کہ اہل انبیا بالشدکے مخالف ہیں اس لئے زانی اور زانیہ اور سارق اور سارقہ لے ایمان میں۔ اس لئے حسب ارشاد قرآن زانی اور زانیہ سے مومنہ عورت اور مومن مرد کا نکاح حرام ہے۔ اس سلسلہ میں وہ "غلو" کرتے۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اگر کوئی گنہگار توبہ کے بعد اپنی اصلاح کر لے تو اللہ غفور الرحیم ہے۔ انسان ضعیف مخلوق ہے حرمت نکاح

نفس قرآنی سے ثابت شدہ حقیقت ہے اور ناقابل انکار ہے۔ مگر اس میں حکمت یہ ہے کہ زانی اور زانیہ سے ہی نکاح کرے۔ یہ علاج بالمشکل ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب "اصول فقہ اسلامی" میں بحث کی ہے [اس میں کچھ شک نہیں کہ خوارج کا تقویٰ حد اعتدال سے اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کو اسلام سے خارج ہی سمجھتے تھے، ان کے عقاید کی جھلک موجودہ زمانہ کے فرقہ "ولہابیہ" میں پائی جاتی ہے۔ فرقہ شیعہ تو مسئلہ امامت میں لہجے رہے اور اماموں کو خدائی درجہ دیا۔ لیکن خوارج کسی

فرو بشر کو فوق البشر یقین نہیں کرتے۔ شیعہ شخصی حکومت اور خوارج جمہوریت پسند ہیں شیعہ اماموں کو معصوم عن الخطایقین کرتے ہیں اور خوارج عصمت کے قائل نہیں یہی عقیدہ تھا کہ وہ حضرت علیؑ سے علیحدہ ہو گئے۔ چونکہ خلافت راشدہ کے بعد ولوکیت دنیا را اسلام چھا گئی۔ اس لئے بنو ہاشم اور بنو امیہ ان کو دبا تے رہے اور ان کو چین سے نہ بیٹھے دیا اور وہ خود بھی چین سے بیٹھنے والے نہ تھے۔ صدیوں تک اموی اور عباسی حکومت ان کی سرکوبی کرتی رہی اس لئے وہ ابھرنہ سکے اور عرب کے جنوب کی طرف دھکیلے گئے۔ مسقط اور زنجبار میں ان کی آج بھی حکومت ہے۔ ایسے ہی سخت جان تھے کہ آج تک زندہ ہیں۔ خوارج کے مشہور فرقے حسب ذیل ہیں۔

انہی راشد نافع بن اذرق سے منسوب ہے۔ ابن اذرق نے بصرہ سے خروج کیا اور اہواز، کرمان اور فارس پر چھا گیا۔ تقیہ گرفتار و کردار میں ناجائز ہے۔ زانی کی سزا رجم نہیں کیونکہ اس کی سند قرآن میں نہیں۔

نجدۃ عافریہ" متبعین اس کو امیر المؤمنین کہتے۔ اس فرقہ کو "عطویہ" بھی کہتے ہیں۔ اس کا مذہب مرو اور سجستان میں شائع ہوا۔

"بہس بن جابر سے منسوب ہے۔ حجاج بن یوسف ثقفی اس وقت مرو اور سجستان میں تھا۔ اس کو گرفتار کرنا چاہا۔ بھاگ کر مدینہ پہلا گیا۔ آخر گرفتار ہو کر مقتول و مصلوب ہوا۔ اس مذہب میں یہ عقیدہ نمایاں ہے کہ ایک مسلمان کا

ایمان باللہ اور رسل پر ہونا کافی ہے اور جو کچھ اللہ نے وحی کیا اور یہ کہ اللہ کے پرستاروں سے محبت اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی واجب ہے۔ "الحب لله والبغض لله" اور یہ کہ احکام شریعت کا علم ضروری ہے، جس امر کا علم نہیں اور جس کا جاننا واجبات سے نہیں اس کے لئے انسان مکلف نہیں۔ جب تک کہ اس کی ضرورت اس پر واضح نہ ہو۔ ایمان حق و باطل میں امتیاز کا شعور ہے۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے۔ نہ باطنی اقرار و اعمال سے علیحدہ ہے۔ اس فرقہ کی بعض شاخوں کے نزدیک ایمان اور اقرار باللسان اور اعمال ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ اس حد تک تو عقائد ہیں۔ ان کو عملاً اس طرح واضح کیا کہ جو بھی اس مذہب کا مخالف ہے واجب القتل ہے اور اس کا مال، مال غنیمت ہے۔ اگر کسی غیر مسلم کی حکومت ہو تو نماز قضا کرنی چاہیے جب تک کہ مسلمان امام نہ ہو یہ عقیدہ شیعہ فرقہ سے ملتا جلتا ہے۔ جو نماز مجتہد کے بغیر باجماعت نہیں پڑھتے۔

"عجاروہ" عبد الکریم بن عجدج سے منسوب ہے۔ اصل میں یہ یہسیہ کی ایک شاخ ہے۔ اس کا ظہور خلافت اموی کے آخر و دور میں ہوا۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ جو بھی ملوکیت کے خلاف عملاً جہاد نہیں کرتا وہ خارج از ایمان ہے۔ کفار کے جان اور مال سے تعرض غیر اسلامی ہے۔ کفار کی اولاد کافر ہی ہے اور مسلمان کی اولاد جب تک عاقل اور بالغ ہو کر اسلام سے شناسا نہ ہوں مسلمان نہیں مگر کافر بھی نہیں۔ مطلق کفار کی اولاد جہنم میں جائے گی۔

"صلیہ" عثمان بن ابی صلت اور صلت بن ابی صلت سے موسوم ہے۔ یہ عجاروہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نابالغ لڑکے نہ تو کافر ہیں نہ مسلم انہیں غیر جانبدار کہنا چاہیے۔

"قیمونہ" قیوم بن عمران سے منسوب ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کفار ہوں یا مسلم ان کے معصوم بچے بہشت میں داخل ہوں گے۔ ہر ایک مسلم کا فرض ہے کہ استبداد کی حکومت اور اس کے حامیوں کے خلاف جنگ کرے۔ اور ان کے خلاف بھی جو خوارج کے دشمن ہیں۔ ان کے علاوہ کسی سے لڑائی مول لینا نہ چاہیے۔ انسان اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارادہ اپنے بندوں کے حق میں خیر کا ہے۔ اللہ کسی کی برائی نہیں چاہتا۔ اگر کوئی بد عمل کرتا ہے تو خود ذمہ دار ہے۔ اللہ پسند نہیں فرماتا۔

حمزہ | حمزہ بن ادرك سے منسوب ہے۔ ان کا عقیدہ "قدر دیگر عقاید میں مہمونیہ سے ملتا جلتا ہے۔ حمزہ کا خروج ۱۶۹ھ میں ہوا۔ مہمونیہ سے اختلاف اتنا ہے کہ ان کے نزدیک کفار کے بچے بھی بہنم میں جاتیں گے۔ کفار کو جنگ کے حالات میں ہی قتل کرنا جائز ہے۔ بیک وقت دو امام بھی ہو سکتے ہیں۔

اطرافیہ | ان کا عقیدہ ہے کہ کوئی حکم شریعت جس کی حکمت واضح نہ ہو عملاً فرض نہیں اور اگر ترک کیا جائے تو مضائقہ نہیں اور نہ قابل مواخذہ عقل و اعتدال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس لئے موجودگ دنیا اسلام کے "اطراف" پر آباد ہیں اور انہیں پیغام حق نہیں ملا، عقلیات کے ذریعہ گمراہی سے بچ سکتے ہیں۔

حلقیہ | خلف بن عمر سے منسوب ہے۔ یہ خوارج کرمان اور مکران سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے فعل کا مختار ہے۔ اگر امام موجود نہ ہو تو جہاد جائز نہیں۔

حازمیہ | حازم بن عاصم سے منسوب ہے۔ عموماً خوارج کا عقیدہ دربارہ حضرت علیؑ اور یہی ہے جو شیعہ کا دربارہ خلفائے ثلاثہ ہے۔ حازمیہ کا اختلاف اس عقیدہ میں اتنا ہے کہ وہ قطعی رائے یا فیصلہ حضرت علیؑ کی نسبت نہیں کرتے۔ اس فرقہ کو عجاوہ کی ہی ایک شاخ سمجھا گیا ہے۔

شعیبہ | شعیب بن محمد سے منسوب ہے۔ اس فرقہ کے عقائد مہمونیہ اور عجاوہ سے ملتے جلتے ہیں مگر مشدّد جبر و اختیار میں اہل سنت و الجماعت کے موافق ہیں۔

معلومیہ | یہ فرقہ حازمیہ کی ہی ایک شاخ ہے ان کا عقیدہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو بیچ اسرار و صفات کے ساتھ شناخت نہیں کرتا جاہل ہے۔ معتزلہ کی طرح یہ بھی انسان کو اپنے فعل کا مختار یقین کرتے ہیں لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اختیار بھی

مشیت الہی سے ہی ہے اور اسی کے تحت ہے ایک شاخ "مجبولیہ" ہے ضرور نہیں کہ اللہ کے تمام اسماء صفات کی معرفت ہو۔

ثالثہ ثعلبہ بن عامر سے منسوب ہے جو عبد الکریم بن عجر کے بالکل ہم عقیدہ تھا۔ مگر دونوں میں بچوں کی عمر کے بارے میں اختلاف واقع ہوا۔ اور دونوں میں ایسی بگڑی کہ پھر نہ بنی، ثعلبہ کی یہ رائے ہے کہ بچوں کے متعلق حکم وہی کچھ ہے جو ان کے والدین کی نسبت ہے اسی فرقہ کی ایک شاخ "انخسہ" ہے ان کی رائے یہ تھی کہ جس مسلمان کی نسبت معلوم ہو کہ صالح یا بد کا ہے اس کے متعلق کوئی قطعی حکم نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری شاخ "معبدیہ" ہے جو معبد بن عبد الرحمن سے موسوم ہے۔

تیسری شاخ "رشیدیہ" ہے۔ یہ رشید طوسی سے منسوب ہے۔ ان کو عشریہ بھی کہتے ہیں۔ یہ کہتے کہ ایسی زمین جو آپاشی سے بے نیاز ہو۔ اس کا مال یہ دسواں حصہ پیداوار ہونا چاہیے۔

شعبانہ شیبان بن سلمہ سے منسوب ہے۔ ابو مسلم خراسانی کے عہد میں خروج کیا۔ ابو مسلم اس کا حامی تھا۔

اباضیہ عبد اللہ بن اباض سے منسوب ہے۔ مروان اموی کی خلافت میں خروج کیا۔ اس فرقہ کی بھی کئی شاخیں ہیں۔

"حفصیہ" حفص بن مقدم سے منسوب ہے۔

"یزیدیہ" یزید بن انخسہ سے منسوب ہے۔ یہ اباضیہ اور ازادہ اور ان خوارج کے سوا جو ان کے پیشتر گذرے سب کو خارج از اسلام ہی سمجھتے۔ ذمیوں کی نسبت ان کی یہ رائے تھی کہ اللہ اور رسول کے ذمہ میں ہیں۔ خواہ یہ علانیہ یا رسماً مسلمان نہ ہوں۔ لیکن ان حضرت کی سرپرستی تسلیم کریں تو ان سے موالات جائز ہے۔ ہر ایک گناہ خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ، مطلق بے اپاہی کا نتیجہ ہے۔

"حارثیہ" حارث بن محمد سے منسوب ہے۔ مسئلہ قدر میں اباضیہ کے خلاف ہے

"صفیریہ زبیریہ" زیاد بن اصف سے موسوم ہے۔ تقیہ گفتار میں جائز مگر کفر میں

ناجائز ہے۔

”مرحبتیہ“ | مرحبتیہ کئی فرقوں کا نام ہے۔ ایک قدریہ، دوسرا جہریہ، تیسرا خالصہ، اور چوتھے مرحبتیہ خوارج ہے۔ چونکہ ان کے عقائد میں امر مشترک یہ ہے کہ امامت نص سے نہیں اختیار سے ہے۔ اس لئے ان کو مرحبتیہ کہتے ہیں۔

اس کی کئی شاخیں ہیں۔

”یونسیہ“۔ یونس بن عون الشمری سے وابستہ ہیں۔

”عبیدیہ“۔ عبدالمکتب سے منسوب ہیں

”غسانیہ“۔ غسان بن آثار کوفی سے منسوب ہیں۔

”مرحبتیہ“ مشتق ہے ”ارجائے جو تاخیر کے ہم معنی ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق

ایمان مقدم ہے اور عمل کی حیثیت ثانوی ہے۔ لیکن ایمان کا تعلق قلب سے ہے اگرچہ اعمال سے ایمان کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ایمان کے ہوتے بھی اندر بدکار ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کی بد اعمالی پر کفر کا فتویٰ جائز نہیں۔

یہ عقیدہ ابتدائی خوارج کے عقیدہ کے مخالف ہے جس طرح ایک کافر کی طاعت

نافع نہیں اسی طرح ایمان کے معصیت بھی مضر نہیں۔ ”غسانیہ“ کا عقیدہ ہے کہ ایمان زیادہ تو ہو سکتا ہے مگر کم نہیں ہوتا۔

بغدادی لکھتا ہے کہ

”غسان نے اپنی کتاب میں لکھا کہ اس کی رائے بوحنیفہ کے مطابق ہے جو کہتا ہے

کہ ایمان علم اور اقرار باللہ ورسلمہ وکتبہ ہے۔ مجملاً نہ کہ مفصلاً، یہ ضرور نہیں کہ ہم

ہر ایک اسماعیلی کتاب سے مفصل واقف ہوں۔ قرآن میں جہاں تک ان کا جمل

مذکور ہے۔ ہمارے ایمان کے لئے کافی ہے۔ ایمان کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں

جس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔“

غسان کہتا ہے کہ کمی نہیں ہوتی مگر بیشی ہوتی ہے۔ اس لئے بوحنیفہ کے قول کے

کیسے مطابق ہوا۔

اگر امام بوخنیفہ کا یہ قول کہ ایمان میں نہ بیشی ہوتی نہ کمی، تو صرف نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔ ارشاد قرآن ہے

”الذین اذا ذکر الله وجلت قلوبهم واذا تليت عليهم آياته زادتهم ایمانا وعلیٰ ہم یتوکلون“ (۹)

”وہ لوگ کہ جب ان کو اللہ کی یاد دلائی جائے۔ تو ان کے دل ڈرتے ہیں اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان زیادہ کرتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔“

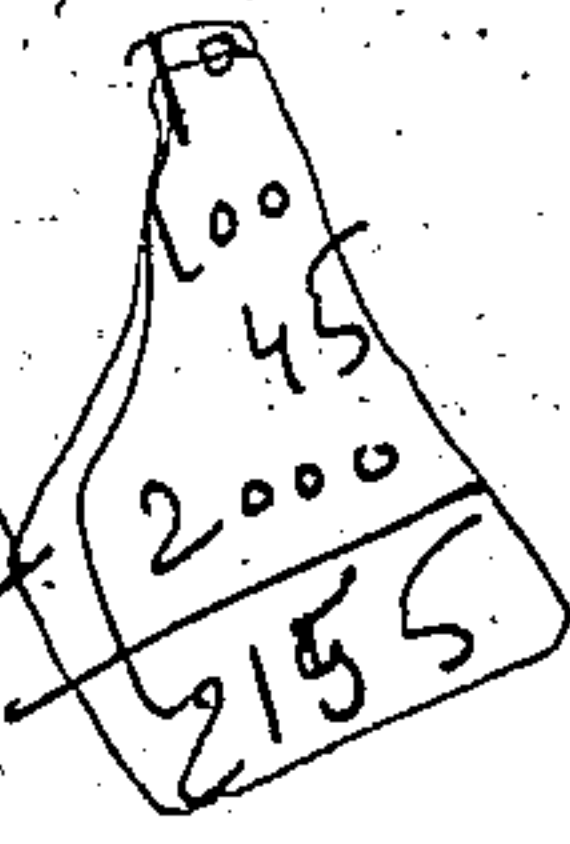
امام صاحب کے قول کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اور غسانیہ کا یہ عقیدہ کہ ایمان میں زیادتی ہو سکتی ہے کمی نہیں ہوتی، صحیح نہیں۔ جس شے میں زیادتی ہو سکتی ہے کمی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے بھی ہیں جو ہدایت کی جگہ گمراہی خرید کرتے ہیں ایسے بھی ہیں کہ ایمان کو کفر سے بدل لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایسی فضول بحثوں میں اس لئے الجھے کہ ان کا وقت زیادہ تریکاری میں گزرتا ہے۔ بیکار ہمیشہ دماغی تعیش یا لہو و لعب میں وقت کاٹتے ہیں۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے کہ کفار کے بچے اگر بچپن میں فوت ہو جائیں۔ تو ان کا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟ جہنم میں یا جنت میں۔ یہ مسئلہ اس لئے خود بخود ذہن میں پیدا ہوا کہ جہنم اور جنت تو اعمال کی سزا و جزا ہے۔ بچے معصوم نہ نیک عمل کئے اور نہ برے ان کو اس دار جزا سے کیا واسطہ۔ کسی نے یہ فتویٰ دیا کہ ان کے والدین جہنم میں ہوں گے تو وہ بھی وہیں ہونے چاہئیں۔ ان کے ذہن میں دار عقبیٰ صرف جہنم اور جنت ہی ہے۔ ایسی فضول بحثوں میں نہ صرف اپنا وقت عزیز ضائع کیا بلکہ ان میں اتنا غلبہ کیا کہ ہر ایک مخالف کے خلاف کفر و ارتداد کا فتویٰ بھی صادر کیا۔ اچھے بھلے مسلمان مومن کو محض ایک عقیدہ موضوعہ کی بنا پر کافر قرار دیا۔

خواجہ شیعہ کی طرح ابتدا میں ایک سیاسی عجمی تھی دونوں میں خلافت اور امامت ہی مسائل متنازعہ تھے۔ پھر میں خواجہ اپنے عقائد میں۔ سخت تھے۔ ان کا شعار ”لا حکم الا للہ“

تھا۔ ان کا ہمیشہ عام عقیدہ یہی رہا کہ حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ خالق کائنات کا ہے
اس لئے کسی امام اور حاکم کی ضرورت نہیں۔

ابتدائیں تو تمام مسلمانوں کو جو خوارج نہ ہوں کافر ہی کہتے تھے مگر رفتہ رفتہ نرم
پڑتے گئے جیسا کہ ان کے فرقوں کے حالات سے واضح ہوگا۔

Total	2710.00
Withdrawal	2155.00
Credit Balance	555.00
Total	655.00



A handwritten diagram of a bottle with numbers inside. The numbers are 100, 45, 2000, and 2155. The bottle is tilted and has a neck.

اسباب تفرقہ

جنگ ہفتاد و دو شب ہم را عذر بہتہ

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اس مورخین جب قوموں کے عروج و نزول کے واقعات بیان کرتے ہیں تو ان کے اسباب پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اختلاف اور فرقہ بندی اور تفرقہ کو تنزل کے اسباب میں داخل سمجھا گیا ہے۔ بوقت عروج ہر ایک قوم "امت واحدہ" ہوتی ہے۔ اس کے نصب العین میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اور یہ نصب العین ہر ایک فرد قوم کی توجہ کا واحد مرکز ہوتا ہے۔

جیسے اس قوم کا اعلیٰ مقصد حیات سمجھنا چاہیے۔ اس کی تکمیل کے لئے وہ اپنی جان و مال سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

قانون فطرت یہ ہے کہ اگر مطلوب یا مقصود غائب ہو تو طلب یا مقصد حاضر ہوتا ہے۔ اور اگر مطلوب یا مقصود حاضر ہو تو طلب یا مقصد مفقود ہوتا ہے۔ پیاپیا پانی تلاش کرتا ہے لیکن جب پانی ہاتھ لگے تو پیاس بجھ جاتی ہے اور ساتھ ہی طلب بھی نہیں رہتی اس لئے جب کوئی قوم اپنا مقصد حاصل کر لیتی ہے تو وہ جدوجہد جو مقصد کے حصول کے لئے کی جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔ اگر قوم کے سامنے کوئی اور نیا مقصد ہو تو اس کی زندگی بلا مقصد رہ جاتی ہے۔ اور اس کی قوت فکریہ اگر کچھ کام کرتی ہے تو مقصد اول کے قیام و استقلال پر صرف ہوتی ہے۔ آریہ استخلاف میں مسلمانوں سے وعدہ ہوا کہ تمہیں بھی ایسی ہی خلافت ملے گی جیسی پہلی قوموں کو دی گئی۔ مسلمانوں کو ایسی ہی خلافت ملی تو یہ سمجھ

لیا کہ جو کچھ ملنا تھا مل گیا۔ یہی مقصد تھا جو حاصل ہو گیا۔ اس لئے وہ "جہاد" زندگی جو اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ایک فرد قوم میں اپنی پوری شان کے ساتھ نمایاں تھا ختم ہو گیا۔ انہوں نے ان آیات قرآن کی طرف توجہ نہیں کی۔ جن میں بتایا گیا ہے کہ پہلی قوموں نے خلافت کی نعمت کیوں کھو دی۔ اور وہ کیا اسباب ہیں جن کے تحت وہ حاکم سے محکوم بن گئے۔ انہوں نے بھی "سنت الاولین" کا اتباع کیا اور تنزل میں اُسے بحالانکہ آیہ استخلاف سے ہی واضح ہوتا ہے کہ خلافت خود مقصد بالذات نہیں۔ ایک ذریعہ ایک اور مقصد اعلیٰ کے حصول کا ہے۔ اور یہ "تمکین دین" ہے۔ تمکنت دین کے استقلال کا ذریعہ خلافت ہے۔ جسے دنیوی حکومت کہنا چاہیے۔ اس کے ذریعے وہ تمام ذرائع زندگی جو تمکین دین کے لئے ضروری ہیں مسلمانوں کے ہاتھ میں آگئے۔ مناسب یہ تھا کہ دنیا کو دین پر صرف کرنے لگتے۔ لیکن دنیا طلبی کو اصل مقصد سمجھا گیا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک شخص جمع مال کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے اور مال کی اصل غرض نظر انداز کر دے۔

مطلوب یا مقصود دو قسم کا ہے ایک وہ جو نزدیک تر ہو اور جو اس کے سامنے ہو اس کو اصطلاح قرآن میں "حیوٰۃ الدنیا و دینتھا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ادنیٰ زندگی کا مفاد ہے۔ دنیا چونکہ نزدیک تر ہے اور اس کا مفاد محسوس اور مشخص اور معین ہے اس لئے نفس انسانی جو عجلت اور سہولت پسندی ہے اسی کو طلب کرتا ہے۔ یہ مفاد بہ نسبت اس کے جو دور اور دور تر ہے حقیر ہوتا ہے اس لئے اس کو "ادنیٰ" بمقابلہ "اعلیٰ" کہا جاتا ہے۔ جیسے دور ہو اس کے لئے جدوجہد بھی نسبتاً زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ اس کو اصطلاح قرآن میں حیات "آخرہ" سے موسوم کیا گیا ہے۔ ارشاد قرآن ہے

"بل تحبّون العاجلۃ وتذرون الآخرة" (۲۹)

"تم تو ایسی شے کے ولہادہ ہو جو جلدی ہاتھ آجائے اور آخرت کو نظر انداز کرتے ہو

بل تو تذرون الحیوٰۃ الدنیاہ ولاخرة خیر و ذالقی" (۳۳)

"تم تو ادنیٰ زندگی کے مفاد کے پیچھے لگے ہوئے ہو حالانکہ یہ مفاد قلیل اور فانی ہے

اور آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔"

ماہرہ الحیوۃ الدنیاء لہو ولعب فان الدار الاخرۃ لہی الخیوان لو کانوا
یعلمون: (۱۳)

یہ اپنی زندگی کیا ہے؟ یہی لہو و لعب اور تحقیق دار آخرت ہی اصل زندگی ہے
اگر تم سمجھو۔

”رتنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرۃ حسنة وقتنا عذاب النار اولئک لہم نصیب
مما کسبوا“ (۱۴)

”اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں بھی نیکی دے اور آگ کے
عذاب سے بچا، یہ وہ لوگ ہیں جو کھائی کی ان کا حصہ ہے۔“

”من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جبرم یصاہ
مذمومًا مذکورہ ومن اراد الاخرۃ وسعی لہا سعیا و هو موہوم“ فاولئک کان سعیرم
مشکورًا (۱۵)

جو کوئی جلدی سے حاصل ہونے والے مفاد کا ارادہ کرتا ہے ہم بھی اس کو وہ کچھ فوراً
دیتے ہیں۔ جتنا کہ ہم چاہیں مگر ساتھ ہی اس کے لئے دوزخ کا داغہ بھی مقرر کر دیتے ہیں جہاں
وہ برے حال میں راندہ ہوا ہوگا اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے حصول کے
لئے کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی قدر کی گئی ہے
”وان لیس للانس ان الا ما سعی ہ وان سعیہ سوت یرى ہ ثم یجزاہ الجزاء
الافق و وان الی ربک المنتقی“ (۱۶)

تحقیق انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کے لئے کوشش کرتا ہے اور تحقیق اس کوشش کی
جانچ پڑتال کی جائے گی۔ اور پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا اور تحقیق تیرے پروردگار ہی کی
طرف ہر ایک امر کی انتہا ہے۔“

آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کا مفاد متاع قلیل ہے۔ لیکن آخرت
کا اجر غیر ممنون ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ نفس انسانی کثرت پسند واقع ہوتا ہے۔ اپنی
زندگی کے ساز و سامان میں وہ کثرت کا طالب ہے۔ کثرت مال و اولاد کی وجہ سے وہ فتنہ میں

میتلا ہو جاتا ہے۔ اس لئے خواہش کثرت اس دنیاوی زندگی میں شرانگیز اور سخت مذموم ہے۔ اسی مذموم خواہش کے باعث انسان اپنے ہم جنس انسانوں میں برتری اور فخر و مہابات چاہتا ہے۔ یہی خواہش کثرت مال و اولاد اور علو اور فخر تمام فتنہ و شرکی موجب ہے جو عالم انسانی میں بسپا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ مطلوب اگر نزدیک تر محسوس و مشخص ہو تو وہ ادنیٰ درجہ کی شے ہے۔ اور جب ہاتھ آئے تو "سعی" یا "جہاد" کا جذبہ سرور پڑ جاتا ہے۔ ارتقا کا راز اسی مسلسل جدوجہد میں مضمر ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ مطلوب ہمیشہ غائب ہی رہے اور اس کی طلب ہمیشہ حاضر ہو۔

آیات قرآنی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس مادی کائنات میں کوئی شے بذاتہ اصل مقصد نہیں۔ سب ذرائع ہیں ایک مقصد اعلیٰ کے حصول کے۔ جدوجہد یا جہاد زندگی محض حصول ذرائع کے لئے ہوتا ہے۔ ہماری تمام دوڑ دھوپ اسی وقت تک ہے جب تک ہم منزل پر پہنچ کر آسودہ نہیں ہوتے۔ اس لئے تمام ذرائع من و چہ ہماری "سعی" عمل کے مقاصد عارضی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب ادنیٰ ہی ہیں۔ مقصد اعلیٰ یا "منتہا" اور ہیما ہے۔

بت پرستی خواہ اس کی صورت کچھ بھی ہو اس لئے مذموم ہے کہ ادنیٰ ہے "عبودیت" ایک فطری جذبہ ہے انسان کسی حالت میں عبودیت اور عبدیت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جب تک اسے احساس احتیاج ہے وہ عبد ہے۔ کائنات میں کوئی شے احتیاج سے بالاتر نہیں اس لئے کوئی شے "معبود" نہیں جو احتیاج سے بالاتر بھی ہو اور حاجت روا بھی ہو۔ اجرام سماوی ہوں یا اشیاء ارضی سب ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اس احتیاج سے مستغنی نہیں۔ اس لئے معبود وہی ہے جو "غنی عن العالمین" اور "رب العالمین" بھی ہو۔ اس معبود حقیقی کو قرآن میں "اللہ" سے موسوم کیا گیا ہے۔

یہ بحث کہ کوئی ایسا معبود واجب الوجود ہے بھی کہ نہیں سر دست ہمارے موضوع

سے خارج ہے۔ لیکن اتنی سیدھی سادی بات بالکل واضح ہے اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کل نادی کائنات میں کوئی شے بشمول انسان اختیار سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر ایک کی فطرت میں عبودیت و عبودیت و ولایت ہے۔ چونکہ اختیار اور عبودیت و عبودیت لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے انسان نے علی قدر فہم جس شے کو اپنا حاجت روا دیکھا اسی کی بندگی قبول کی۔ پانی پیاس بجھاتا ہے وہ "جل دیوتا" ہو گیا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

لَا دُعَاةَ الْحَقِّ ط وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِنَّ كِبَاسِطَ كَفْبِهِ اِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاةً وَمَا هُوَ بِاَلذِّرَّةِ وَمَا اَرْكَبُ الْكُفْرِيْنَ اِنَّ فِيْ ضَلٰلٍ هٗ وَلَلّٰهُ لِيَسْجُدَ مِنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظُلْمًا اِنَّ الْعَذٰوَةَ وَالْاَصَالَ هٗ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ اللّٰهُ ط قُلْ اِنَّا نَتَّخِذُ مِمَّنْ دُونِہٖ اَوْلِيَاۡءَ لَآ يَمْلِكُوْنَ اَنْ نَّعۡزٰوَكُمْ ضَرًا ط (۳۱)

اسی اللہ سے خاص کر سچی دعا مانگتا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔ ان کو کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ہاتھ پھیلا کر پانی (جل دیوتا) کو کہے کہ میرا چلو بھر دو۔ وہ ہاتھ پانی تک نہیں پہنچتا اور نہ پانی اس کے ہاتھ آتا ہے۔ اسی طرح کافروں کی پراگھنا گمراہی ہی ہے۔ اور اللہ کے حضور ہی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں سے طوعاً و کرہاً تسلیم کرتے ہیں اور ان کے سائے صبح و شام، انہیں کہو کہ کیا تم نے اللہ کو چھوڑ کر ایسا کو اپنا سرپرست بنا رکھا ہے جو اپنے ہی نفس سے ضرر و فتنہ نہیں کر سکتے اور نفع پہنچا سکتے ہیں۔

اگر صد سال گبر آتش فرورد؟

چو یک دم اندر آں افتد بسوزد

آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کو تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے پر فضیلت عطا کی گئی۔

وَلَقَدْ حَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلَتَهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ط (۳۱)

تحقیق ہم نے اولاد آدم کو نوانا اور اس کو خشکی و تری میں اونچا کیا اور اس کو پاکیزہ رزق

دیا اور جو کچھ ہم نے پیدا کر رکھا ہے اکثر پر اس کو فضیلت دی۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمِمَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ

”اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ہم نے انسان کے لئے اپنی رحمت اور فضل سے مسخر کر دیا۔ اس میں اہل فکر کے لئے پتہ کی باتیں ہیں۔“

یہ حقیقت اہل فکر و علم پر بالبداہت ثابت شدہ ہے کہ

انسان کہ فلک ہاست سرفلکینہ او در حیرت او کم است دانندہ او

دارد خاصیت کہ در خسایج و ذہین ہر چیز کہ آفریدہ شد بندہ او (بیدار)

ذہنی ارتقا کے ساتھ اہل علم و حکمت مخلوقات کی بندگی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اور جو ابھی

تک مخلوق پرست ہیں، ان کی ذہنیت پست ہے اور جو انسان اپنے ہم جنس پر علو کا مدعی ہے وہ فرعون کی طرح دعویٰ خدائی کرتا ہے۔

بیدل بخصولی رزق آمادہ بسر سگ چاکر سگ نگشت و خربندہ خنر

از مخترعات کارگاہ امکان ؛ این ننگ شعور نیست جز صنع بشر

توحید اور شرک میں فرق اتنا ہی ہے کہ اگر انسان خدا پرست ہو گا ضرور ہے کہ مخلوق پرست

ہو۔ کیونکہ ”عبودیت“ اس کی فطرت میں ہے۔ توحید انسان کو مخلوق پرستی سے نجات ہی نہیں

دلاتی بلکہ تمام کائنات پر حکومت کا جائز حق بھی دیتی ہے۔ یہ مفہوم ہے ”خالیفہ فی الارض“

کا پیشر طیکہ باتباع حکم الہی ہو۔ یہ حکم اہل ذکر و فکر کو ”خالق السموات والارض“ میں مشاہدہ

ہوتا ہے۔ یہ نشان یا حکم الہی وہ ہے جس سے یہ نظام عالم قائم ہے اور جس میں کوئی شیطانی

قوت رخنہ انداز نہیں ہو سکتی ”ذٰلِكَ الَّذِيْنَ الْقِيَمُ“ لہ اسلٰمہ من فی السموات والارض

طوعاً و کرہاً۔

کائنات میں ہر ایک شے فطرۃً وہ شے طلب کرتی ہے جو اس کی ہستی کے قیام اور ارتقا

کے کام آتی ہے۔ نباتات اور ہوا اور پانی اور روشنی اور بقدر ضرورت حرارت اور مٹی کی طرف

مائل ہے۔ وہ آگ سے دور ہی زندہ رہ سکتی ہے اور ہر ایک شے بقدر ضرورت جس کا اندازہ

اسے فطرۃ معلوم ہے، یعنی ہے۔ کثرت کی طالب نہیں ہوتی جو اس کی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ یہ مفہوم ہے "تقدیر" کا۔ یعنی ایسا انداز اور مقدار جسے جس سے کسی شے کی ضرورت زندگی پوری ہوتی ہے۔ اگرچہ ہوا کا گرہ موجود ہے مگر ہم بقدر ایک سانس ہی لے رہے ہیں اس کا اندازہ خود فطرت کا مقرر کیا ہوتا ہے۔ پانی کا خزانہ موجود ہے مگر ہم بقدر پیاس ہی پیتے ہیں۔ لیکن اس کا اندازہ ہمیں کرنا پڑتا ہے۔ اور کبھی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے فطرت کا مقرر کردہ اندازہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔ لیکن انسان کا اندازہ تخمینہ ہوتا ہے۔ قریب قریب صحیح۔ ہر ایک شے میں بے انتہا خواص ہیں۔ اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کسی ایک شے کے کلمہ خواص اس پر منکشف ہو چکے ہیں۔ ان خواص یا کسی خاصہ کا انکشاف ہم پر یا تو فطرۃً (دوستیاً) ہوتا ہے یا مشاہدہ اور تجربہ یا تذکرہ و تفکر سے (من وراء حجاب) یا سوانہ انسان ہر ایک طبقہ میں اشیاء باثبات فطرت سرگرم عمل ہیں مگر ان میں ارتقا نہیں۔ انسان اتباع فطرت طوعاً یا کرہاً بھی کرتا ہے مگر اس کا ارتقا اس کے مشاہدہ اور تجربہ سے وابستہ ہے۔ وہ اس میں غلطی بھی کرتا ہے اور غلطی عقلاً رفع بھی ہوتی رہتی ہے مگر وہ مسلسل ترقی کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور اسی طرح غلطی بھی کرے گا اور ترقی بھی کرے گا یہ ممکن ہے کہ وہ دیگر اشیاء کی طرح غلطی نہ کرتا مگر وہ پھر انسان نہ ہوتا اور نہ خلافت عطا ہوتی کہ کائنات کو اپنے احاطہ تصرف میں لائے اس لئے ارتقا عقلاً ہی ممکن تھے۔

آگ کا خاصہ جلانا ہے۔ انسان آگ سے اپنے چوہے لہے بھی گرم کرتا ہے اور کئی مفید کام لیتا ہے۔ لیکن کسی دشمن کا گھر بھی جلا سکتا ہے اور اگر غفلت ہوئی تو

چوبیک دم اندران افتد بسوزد

آگ بے شعور شے ہے۔ انسان جس طرح چاہے اس سے خدمت لے۔ وہ اسے ایسے کام اور محل میں بھی استعمال کرتا اور کر سکتا ہے جو "ظلم" سے تعبیر ہوتا ہے۔ اور ہمارے زمانہ میں تو قویں آگ سے کھینچتی ہیں۔ بہر حال اشیاء کو تعبیری کام میں استعمال کرنا فطرت ہے اور فطرت اسی طرح استعمال کر رہی ہے۔ بخوبی کام انسان کرتا ہے اور اس کے نتائج سے بھی آگاہ ہے۔ اس لئے تعبیر و تخریب بھی عقلاً ہوتی ہے۔

دین ایک ہی ہے اور یہ دین کل کائنات کا ہے۔ لہٰذا سلم من فی السموات والارض
 بہ دین انسانی اختراع نہیں۔ بلکہ ہر ایک شے سے بشمول انسان بے نیاز ہے۔ ارشاد
 قرآن ہے کہ

”وما محمد الا رسولٌ قد خلت من قبلہ الرسلؕ افا لمن مات او قتل انقلبتم
 علی اعقابکمؕ ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یرضی اللہ بشیئما ظوسیجری اللہ
 الشکرین ؕ“ (۲۱)

محمد تو ایک رسول ہی ہے اور اس سے پیشتر بھی رسول گزر چکے ہیں اگر یہ اپنی طبعی
 موت سے مرجائے (جو یقینی امر ہے) یا مارا جائے (جس کا امکان ہے) تو کیا تم اٹھے پاؤں
 دین اللہ سے پھر جاؤ گے؟ جو بھی روگردان ہو اور وہ دین اللہ کا تو کچھ نہیں گاڑ سکتا خود ہی خسارے
 میں رہے گا۔ البتہ جو شکر گزار بندے ہیں اللہ ان کو جلدی ہی نیک اجر دے گا۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کا دین جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے۔
 ”ان الدین عند اللہ اسلام“ ہر ایک شخصیت سے بے نیاز ہے خواہ وہ رسول اور نبی کیوں

نہ ہو۔ جس کی موت کا اثر اس پر نہیں پڑتا۔ قوانین فطرت دریافت ہوتے ہیں اور جن پر
 منکشف ہوتے ہیں ان کی حیات و موت سے بے نیاز ہیں یہ قوانین افریقہ سے سرگرم

عمل ہیں۔ حکماء ابھی پیدا بھی نہیں ہوتے تھے اور مر بھی گئے مگر یہ قوانین جو کائنات اپنا
 کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح ”دین اللہ ہر ایک رسول کی شخصیت سے بے نیاز ہے رسول

پیدا ہوئے اور فوت ہو گئے۔ اگر دین ان کی شخصیت سے وابستہ ہوتا تو پیدا ہوتا رہتا اور مرتا
 رہتا۔ آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ بلحاظ ذہنی اور خارجی حالات یہ ”دین رسولوں پر

حسب ضرورت وقت جزوی منکشف ہوا مگر آنحضرت پر ”کلمہ“ اس کا اظہار ہوا۔
 ”ھو الذی ارسل رسوله بالہدای و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ط

و کفی باللہ شہیداً ؕ“ (۲۲)

”وہی اللہ ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس

پر دین کلمہ واضح ہو (اور اس کے ذریعہ تمام عالم انسانی پر واضح کیا جائے)

تمام انبیاء اور رسل ان ایام میں گزرے ہیں جن کو تاریخ اور قرآن میں ایامِ جاہلیت اور ظلمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سب قومی تھے دیگر اقوام سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ اور نہ عام فہم انسانی اتنا بلند تھا کہ اصل کتاب اللہ یعنی صحیفہ کائنات اور اس کی حکمت سمجھ سکتا۔ چنانچہ نفوسِ قدسیہ تھے جن پر اس کی حکمت کا اظہار حسب ضرورت وقت ہوتا رہا۔ آنحضرت ص کل عالم انسانی کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے (ایا ایہا الناس انی رسول اللہ اہیکم جمیعاً) اس لئے آپ پر دین بھی "کلمہ منکشف ہوا۔"

یہ سمجھنا چاہیے کہ آل حضرت کی بعثت سے پیشتر عالم انسانی طفولیت کے دور سے گذر رہا تھا۔ اور جب تک فہم بالغ نہ ہو لڑکوں کو احکام کے تحت ہی رکھا جاتا ہے جو اوامر اور نواہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تمام کتب مقدسہ سابقہ میں یہی احکام ہیں۔ جن کو احکام شریعت یا دھرم شاسٹریا "لاز" (LAWs) کہتے ہیں۔ احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک مستقل جن کو اصولی احکام کہتے ہیں۔ توراہ میں دس اور انجیل اور قرآن میں سات (سبعاً من المثانی)

ہیں۔ "المثانی" نام ہے اسفار موسوی کی پانچویں کتاب کا (DEUTRONOMY) یہ سات احکام اصولی ہر ایک قوم کے آئین و قوانین اور دستور العمل کی بنیاد ہیں اور ناقابل تفسیر و تبدیل

ہیں۔ دوسرے وہ احکام ہیں جو ذہنی اور خارجی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ حالات ہمیشہ بدلتے ہیں اور غیر محدود ہیں۔ اس لئے یہ تقاضا حالات ترمیم و تسیخ ہوتے رہتے

ہیں۔ دراصل یہی وہ احکام وقتی یا ہنگامی ہیں جو مختلف مذاہب کی تشکیل کا موجب ہیں۔ ایام جاہلیت میں یہ کام بھی انبیاء کا تھا کہ یہ تقاضائے حالات احکام وضع و واضح کرتے رہتے۔ حضرت موسیٰ کے بعد حضرت عیسیٰ تک انبیاء مسلسل مبعوث ہوتے رہے اور

وقتی احکامات میں ترمیم و تسیخ کرتے رہتے۔ اسفار موسوی میں دس احکام اصولی کے

علاوہ بہت احکام وقتی مذکور ہیں۔ انہی میں سے انبیاء ترمیم کرتے مگر عام فہم

پست تھا اور وہ توراہ کے ہر ایک حکم کو مستقل حکم شریعت سمجھتے رہے اور جو بھی نبی بدلتے

ہوتے حالات کے مناسب ان میں ترمیم کرتا یا نسخ کرتا تو عوام بھڑک اٹھتے۔ اس طرح

کئی نبی ماسے گئے کئی جلاوطن ہوئے اور کئی بھی کامیاب نہ ہوئے۔ جب تک ہر ممکن اذیت

اسے نہ پہنچانی گئی۔ اب ایک امت واحدہ میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں ایک تو پرانی لکیر
 پڑھی رہی اور دوسری نے بنی کا تبار کیا۔ اس کے بعد دوسرا بنی مبعوث ہوا تو اس نے
 اپنے پیش رو بنی کے احکام میں کچھ ترمیم کر دی۔ اب دو سیول کے متبعین میں مخالفت پیدا
 ہو گئی۔ اور تیسرا فرقہ یا مذہب پیدا ہو گیا۔ اسی طرح ہر ایک بنی ایک نئے مذہب کا بانی ہونا
 رہا۔ حضرت عیسیٰ تک بنی اسرائیل میں بے شمار فرقے پیدا ہوئے اور اپنی موت مرتے رہے
 حضرت عیسیٰ پر بھی یہی الزام لگایا گیا کہ آپ شریعت موسوی کو منسوخ فرما رہے ہیں آپ نے
 فرمایا کہ منسوخ نہیں تمہیں کر رہا ہوں یعنی جو تقاضا ہے ان کو رفع کر رہا ہوں اور جو کچھ حالات
 کا تقاضا ہے پورا کر رہا ہوں کیونکہ میں بھی نبی ہوں اور بنی صاحب اختیار ہوتا ہے
 مسلمانوں میں فرقہ بندی یا مذہب کا شاخسانہ اسی نوعیت کے تحت نکالا گیا جو
 بنی اسرائیل کے حالات میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یہی ہماری بحث کا موضوع ہے اس لئے
 مفصل بیان کیا جاتا ہے۔

ختم نبوت آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ بنی "صاحب اختیار و حکومت ہوتا
 ہے۔ ایام جاہلیت میں یہ "نبی نبی حکومت نہ صرف بنی اسرائیل بلکہ

کل اقوام میں ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ اعم آریہ میں رشی منی وغیرہ تھے اور یہی آئین و
 قوانین وضع کرتے رہے۔ دوسری حکومت دنیوی ملوک اور راجوں کی تھی اور اب بھی
 ہے اگرچہ دیرسویں طے والی ہے یہ وضع کردہ قوانین کو نافذ کرتے۔ اعم آریہ میں ان دو حکومتوں
 میں ابتدائیں راز دارانہ اتحاد تھا مگر مذہبی حکومت دنیوی حکومت پر غالب تھی۔ جب
 تصادم ہوا تو دنیوی حکومت کا غلبہ ہو گیا۔ مگر دونوں حکومتیں علیحدہ علیحدہ ہی رہیں۔ اعم

سامیر میں بعض اوقات دونوں حکومتیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی تھیں جیسے
 حضرت موسیٰ اور داؤد و سلیمان تھے۔ اس حکومت کے خاتمہ کا اعلان بذریعہ قرآن عظیم
 کیا گیا۔ احکام بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اب شخصی نبوت سے شوری یعنی
 جمہور کی نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور ختم شوری بینہما چنانچہ آنحضرت
 بھی وقتی احکام شوری کے مشورہ سے صادر فرمایا کرتے۔ (شاورہ ہم فی الامم) اور آپ کے

بعد خلفاء راشدین کا بھی یہی عمل رہا۔

قرآن توراہ کی طرح خود کتاب احکام نہیں، اس میں صرف سات اصولی احکام (سبغامن المثنیٰ) مثنیٰ سے لئے گئے ہیں۔ اور انہی کی تشریح امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں کی گئی۔ قرآن کتاب اصول احکام ہے اور احکام بہ تقاضائے حالات ذہنی اور خارجی وضع کرنا سکھاتا ہے۔ اور تشریح کی غرض بھی یہی ہے۔ لیکن خود قرآن عظیم "سبغامن المثنیٰ" سے بالکل علیحدہ ہے۔ اور محکمات ہے (یسین و القرآن حکیم) یہ تفصیل یا بیان کتاب ہے جس کی تعریف ہے "لا ریب فیہ" جس میں کوئی الجھن، کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہ صحیفہ فطرت ہے جس کا مصنف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہم نے اس موضوع پر جو مستقل ہے علیحدہ بحث کی ہے۔ سر دست اس مقام پر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

تمام احکامات جو احادیث میں مذکور ہیں خواہ آنحضرتؐ یا خلفاء راشدین سے منسوب ہیں، وقتی اجتہادات ہی تھے۔ اور ایسے اجتہادات تابعین اور تبع تابعین کے دور میں مجتہدین ائمہ دین بھی کرتے رہے۔ چونکہ ان کا زمانہ آنحضرتؐ اور صحابہ کرام سے نزدیک تر تھا۔ اس لئے ان کو ان اجتہادات میں جو در اول سے منسوب تھے رد و بدل کی ضرورت محسوس نہ ہوئی لیکن حالات بہت کچھ بدل چکے تھے اور احادیث میں کوئی صریح حکم ان کے بارہ میں نہ تھا۔ مجتہدین نے کوشش یہی کی کہ ان بدلے ہوئے حالات سے عہدہ براہ منونے کے لئے جو بھی احکامات وضع کئے وہ بطریق "استنباط" کئے یعنی اس بات کا لحاظ رکھا کہ ان کے احکام دور اول کے احکام کے خلاف نہ ہوں اور در اول کے اجتہادات سے اخذ کئے جائیں۔ "استنباط" عقلاً ہوتا ہے جو کچھ استنباط ائمہ دین نے کئے وہ اپنے اپنے فہم کے مطابق کئے۔ اس لئے ان کے مستنبط شدہ اجتہادات میں اختلاف لازم تھا اور پیدا ہوا۔

یہ دور بھی گزر گیا۔ دور دوم کے ائمہ دین کے متبعین کئی مذاہب یا فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ تیسرے دور میں حالات دور اول اور دور دوم کے حالات سے مختلف تھے اس دور کے مجتہدین نے طریق "استنباط" جو اب مستقل حیثیت اختیار کر چکا تھا

سے نہ دیا۔ وہ دور اول و دوم کے اجتہادات سے مسائل مستنبط کرتے رہے۔ ان کے
انتہائی کرنے والوں کی جماعتیں مذاہب پر اضافہ کرتی گئیں۔ غرض یہی اجتہادات اور
طریق استنباط ہمارے زمانہ تک جاری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بغداد و دو فریق کی پیدائش
اسی سے ہوئی۔

اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "اصول فقہ اسلامی" میں بحث کی ہے۔ اگر

ایسے اجتہادات وقتی منظم مجلس شوریٰ میں وضع ہوتے ہوتے جیسی کہ آنحضرتؐ اور

✓ خلافت راشدہ کے دور میں تھی تو غالباً اتنے مذاہب جن کی فہرست بغدادی اور شہرستانی

وغیرہ نے "فرق بین الفرق" اور "المسل والنحل" میں لکھی ہے۔ پیدائش ہوتے۔ خرابی یہ

ہوتی کہ ملوکیت کا دور شروع ہو گیا۔ اور شوریٰ رفتہ رفتہ پھر سے شخصی دینی حکومت میں

تبدیل ہو گئی۔ شخصی دینی حکومت اور شخصی دینی حکومت لازم و ملزوم ہیں۔

✓ یہ دینی حکومت ایک تو شخصی تھی جس کی پوری شان شیعہ مذاہب میں نظر آتی ہے

یہ دینی حکمران سلباً بعد نسل امامت پر متمکن ہے مفلس حالات ہم مناسب مقام پر بیان کریں

گے۔ شیعوں میں انفرادی دینی حکومت نسبتاً نہیں لیکن وسفا نسیم کی گئی۔ شیعوں نے امامت

اولاد حضرت علیؑ میں محدود رکھی شیعوں نے یہ نہیں نام کر دیا بشرطیکہ کوئی مسلمان شرائط امامت

پوری کرے۔ بہر حال امامت کا دعویٰ ہر ایک فرد واحد ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا۔ شوریٰ کی حیثیت

ایک فرد نے اختیار کر لی۔ مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔

✓ آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کو دعوت فکر دیتا ہے۔ قرآن

نہو کتاب اصول احکام ہے۔ احکام انہی اصول سے استنباط عقلاً ہے جس کو اصطلاحاً

میں تفقہ فی الدین کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ شوریٰ میں انہی اصول سے احکام اخذ

فرماتے رہے۔ جو آنحضرتؐ کے اجتہادات وقتی ہیں اور احادیث میں بیان کئے گئے

ہیں۔ اگر آئندہ نسلیں اسی طرح تفقہ فی الدین کرتے۔ تو اختلاف مذاہب بھی پیدائش

ہوتا۔ یاد رہے کہ "مذہب" کے معنی وہ روش ہے جو کسی اہل علم نے دین میں اختیار

کی اور اس کے متبعین نے تقلیداً اختیار کی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یوحنیفہ یا شاعتی

وغیرہ کا ایسا اور ایسا مذہب ہے تو اس سے مراد وہ تفرقہ ہے جو ان حضرات نے قرآن اور احادیث اور اقوال و عمل صحابہ میں کیا اور جو کچھ اس سے مستنبط کیا۔ اس نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی | حقیقت یہ ہے اور یہی کچھ آیات قرآن سے ثابت شدہ ہے کہ آنحضرت نے اپنے بعد "قرآن عظیم" دنیائے اسلام کی ہدایت کے لئے چھوڑا ہے جب مسلمانوں نے اسے چھوڑا تو رسول کو بھی بارگاہ الہی میں شکایت کرنی پڑی

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۱۹)"

(اے میرے پروردگار میری قوم نے اسے مہجور بنا کر رکھ دیا۔)

جب قرآن کو چھوڑ کر احادیث کی طرف توجہ ہوئی تو قرآن مہجور ہو کے رہ گیا۔ جب دونوں کو چھوڑ کر اجتہادات ائمہ دین پر تقلید کا ر بند ہونے لگا تو قرآن و احادیث مہجور ہو کر رہ گئیں۔ آنحضرت تو تفرقہ فی القرآن فرماتے اور وقتی خارجی حالات کے تقاضا کو بھی سمجھتے تھے اور اپنے زمانہ کی عام ذہنیت سے بھی واقف تھے۔ اس لئے جو کچھ اجتہاد فرمایا۔ وہ وقتی حالات کے مناسب تھا۔ آئندہ نسلوں نے تفرقہ فی الاحادیث شروع کر دیا۔ اور ان کے بعد انہوں نے تفرقہ فی الاجتہادات ائمہ دین کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے سوا جس میں بھی تفرقہ کیا جائے گا وہ تقلید ہی ہوگی۔ عموماً اہل تقلید یہ عذر لنگ پیش کرتے ہیں کہ نص قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت کا "اسوہ حسنہ" قابل تقلید ہے۔ اس حد تک تو وہ سچ کہتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ اس "اسوہ حسنہ" کو جب قرآن واجب الاتباع قرار دیتا ہے تو اس کا مذکور قرآن میں ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ حضرت ابراہیم والذین معہ کا اسوہ حسنہ بیان کیا گیا ہے اور قرآن میں بیان کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ تمام قرآن آنحضرت کا خلق (سیرت) ہے۔ اس لئے ہمیں اس اسوہ حسنہ کی تلاش میں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ قرآن سے باہر ہوتا تو آئندہ نسلوں کو چند و چند مشکلات کا سامنا ہوتا اور جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن سے باہر ہے وہ انہیں مشکلات میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کو اس غلط فہمی نے ضرورتاً احادیث کی طرف رہنمائی کی جس کی صورت اہل دو صدی ہجری میں کسی کو پیش نہ آئی۔ "اسوہ حسنہ"

ایسی بات نہ تھی اور نہ ہے کہ ایسے کلام میں جو محفوظ نہیں پائی جاتے جس میں موضوعاً کی یہ کثرت ہے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ میں سے قریباً تین ہزار کا انتخاب کیا اور جو قلمبند کی گئیں ان کی نسبت بھی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ضرور صحیح ہے۔ جب کہ درایتاً ان کو کبھی پرکھا نہیں گیا۔ اور کسے معلوم ہے کہ امام بخاری نے وہی کچھ لکھا جو ہم پڑھ رہے ہیں۔ جب کہ یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ مخالفین اس میں کم و بیش کر سکتے تھے امام غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" جب آپ کی زندگی میں مصر میں جلائی گئی تو دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ فقرات جن پر علماء مصر آگ بگولا ہوئے۔ امام صاحب کی اس کتاب میں موجود ہی نہ تھے۔ صحیح بخاری میں مہدی اور آلد مہدی کے بارے میں کوئی حدیث نہیں۔ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں ایک حدیث ہے اور وہ بھی الحاقی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دنیا اسلام میں اس فتنہ آبد ثانی نے کتنا شہر برپا کر رکھا۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔ امام مالک کا موطا سب سے پہلی کتاب حدیث جس میں پانچ سو احادیث ہیں۔ امام صاحب نے وفات سے چالیس برس پیشتر یہ کتاب لکھی اور ہر سال اس میں کمی کرتے رہے۔

یہ بحث کہ احادیث حجت شرعی ہیں یا نہیں ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن اس حقیقت سے کسی محقق کو انکار نہ ہوگا کہ تمام فرقہ بندی اور شرانگیز تفرقہ انہی احادیث کی بنا پر پیدا کیا گیا۔ میرا اپنا عقیدہ ہے کہ احادیث خواہ یہ کسی فرقہ کے نزدیک ایک معتبر یا نامعتبر ہوں، صحیح تسلیم کرتے ہوئے محض اجتہادات وقتی ہی تھے۔ جسے احکام شریعت اسلامیہ سے موسوم کیا جاتا ہے وہ کوئی مستقل شے نہیں۔ استقلال صرف قرآن عظیم کو حاصل ہے۔ یہ جامع و مانع کتاب اصول ہے۔ اسی میں تفقہ آنحضرتؐ فرماتے اور آپ کا اسوہ حسنہ یہی ہے کہ "راسخون فی العلم" بھی اس میں تفقہ کریں۔ یہی ہر زمانہ میں ذہنی اور خارجی حالات کا ساق و دیتا ہے۔

یہ اعتراض و قیاس ہے کہ اگر صرف قرآن میں تفقہ کیا جائے تو پھر بھی وہی اختلاف پیدا ہوگا جو تفقہ فی الاحادیث سے ہوا اور ہر ایک ائمہ دین کا مذہب اپنے معاصرین اور متقدمین سے

کچھ مختلف ہی ہے۔ تفقہ عقلاً ہوتا ہے اور اس کے مدارج میں اختلاف ہے۔ خواہ کوئی شخص کتنا ہی نیک نبی سے تفقہ کرے۔ اختلاف ضرور ہوگا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ اختلاف بلکہ تشریحیں تفرقہ اسی صورت میں پیدا ہوگا۔ جب اجتہاد کا حق کسی واحد شخصیت کو دیا جائے۔ لیکن جب کوئی امر شوریٰ میں بحث کا موضوع بنے گا۔ تو آخر ایک رائے پر امت کا اجماع ہو سکتا ہے۔ یہ رائے خواہ غلط ثابت ہو۔ اس میں تشریح نہ ہوگا اور جب واقعات اور حالات آئندہ اس کی غلطی ثابت کریں تو رفع بھی ہو سکتی ہے لیکن جب ایک جماعت اپنے آپ کو کسی واحد شخصیت سے وابستہ کرے تو بقول عزالدین عبدالسلام ایسا شخص اپنے امام کو پیغمبر مرسل سمجھتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کے امام کے اجتہادات تقویم پارینہ بدلے ہوتے ترقی یافتہ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ تقلید اسی پر جمارتا ہے بلکہ نظائر قرآن اور حدیث کو ٹالنے کا جیلہ تلاش کرتا ہے اور اپنے اور بوجہ تعصب اپنے امام کی طرف ماری میں قرآن و سنت کی تاویلات بعیدہ اور باطلہ کرتا ہے، عزالدین یہ بھی لکھتا ہے کہ

”ابتداء میں سلف صالحین کا یہ عام دستور تھا کہ اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہوتا تو کسی عالم سے دریافت کرتے اگر نسلی نہ ہوتی۔ دوسرے تیسرے سے پوچھ پیتے کسی سے وابستہ نہ تھے۔ صرف قرآن اور سنت سے وابستگی تھی اور نہ کوئی فقیہ ہی کسی کو کہتا کہ میری تقلید کرو بلکہ مسئلہ پوچھنے والے کو یہ بھی تاکید کہتا کہ میرے قول یا اجتہاد کے خلاف اگر تمہیں قرآن اور سنت سے کچھ ملے تو میرے قول کو رو کرنا۔ لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ فقہاء المقلدین یعنی فقیہ بھی اور مقلد بھی اپنے امام کی سند کا ضعف جانتے ہوئے اسی کی تقلید کرتے ہیں۔“

عزالدین کے اقوال کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب ”عقد الجید میں نقل کیا ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ ہمیں کسی امام کی تقلید اسی حد تک کرنی چاہیے جس حد تک قرآن و سنت کے موافق ہو۔ اگر کسی مجتہد کا اجتہاد

کسی دوسرے سے بہتر پایا جائے تو بہتر کو اختیار کرنا چاہیے۔
شاہ صاحب منصب امامت واجتہاد پر بحث کرتے ہیں اور ان کے مدارج بھی
بیان فرماتے ہیں کہ

”ایک تو مجتہد مطلق ہے دوسرا منتسب جو مطلق سے منسوب ہے تیسرا
مجتہد فی المذہب اور چوتھا مجتہد فی الفتویٰ۔“

لیکن ہمارے نزدیک تو یہ سب تکلفات ہیں اور انہی تکلفات نے ایک علم
فقہ کی صورت اختیار کر لی۔ جس نے ہمارے دماغوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اگر کوئی
مجتہد ہے تو اس کی جگہ شورے نے میں ہے۔ اگر اس میں تشدد حاصل نہیں کر سکتا تو
اپنے اجتمادات شوریٰ کی خدمت میں پیش کرے۔ شورے سے باہر اپنے عقاید کی اشاعت
کرنا اور ایک جماعت کو اپنی شخصیت سے وابستہ کرنا فرقہ بندی اور تفرقہ کی طرح ڈالنا
اور دنیائے اسلام میں آج کل یہی ہو رہا ہے اور عرصہ سے ہو رہا ہے۔ ملت اس شرانگیز
تفرقہ کو مٹانے کی کوشش نہ کرے اور اس تلخ تجربہ کے بعد جو ہمیں ہو چکا ہے تو ارشاد
الہی یہ ہے کہ

”ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم ط اذا اراد الله بقوم
سوءا فلما رآه قوله وما لهم من عذر من قال“ (۳۱)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کے معاملات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت (خارجی
حالات کے مناسب) نہ بدلے (اور جب باوجود انتباہ نہیں بدلتی) تو اس کے برے
دن آجاتے ہیں جو ٹالے سے نہیں ٹلے اور اس کا کوئی حمایتی نہیں ہوتا۔ ہاں اللہ کا رسا
ہے۔ (اگر بد جو ع کرے)

(یہ تفرقہ جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں باوجود اختلاف رائے یا اجتمادات پیدا نہ ہوتا۔ اگر
متبعین اپنے آپ کو ائمہ دین کی شخصیت سے وابستہ نہ کرتے اور ایک امتیازی نام سے
اپنے فرقہ کو موسوم نہ کرتے۔ اسباب تفرقہ میں سے ایک "اسما" بھی ہیں جن کی پوجا
عموماً لوگ کرتے ہیں۔ ارشاد قرآن ہے کہ

”ما تعبدون من دون الله الا اسما سميتموها انتم و اباؤكم ما انزل الله
 بها من سلطان ان الحكم الا لله ط امرا لا تعبدوا الا ايات ذلك الدين القيم ولكن
 اكثر الناس لا يعلمون“ (۱۲)

تم تو اللہ کو چھوڑ کر صرف ناموں کی پوجا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے
 رکھے ہیں۔ اللہ نے اس کی کوئی سند نازل نہیں فرمائی۔ اس کا امر تو ہمیشہ یہی ہے کہ
 اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہ ہے دینِ قیم لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف
 نہیں۔

فاضل رینان ”پولوس“ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ
 ”مسیحی نام پولوس کی اختراع ہے۔ اس سے پیشتر مسیح کے شاگرد
 (حواری) اپنے آپ کو ”انخوان“ اور ”مومنین“ ہی کہتے تھے۔ پولوس نہ تو مسیح
 اور نہ حواریوں کی صحبت کا فیصل یافتہ تھا۔ اس نام نے یہود اور متبعین مسیح
 میں ہمیشہ کے لئے تفریق پیدا کر دی۔
 خود مسیح اپنے ترم کی نسبت کیا ارشاد فرماتے ہیں

”میں اس کے بعد دنیا میں نہ ہوں گا مگر یہ (حواری) دنیا میں ہیں، میں تیرے
 پاس آتا ہوں اے قدوس باپ (رب) اپنے اس نام سے جو تو نے مجھے
 بخشا ہے۔ ان کو وابستہ رکھ تاکہ وہ ہماری طرح ایک ہوں (تفرقہ سے
 محفوظ رہیں) جب تک میں ان کے ساتھ رہا میں نے تیرے ہی نام سے
 جو تو نے مجھے بخشا ہے انہیں وابستہ رکھا۔ میں نے ان کی نگہبانی کی اور
 ہلاکت کے فرزند کے سوا ان میں سے کوئی گمراہ نہ ہوا تاکہ کتاب مقدس
 کا نوشتہ پورا ہو۔ لیکن اب میں تیرے پاس آتا ہوں اور یہ باتیں دنیا میں
 کہتا ہوں تاکہ وہ بات جو مجھے محبوب ہے (تیرے نام سے وابستگی) انہیں
 بھی محبوب ہو۔ میں نے تیرا کلام انہیں پہنچا دیا۔ (مقدس یوحنا ۱۷)

ارشاد قرآن ہے کہ

وَاذْ قَالِ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ اَنْتَ قَلْتُ لِلنَّاسِ اتَّخَذُوْنِي وَاَقِي

الْمَلٰٓئِكَةِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط (۱۶)

اور اللہ نے جواب طلب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے، کیا تو نے لوگوں کو کہا کہ مجھے اور میری والدہ کو ٹھاکر بنا کر پوجو اللہ کو چھوڑ کر۔ عرض کی تیری ذات اس شرک سے پاک ہے۔ میں وہ بات کیسے کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق ہی نہیں۔ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو تجھے تو اس ضرور علم ہوتا تو جو کچھ میرے جی میں ہے جانتا ہی ہے (کہ میں نے کبھی اسکی خواہش بھی نہیں کی) اور جو کچھ تیرے جی میں ہے میں نہیں جانتا اور تو ہی پوشیدہ امور کا بخوبی جاننے والا ہے۔ میں نے تو ان سے وہی کچھ کہا جس کے کہنے کا تو نے مجھے امر فرمایا اور یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کرو میرا اور تمہارا رب ہے۔ اور جب تک میں ان میں رہا ہوں ان پر نگہبان تھا۔ اور جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کے عقائد و اعمال کو دیکھنے جاننے والا ہے۔ ہر ایک شے جو بھی ہے تجھ سے پوشیدہ نہیں۔

نیز ارشاد قرآن ہے کہ

وَجَاهِلٌ وَاَقِي اللّٰهَ حَقَّ جِهَادٍ ۙ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَاَجْعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ

حَرِيحٌ مَّۤا اَبٰىكُمْ اِبْرٰهِيْمٌ ۙ هُوَ سَمَّكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلِ ذٰلِكَ ۙ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

شٰهِيْدًا عَلَيْكُمْ ۙ وَتَكُوْنُوْا شٰهِيْدًا عَلٰی النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَ

اعْتَمِدُوا بِاللّٰهِ ۙ هُوَ مَوْلٰٓئِكُمْ فَتَجْمَعُوْنَ ۙ وَنَعْمَ التَّضَمِّيْرُ۔ (۱۶)

اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو اور حق جہاد پوری طرح ادا کرو اس نے تمہیں اس کام کے لئے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ دین ملت ابراہیم تمہارے باپ ابراہیم کا ہے جس نے تمہارا نام پہلے ہی مسلمان رکھا اور یہی نام تمہارا اس قرآن میں بھی ہے تاکہ رسول تم پر (اسی نام کے ساتھ) نگہبان ہو اور (اسی نام کے ساتھ) تم اور لوگوں پر نگہبانی کرو۔ پس قائم رکھو صلوٰۃ اور دو زکوٰۃ اور دین اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تمہارا مولا ہے۔ اور کیا ہی اچھا مولا اور کیا ہی اچھا دوکار ہے۔

المختصر اسماء من دون اللہ سے وابستگی بھی اسباب تفریق میں داخل ہے۔ اگر ان سے

وابستگی میں کچھ خوبی ہوتی تو آنحضرتؐ کا زیادہ حق تھا کہ ہم محمدی یا احمدی کہلاتے لیکن قرآن میں تو صرف "مسلمین" ہی ایک نام ہے جو ہمارے لئے تجویز فرمایا گیا ہے۔ یہ نام کسی بشری شخصیت کسی قوم یا ملک کا نہیں۔ اسلام "دین اللہ ہے۔ اور جس نے اس دین کو اعتقاداً اور عملاً تسلیم کیا وہ مسلم ہے۔ اس لئے مسلم اللہ سے وابستہ ہے اور اللہ والا ہے۔ قہل انتم مسلمون" ہم واضح کر چکے ہیں کہ دین اللہ آنحضرتؐ کی بشری شخصیت سے ایسا ہی بے نیاز ہے جیسے دیگر رسل سے۔

شریعت اسلامیہ کے چار سرچشمہ سمجھے گئے ہیں۔ ایک کتاب اللہ یعنی قرآن اور سنت جس کا مذکور احادیث میں ہے۔ تیسرا اجماع جس پر مسلمانوں کی اکثریت کا بند ہے چوتھا قیاس یعنی تفقہ فی الدین۔

آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں منبج شریعت ایک ہی تھا اور ایک ہی ہونا چاہیے اگر ایک سے زیادہ ہو تو ایک کے متوازی ہوں گے یہ فضول قضیہ ہے۔ اور اگر ایک کی باقی تین اسی کی شاخیں ہیں تو بہر حال منبج ایک ہی ہوگا۔ ہم کافی بحث کر چکے ہیں کہ قرآن جامع اور مانع کتاب اصول احکام ہے اور یہ کہ وقتی اور ہنگامی احکامات ذہنی اور خارجی حالات کے تابع ہوتے ہیں جو ہمیشہ بدلتے ہیں اور غیر محدود ہیں۔ کوئی کتاب ایسی نہیں ہو سکتی جو ان تمام حالات پر حاوی ہو جو قیامت تک رُو نما ہوں گے۔ اسی لئے اصول حاوی ہوتے ہیں۔ چونکہ فطری ہوتے ہیں اس لئے ناقابل تغیر و تبدل بھی ہیں کوئی شخص خواہ رسول اور نبی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے احکام وضع نہیں کر سکتا جو ناقیامت تمام حالات ممکنہ پر حاوی ہوں۔ وہ اتنا ہی کر سکتا کہ اپنے زمانہ کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور جو عام ذہنیت کے متقاضی ہوں احکام وضع کرے۔ بالفرض مجال اگر وہ ایسے احکام وضع کر سکے تو وہ اپنے اور آئندہ زمانہ کی نسلوں کی قوت فکریہ کے عمل کے لئے کچھ نہیں پھوڑے گا۔ اور ان کیلئے نہ تقلید اور کوئی چارہ کار نہ رہے گا۔ حالانکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ اگر انسان بصیرت سے کام نہ لے تو ہانم سے بھی بدتر ہے۔

”قل خذوا سبیلی اذعوا الی اللہ علی بصیرتہ انا ومن اتبعنی وسبحن اللہ وما
 انا من المشرکین و ما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیہم من اهل القری“ (پکلی)
 ”کہو کہ یہ ہے میرا طریق کہ اللہ کی طرف دعوت علی بصیرت دیتا ہوں میں اور وہ بھی
 جو میرا اتباع کرتے ہیں (علی بصیرت ہی عمل کرتے ہیں) اور سجن اللہ میں مشرکوں سے
 نہیں (کہ کسی کی تقلید اندھا دھند کروں یا کسی کو ایسی تقلید کے لئے کہوں) اور تجھ سے پہلے
 ہم نے رسول آدمی ہی بھیجے جو بستیوں میں رہتے تھے ہم نے ان کی طرف وحی کی :
 اگر ایسی صورت ممکن ہوتی تو ایمان و عمل جبری ہوتا۔ لاکھ الا فی الدین قد
 تبین الرشدمن الغی۔ کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص کسی کی تصدیق کرتا ہے اس پر اس
 کی صداقت ایسی منکشف ہونی چاہیے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو اور یہ بصرد
 بصیرت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ آیات ۳۱ محولہ بالا میں یہ واضح کیا گیا ہے جو شخص بصیرت
 سے کام نہیں لیتا ”مشرک است ان فضولنا ہجرا“ وہ ما انزل اللہ کا اتباع نہیں کرتا
 وہ کور کورانہ کسی بشری شخصیت کی تقلید کرتا ہے اور اگر یہ تقاضا بشریت اس سے کوئی
 غلطی سرزد ہو تو مقلد اسے ملت بنا لیتا ہے

کفر گرو کا ملے ملت شود

معتی را ملتے ملت شود

تمام رسول بشر ہی تھے یعنی بشری فطری کمزوریوں سے پاک نہ تھے۔ بستیوں
 میں رہتے تھے۔ یعنی ضروریات زندگی سے بے نیاز نہ تھے۔

یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب ہجرت سے ایک دو صدی بعد مسلمانوں پر ذہنی جمود
 چھا گیا تو انہوں نے اپنی قوت فکریہ کو معطل سمجھ کر بیکار کر دیا۔ اس لئے تنزل میں آئے
 کہ بدلتے ہوئے ترقی یافتہ زمانہ کے خارجی حالات کے مناسب اپنی ذہنیت بدلی
 ہمارے علما اور حکماء کے انفرادی اجتہادات بھی ان کے اپنے نہ تھے۔ وہ تفقہ فی الحدیث
 اور تفقہ فی الاجتہاد متقدمین ہی کرتے رہے۔ اس تمام بحث سے واضح ہو گیا ہوگا
 کہ آنحضرت کے اجتہادات جو احادیث میں مذکور ہیں سب وقتی ہی تھے اور واجب

کہ وقتی ہی ہوں۔ لیکن جب ان کو مستقل حیثیت دی گئی تو آئندہ نسلوں کی قوت
فکر یہ منفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس کے نتائج ہم دیکھ رہے ہیں بلکہ بھگت رہے ہیں۔
بعض اہل الرائے یہ کہتے ہیں کہ سنت رسول اللہ قرآن کی تشریح و تفسیر ہے
یہ رائے اس حد تک ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ یہ بھی وقتی ہی تھی۔ یہ قیاس کہ آنحضرتؐ
اپنے زمانہ کے عام فہم و ذہنیت سے بالاتر باتیں کیا کرتے۔ یہ بات ہے کہ کوئی شخص
آپؐ کی بات سمجھ سکتا تھا۔ آنحضرتؐ کی ذہنیت خواہ کتنی ہی بلند اور بلند تر ہو آپؐ
کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جب تک بقدر فہم عامہ بات نہ کرتے اور سچ تو یہ ہے
کہ یہی مشکل بلکہ مشکل تر بات ہے۔

ہر چند زہر و ماہ و انجم گفتن
صد نسخہ تاخر و تقدم گفتن
گر بر سر انصاف رہی شورا
یک حرف بقدر فہم مردم گفتن

ایسے کلام کو بلیغ کہتے ہیں جو عوام کے ذہن تک رسا بھی ہو اور ان کے نفوس
میں اثر بھی کرے۔

ارشاد قرآن ہے کہ

و اعظم و قتل لم فی انفسہم قولاً بلیغاً (۴)

”انہیں وعظ و نصیحت کر اور بات وہ کہ جو ان کے فہم تک رسا ہوتے ہوئے
ان کے نفوس میں اثر کرے۔“

یہ جامع آیت قول بلیغ کی مثال بھی ہے یعنی ہدایت بھی ہے اور خود بلیغ کلام بھی
ہے۔ آنحضرتؐ اپنے ہی زمانہ کے فہم کے مطابق بلیغ کلام فرما سکتے تھے۔ یہ اعجاز صرف
قرآن کا ہے۔ کہ وہ ہر ایک زمانہ کے فہم بنالپست تک رسا ہے اور موثر بھی ہے۔ یہ
رائے کہ احادیث بھی ایسی ہی مستقل حیثیت رکھتی ہیں جیسا کہ قرآن ”فانوا بسورۃ
من مثله کی تکذیب کرتے۔ اگر تمام دنیا و جہاں کے جن و انس قرآن کی ایک
سورت کی مثل نہیں بنا سکتے تو آنحضرتؐ کی احادیث کو بھی ”وحی“ کا درجہ دینا پڑیگا
اور آنحضرتؐ کی بشریت کی نفی بھی کرنی پڑے گی اور یہ کہتا پڑے گا کہ آپؐ نے کبھی

بشری عقل و حواس سے کام نہیں لیا۔ اس آیتِ قل انما انشا بشر مشاعرہ کی تکذیب پر بھی ہم مجبور ہوں گے۔ اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بحیثیت بشر آپ فطری بشری کمزوریوں اور سہو و خطا سے بھی معصوم تھے۔ مختصر یہ کہ آپ کو الوہیت کا درجہ دینا پڑے گا۔ ان اوراق میں بعض فرقوں کا حال اور عقیدہ پڑھیں گے۔ ان حضرات نے عصمتِ انبیاء بلکہ الوہیتِ انبیاء کو اپنے عقائد کی بنیاد قرار دیا۔ انبیاء کا کہنا مذکور ہے بلکہ اپنے اماموں کی نسبت بھی ان کا یہی عقیدہ ہے جو مشرکین اہل کتاب کا اپنے انبیاء اور غیر اہل کتاب کا اپنے دیوتاؤں اور اوتاروں کی نسبت ہے۔

امام احمد بن حنبل نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تمام احادیث و روایات تفسیر و

فضائل و معانی کے سند ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ بے سند نہ سہی، صحیح مان لو۔ اور میں مانتا ہوں۔ لیکن یہی کہوں گا کہ اجتہادات وقتی تھے۔ اس دعویٰ کی صداقت اس طرح بھی پرکھی جاسکتی ہے کہ آنحضرتؐ اور خلفاء راشدین کے عہد میں جو نبوت کے اقرب ہے مسلمان ارتقائی منازل سرعت سے طے کر گئے۔ اب کیا وجہ ہے کہ تنزل میں آ رہے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ احادیث اس زمانہ کے بالکل مناسب ہدایات تھیں لیکن ہمارے زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ وہی قوم پرانی لکیر کو پیستی رہتی ہے جو رجعت پسند ہو اور ارتقا میں رجعت نہیں ہے اور نہ سکون ہے۔ یا تو آگے بڑھو اور اگر بڑھ نہیں سکتے تو پستی میں گر کر ہلاک ہو جاؤ۔ قویں اسی طرح تباہ و برباد ہوئیں۔ مزید بحث تعامل کے تحت کی جائے گی۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ آنحضرتؐ نے صحابہ کرام کو متنبہ فرمایا تھا کہ "قرآن کے سوا کوئی قول جو مجھ سے منسوب ہو نہ لکھا جائے"۔ باوجود امتیہاہ لکھا گیا۔ غرض تو بالکل واضح ہے کہ احادیث میں محض وقتی اجتہادات کا بیان ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مسلمان بھی اس کو رہی مستقل حیثیت دیں جو قرآن کو حاصل ہے۔ جیسا کہ اپنی امتوں سے کیا اور گمراہ ہو گئیں۔ ما انزل اللہ جو کچھ توراہ و انجیل و صحف انبیاء میں تھا۔ احادیث ابراہیم و موسیٰ

مخلوط ہو کر رہ گیا۔ اگر آنحضرتؐ تحریر احادیث سے تاکیداً سختی سے منع نہ کرتے تو یہ بھی مستقل صورت اختیار کر لیتیں۔ اور اس طرح قرآن کا استقلال بذاتہ قائم نہ رہتا اور جب باوجود انتباہ قلم بند ہوتیں تو اعتقاداً ان کی حیثیت مستقل تسلیم کی گئی اور "مثلاً معہ" سمجھی گئیں۔ بلکہ یہاں تک غلو کیا گیا کہ قرآن پر حکم اور قاضی کے منصب پر فائز ہو گئیں۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ احادیث کیسے آئین و قوانین شریعت ہو سکتی ہیں جب کہ یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ محفوظ کلام نہیں، باللفظ نہیں بالمعنی روایت ہوئی ہیں۔ جبکہ یہ بھی مسلم ہے کہ قانون کا ہر لفظ محفوظ ہونا چاہیے۔ اس لئے ان کو قانونی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ قرآن محفوظ کلام ہے اور اس کی حفاظت کا وعدہ بھی قرآن کی دہلی شہادت پیش کرتی ہے اور تاریخ و واقعہ بھی ہے کہ حفاظت کا اہتمام ممکن ذرائع سے کیا گیا۔ اور ہر ایک زمانہ میں "حفاظ" کی تعداد اکثر رہی ہے اور یہ کہ قلمبند بھی ہوتا رہا۔

تعال

"تعال" یہ ایک شرعی اصطلاح ہے۔ مفہوم وہ عمل ہے جو کسی بانی ملت

سے شوب ہو اور متبعین مسلسل من وعن باتباع بانی ملت کرتے چلے آئیں۔ اگر ایسی صورت ہو تو بلاشبہ یقینی شہادت اس امر کی ہے کہ بانی ملت کا بھی یہی عمل تھا۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ تعال سے کسی عقیدہ کے جو ان کی شہادت اخذ کرنا غلط بحث ہے۔ عقیدہ اور شے ہے اور عمل اور چیز ہے۔ کچھ

شک نہیں کہ اعمال کی تشکیل عقیدہ سے ہی ہوتی ہے لیکن یہ حالت ابتدا ہی میں ہوتی ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا ہے عقیدہ کا شعور بخوبی ہوتا جاتا ہے مگر عمل جاری رہتا ہے یعنی عمل بے بصیرت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر ہم موحیدین اور مشرکین کے اعمال کا موازنہ کریں تو چنداں فرق محسوس نہ ہوگا۔ وہی دعائیں اور پراگھنا وہی رکوع و سجود اور ٹھنڈوت وہی طواف اور پروکھنا اور علی ہذا القیاس۔ لیکن عقیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر یہ تعال سے ثابت ہو جائے کہ خلف سلف کے نقش قدم پر مسلسل ایک ہی روش پر چلتے آئے اور چل رہے ہیں۔ تو یہ وقیح دلیل اس امر کی ضروری ہے

اسلاف کا بھی یہی عمل تھا۔ لیکن یہ کوئی دقیقہ دلیل نہیں کہ اسلاف کا بھی یہی عقیدہ تھا
خلاف کا ہے۔

اہل حدیث یا روایت پر جب اہل علم و حکمت نے اعتراضات کی بوچھاڑ کی
انہوں نے تعامل کی آڑ لی پھر اسے زمانہ کے اہل حدیث نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ
علم حدیث ظنی ہے اور تمام ائمہ حدیث مثلاً ملا علی قاری صاحب "موضوعات کبیر نے
جہاں کہ علم حدیث ظنی ہے۔ احادیث کی صحت اور صداقت ثابت کرنے کے لئے تعامل
بے دلیل پیش کی ہے۔ اگر احادیث کی صداقت تعامل پر اور تعامل کی احادیث پر
محصر ہے تو یہ دلیل ایک دائرہ میں چکر کاٹ رہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ظاہر ہے کہ ہزاروں
سین ایسی ہیں جنہیں احکام شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جن کی تائید و تہدیر بق
آن کی کسی آیت سے نہیں ہوتی۔ کتب فتاویٰ میں یہ احکام موجود ہیں۔ وہاں تعامل
بے دلیل کی حیثیت سے گر جائے گا۔ اور قرآن کی آیات سے مخالف ہو تو خود تعامل کو ہی دلیل
میں بلکہ گمراہ کن عمل ہوگا۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آنحضرتؐ "والذین معہ"

عمل اس زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کے مناسب تھا اور آئندہ زمانہ کے بدلے
دئے اور ترقی یافتہ زمانہ کے نامناسب ہے تو تعامل بحیثیت دلیل نہ صرف دقیق ہی
میں بلکہ مانع ترقی ہے اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ تعامل کا اثر عقاید پر کیا پڑتا ہے
م واضح کر چکے ہیں کہ تعامل عقاید کی صحت پر کوئی دلیل نہیں۔

آنحضرتؐ اور حضرت ابراہیمؑ والذین معہ کا اسوہ حسنہ قرآن میں مفصل مذکور ہے
آن نے لو انبیاء کی اجتہادی غلطیوں کو بھی نمایاں کیا۔

قد كانت لکما سوۃً حسنۃً فی ابراہیم والذین معہ..... الا

حل ابراہیم لا ینبہ لا ستغفرن لک (۲۸)

تحقیق ابراہیم اور ان لوگوں کی زندگی میں تمہارے لئے نیک نمونہ ہے جن کو
ابراہیم کی معیت (صوری و معنوی) حاصل تھی..... مگر اس بات میں نہیں کہ ابراہیم
اپنے باپ (مشرک) کو کہا کہ تیری مغفرت کی دعا کر لوں گا۔

اگر ہم انبیاء کے اسوہ حسنہ کو صدہا سال کے بعد روایات میں یا ان متبعین کے تعامل میں تلاش کریں تو ہم بھی مشرک بن کر رہ جائیں گے جیسا کہ اہل کتاب ہیں۔ تعامل میں خطرہ عظیم یہ ہے کہ اگر کسی نبی سے اجتنابی غلطی ہوئی یہ تقاضائے بشریت ضرور ہوتی تو شخصیت پرست اس کا ابھی اتباع کریں گے کرتے ہیں۔ ایسی باتیں اکثر بیشتر اہل کتاب میں پائی جاتی ہیں جس کی ذمہ داری ان کے اپنے انبیاء پر عاید ہوتی ہے۔

ارشاد قرآن ہے کہ

”وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبي الا اذا تمنى القى الشيطان في مخرجهم“ (۱۱۱)

”مجھ سے پہلے نہ تو کوئی رسول اور نہ کوئی نبی ایسا گزرا کہ اس نے تمنا کی ہو اور شیطان نے اس کی تمنا میں القاء نہ کیا ہو۔“

اس کی واضح مثال یہود و نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ

”نحن ابنا الله و احبوا“ (۱۱۲)

”ہم اللہ کے بیٹے اور پیارے ہیں۔“

اس کی سند تواتر اور انجیل میں موجود ہے لیکن یہ محض انبیاء بنی اسرائیل کی تمنا ہے لیکن اس عقیدہ بالملکہ کا اثر ان کی ذہنیت پر ہوا اور اعمال پر بھی پڑا۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ انیل کے اقوال کا وہ مفہوم نہیں جو بعد میں متبعین شیعہ کیا پھر یہی شخصیت پرستی جو شرک کی حد تک پہنچتی ہے، تعامل ہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں

اگر آیت (۱۱۱) میں تحریف مسنوی نہ کی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء معصومین عن الخطا نہ تھے جو حضرات عصمت انبیاء کے قائل ہیں و معتقد ہیں۔ کچھ کہتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہے۔ تمنا اور امانی امنیت اور اس مشتقات تقریباً سترہ آیات میں استعمال ہوتے ہیں اور باقی صفحہ ۵۵ کے

شوشی پسندیدہ ہے جس پر دانا پلتے آئے اور چل رہے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مفہوم
 ہے کہ اگر اس سے احسن و اھلی معلوم ہو تو اس پر اس لئے نہ چلنا چاہیے کہ متقدمین
 و شوش نہیں اور اگر متقدمین ہی کے نقش قدم پر اس لئے چلا جائے کہ اس سے بہتر روش
 تک معلوم نہیں تو آیات بحوالہ بالا کی رو سے کور کورانہ تقلید سخت مذموم ہے۔ کچھ بصراوت
 سے کام لینا چاہیے۔ اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ تقلید ناگزیر امر ہے۔ لیکن تقلید
 میں تحقیق ہونی چاہیے۔ جسے عرف عام میں تقلید کہتے ہیں وہ کور کورانہ اتباع کسی
 شخصیت کا ہے۔ ورنہ کسی محقق کے نزدیک تقلید سے چارہ نہیں۔

بیدل کہتا ہے کہ

انکاری غیر بات تصدیق میں است و اگر و بدل دلیل توفیق میں است
 تبعیت خلق از حقت غافل کرو ترک تقلید گیر تحقیق میں است
 اصل اصول تحقیق یہی ہے کہ ہم نے حق قبول کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص حق بات کہے
 چاہیے خواہ وہ مدعی نبوت نہ بھی ہو۔ اور مانتے ہوئے ایسے شخص کا واجب احترام
 اخلاقاً واجب ہے۔ لیکن اس کی بشری شخصیت سے وابستگی من دون اللہ یا
 الحقی کیوں کی جائے۔ اور جو ایسا کرتے ہیں تحت الشعور ارادہ کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی

یہ حاشیہ صفحہ ۵۲، ہر ایک مقام پر مذموم معنی ہی ہیں استعمال ہوئے ہیں۔ ملاحظہ

ہوں آیات $\frac{23}{51}$ ، $\frac{33}{23}$ ، $\frac{28}{82}$ ، $\frac{2}{86}$ ، $\frac{62}{4}$ ، $\frac{3}{136}$ ، $\frac{2}{34}$ ، $\frac{42}{6}$ ، $\frac{2}{89}$ ، $\frac{65}{34}$ ، $\frac{22}{51}$

$\frac{34}{13}$ ، $\frac{2}{122}$ ، $\frac{2}{63}$ ، $\frac{2}{105}$ ، $\frac{2}{122}$ ، یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ قانونی

محفوظ ہیں۔ لفظاً اور معناً۔ وہ اختلاف کثیر جو انسانی کلام اور کام میں واجب ہے

قرآن اس سے پاک ہے۔ قرآن میں انبیاء کی غلطیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس

لئے جہاں تک قرآن کا تعلق ہے جو وحیاً نازل ہوا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

لیکن احادیث میں سخت اختلاف ہے۔ تمام فرقوں کی بسا یہی اختلاف

حدیث ہے۔

یہ شخص کہے گا۔ بلا چون و چرا تسلیم کر لیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یا یہی شخص جس نے ایک حق بات کہہ کر ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا کوئی نامعقول بات کہے خواہ اس کا دعویٰ نبوت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لائق ہے کہ روکی جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے آیات مجی بالائیں واضح کیا گیا ہے۔

اہل تقلید عموماً خضر و موسیٰ کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ کربلا کے دستور کے موافق امرا و وزراء کے گڑ کے صوبہ جات کے حکام کے پاس بغرض ترمیم بھیجے جاتے اور حضرت موسیٰ بھی مجمع البحرین کے حاکم کے پاس اسی غرض سے آئے مجمع البحرین وہ علاقہ ہے جو بحر نیل کی انتہائی شرقی شاخ کے ساتھ ساتھ بحیرہ شام (روم) تک چلا گیا ہے۔ اور جہاں نیل کی یہ شاخ بحیرہ شام سے ملتی ہے۔ لیکن اس واقعہ کو تقلید سے دور کا واسطہ ہیں۔ حاکم مجمع البحرین نے تربیت اس شرط پر منظور کی تھی کہ نوجوان موسیٰ اس کے کاموں کو دیکھے اور دیکھ کر خاموش رہے۔ آپ عجلت پسند تھے بات بات پر بھڑک اٹھتے جو ناگوار طبع ہوتی۔ اسی کی اصلاح حکم کرنا چاہتا تھا۔ کجا کو اہم معاملات میں جلدی سے کام نہ لینا چاہیے۔ بسا اوقات پچھتا نا پڑتا ہے اور بعض اوقات ایسی غلطی سرزد ہوتی ہے کہ تلافی نہیں ہو سکتی۔ حضرت موسیٰ کا اعتراض بجا تھا اور اس کی نفی معلم نے نہیں کی۔ اس نے اپنے فعل کے معقول و جہہ بیان تو آپ کی بھی تسلی ہو گئی۔ بصیرت کا تقاضا ہے کہ شاگرد معلم کے ارشادات پر جو بھی شبہ بیان کرے اور اگر معلم معقول توجیہ نہ کرے تو قابل تسلیم ارشاد نہ ہوگا۔ ایمان و عمل و علم و یقین وغیر ہم ایسے موضوع ہیں جن پر بہت کچھ بحث ہو چکی اور مسلمانوں میں بلحاظ عقائد و بارہ ایمان وغیرہ بہت مذہب یا فرقے پیدا ہوئے مقام پر مفصل بحث کی جائے گی۔ سر دست زیر بحث "تقابل" ہے۔ یہ ناقابل حقیقت ہے کہ کائنات پر برآن تغیرات واقع ہوتے رہے۔ ارض و سموات موجود ہیں اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کتنے تغیرات بعد و نا ہوئے۔

تغیرات آفرینش سے جاری ہیں اور جاری رہیں گے۔ خواہ ہمیں

تغییرات کی لطافت کی وجہ سے شعور نہ ہو اور شعور اسی وقت ہوتا ہے جب فرق میر
 محسوس ہوتا ہے۔ طفل شیر خوار ہی ہے جو جوان اور بوڑھا ہوتا ہے مگر روزانہ تغیر کا
 احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ ارض و سموات، غیر الارض والسموات اسی قانون
 تغیرات کے تحت کسی دن محسوس ہوں گے۔ لیکن کائنات پر تغیرات کی حکمت ارتقا
 ہے جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اس لئے ارشاد قرآن ہے کہ

”بل قالوا انما وجدنا اباہنا علی امة وانا علی اثارہم تبعدون ہ وکذالک
 ما ارسلنا من قبلك فی قریة من نذیر الا قال مترفوما انما وجدنا اباہنا علی
 امة وانا علی اثارہم مقتدون ہ قل اولو جنتکم باعدای ما وجدتم علیہ
 اباہکم قالوا انما بما ارسلتم بہ کفرون ہ فانتقمنا منہم فانظر کیف
 کان عاقبة الکذبین ہ واذا قال ابراہیم لابہ وقومہ اتنی بدراثر قسا
 تعبدون۔ (۲۵)“

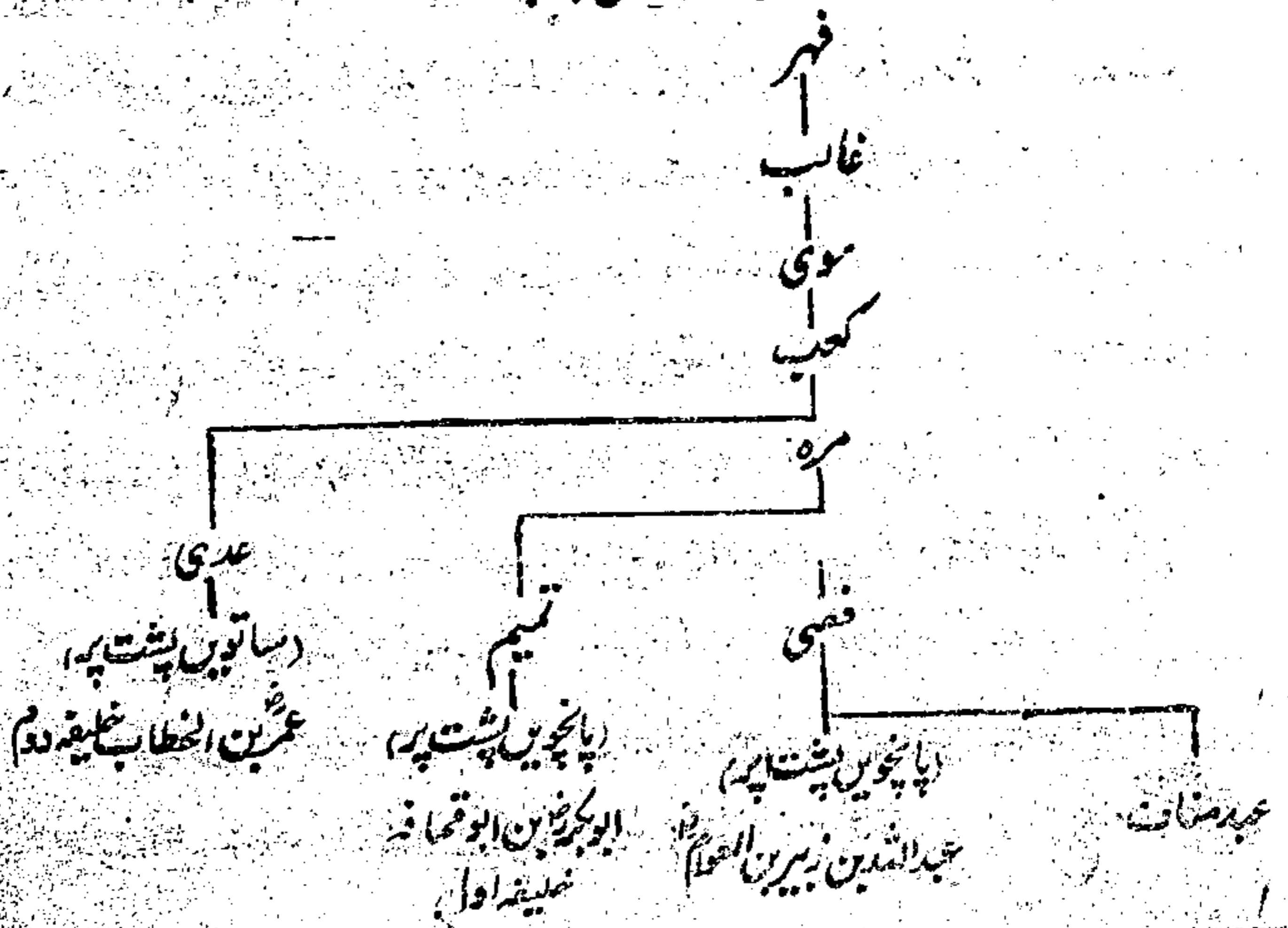
”بلکہ کہا تو یہ کہا ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو اجتماعی زندگی میں ایک روش پر
 چلتے پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلنا باہت سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے کسی
 بستی کی طرف کوئی رسول عذاب الوری سے ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے سر پر
 آور وہ مکیوں نے یہ کہہ کر ہو کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر بل کر چلتے پایا اور
 ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ رسول نے کہا کہ اگر میں تم کو اس سے بہتر روش
 بتاؤں۔ جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا تو یہ تقاضا عقل ہے کہ تسلیم کرو کہنے لگے
 رہا جا آیا ہے وہ بڑا ابن کر، ہمارے بڑوں کو یہ تو فتنہ بنا تا ہے ہم اس پیغام کے جو
 تو ہمارے پاس لیا ہے منکر ہیں۔ تو ہم نے ان کی اکر کا انتقام لیا۔ تو دیکھ ان جہلم نے
 والوں کا انجام کیسا بُرا ہوا۔ اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم کو کہا کہ میں ان سے
 بیزار ہوں جن کی پوجا تم کرتے ہو۔“

یہی بات سمجھنے کی ہے جو ان آیات بارکہ میں واضح کی گئی ہے کہ پہلی امتوں
 کا عبرت انگیز انجام پرانی لکیر پیٹے کی وجہ سے ہوا جس میں شخصیت پرستی کا جذبہ بھی

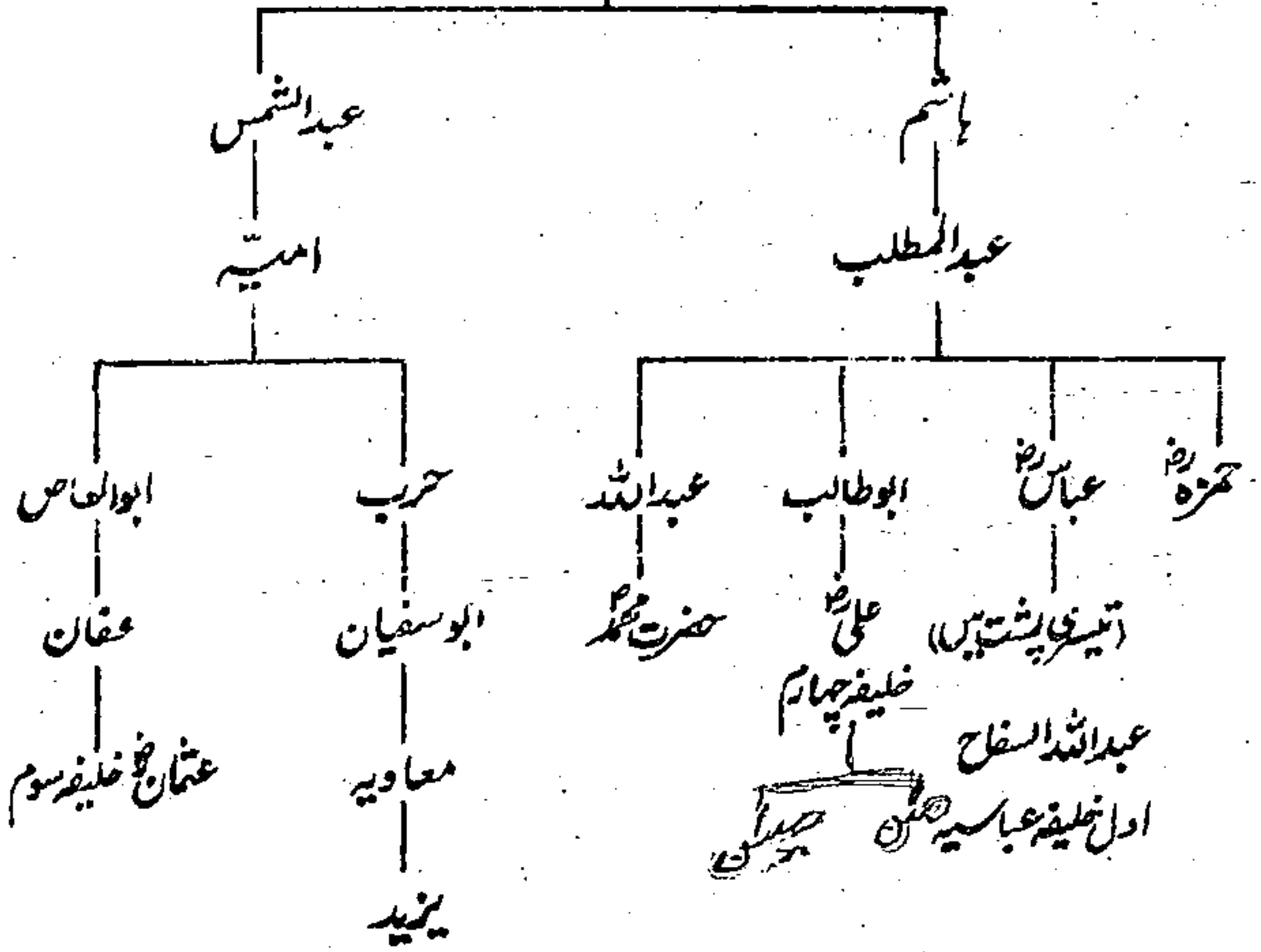
کار فرماتا تھا۔ اسے تعامل کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تعامل کے دلدادہ ترقی کی ہر گات سے نہ صرف محروم رہتے ہیں بلکہ ویر سوپرمنٹ جاتے ہیں۔ کسی امر پر "اجماع" کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ غلطی سے معصوم ہے۔ ہر ایک نبی اور رسول "اجماع" کے خلاف ہی کھڑا رہا۔

سیاسیات (6) اسباب تفرقہ میں "سیاسیات" کا کم حصہ نہیں بلکہ یہ کہنا کچھ بھی نہیں کہ اولین سبب ہی سیاسیات ہی تھیں۔ اور خلافت راشدہ ہی میں سرگرم عمل تھیں۔ خلافت اول و دوم تو بخیر و خوبی ختم ہوئیں۔ تیسری خلافت کے دور میں ایک فریق پیدا ہو گیا جو بعد میں "شیعان علی" کے نام سے موسوم ہوا۔ اور اسی فرقہ سے ایک فرقہ پیدا ہوا جو خوارج "کلمات ہے۔ دونوں ابتداء میں حضرت علیؓ غلیفہ چہارم کے سرگرم حامی تھے۔ مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔

قبائل قریش میں بنو امیہ اور بنو ہاشم میں قرابت قریبہ ہے۔ لیکن یہ ایک دوسرے کا حریف قبیلہ بھی تھا۔ بنو امیہ کا اقتدار شروع سے ارض حجاز بالخصوص مکہ میں زیادہ تھا۔ آنحضرتؐ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا ہم عصر ابو سفیان اموی تھا۔ ذیل کے شجرہ نسب سے ان کا خاندانی رشتہ واضح ہو جائے گا۔



عبدمنان



حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت عقیلؓ دو شخصیتیں تھیں۔ اور ان میں سے ایک کو شوریٰ نے منتخب کرنا تھا۔ انتخاب حضرت عثمانؓ کا ہوا تو حریف خاندان بنو ہاشم کو ناگوار گزلا۔ ابتدائی چند سال تو خیریت سے گزر گئے۔ بنو ہاشم کے لئے بظاہر کوئی وجہ ایسی نہ تھی یا نہ ملی جس کی بنا پر عوام کو بھڑکایا جائے مگر یمن اور مصر اور عراق میں جو دار الخلافت سے دوستی تھے۔ خلافت کے خلاف اور حضرت علیؓ کے حق میں تحریک جاری تھی۔ شمالی افریقہ میں فتوحات کا سلسلہ خلافت سوم میں جاری تھا۔ اس لئے عوام کی توجہ زیادہ تر اسی طرف مبذول تھی۔ دمشق میں امیر معاویہ خلافت اول سے مسلسل عامل تھا۔ اور حضرت عثمانؓ سے قرابت قریبہ بھی تھی۔ یمن میں ایک شخص عبداللہ بن سبا تھا۔ حضرت عثمان کے عہد میں مدینہ میں آیا۔ اصل میں یہودی تھا۔ دنیا اسلام کے طول و عرض میں سفر کر چکا تھا۔ اسلام قبول کیا تو تو قعات کے خلاف کسی نے سر پر نہ اٹھایا۔ آخر مصر میں رہائش اختیار کی اور

اس سازش میں شامل ہو گیا جو خلافت عثمانیہ کے خلاف اور حضرت علیؑ کے حق میں
 بوجہ ہو رہی تھی۔ اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ "ابوبکر و عمر و عثمان غاصب ہیں۔ حق خلافت
 علیؑ کا ہے۔ سازش کا جال کوفہ، بصرہ اور مصر میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ابن سبا کی
 سرغٹوں سے خفیہ خط و کتابت تھی، مدینہ میں مقتدر صحابہ میں سے بہت تھوڑے
 موجود تھے۔ مصر اور شام اور عراق اور ایران میں تمدن کی مسرتوں سے جب عرب
 ذلیقہ شناس اور دیوبی جاہ و حشمت سے واقف ہوئے تو انہی ممالک میں ہاتھ
 اختیار کر لی۔ حضرت عثمانؓ نے اس کے خلاف کئے۔ اور ارضیات کی کاشت وغیرہ
 سے منع کر کے۔ شہرت ترقی کے بعد میں خالص دو لاکھ قریشی عرب سپاہی تھے
 اب مصر اور شام اور عراق میں آباد ہو چکے تھے۔ اور محکوم اقوام پر اپنی فضیلت
 کا مظاہرہ بھی کرتے۔ محکوم اقوام ان سے تنگ آچکی تھیں اور تمام نرزمہ داری خلافت
 عثمانیہ پر ڈال رہی تھیں۔ اس لئے اس سازش کو انہوں نے زیادہ تقویت دی
 آخر وہ مقررہ دن بھی آ گیا۔ جب مالک ابن حارث النخعی کوفہ سے دو سو آدمیوں
 کے ساتھ اور حاکم بن جیلہ العبیدی بصرہ سے ایک سو کے ساتھ اور عبدالرحمان ابن عدیس
 البلوئی چھ سو مصریوں کے ساتھ مدینہ میں جمع ہوئے۔ یہ واقعہ ۳۵ھ کا ہے۔ یہ سب
 مسلح تھے۔ مدینہ کے قریب "ذوالنخب" میں ان لوگوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے
 تھے۔ اس سے پیشتر خود حضرت علیؑ بھی خلیفہ کو متنبہ کر چکے تھے کہ
 "ملک کے طول و عرض میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے جو کچھ ان وفد کے
 مطالبات ہیں ان سب کو روانہ غور کرنا چاہیے۔"

ان میں ایک مطالبہ یہ تھا کہ خلیفہ خلافت سے دستبردار ہو جائے۔ حضرت عثمان
 نے حضرت علیؑ کو ان لوگوں کے پاس بھیجا کہ سمجھا کر راہ راست پر لائیں۔
 بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ نے ان کو ٹھنڈا کر دیا مگر عین اس وقت ایک
 شہزادہ ان کے سامنے سے گزرا۔ ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور دریافت کیا کہ
 کہاں جاتا ہے اور اس کے پاس کیا ہے۔ جامہ تلاشی کے بعد ایک خط لکھا آیا یہ

خط ابن ابی سرح عامل مصر کے نام تھا۔ اس میں ان شوریدہ سروں کی نسبت نام بنام لکھا ہوا تھا کہ فلاں فلاں کا سر قلم کر دو۔ فلاں فلاں کے ہاتھ پاؤں کاٹو اور فلاں فلاں کو قید بند میں رکھو جب یہ مصر کی طرف لوٹیں۔

یہ خط جمع عام میں پڑھا گیا، سب بھڑک اٹھے اور خلیفہ کے مکان کو محاصرہ میں لے لیا۔ جب خلیفہ کو یہ خط دکھایا گیا تو آپ نے کہا کہ یہ خط میرا لکھا ہوا نہیں۔ باغیوں نے کہا کہ مروان آپ کے سیکرٹری کا لکھا ہوا ہے، اسے ہمارے حوالہ کر دو۔

خلیفہ نے کہا کہ تحقیق باضابطہ ہونی چاہیے۔ معقول باتیں عوام جب مشتعل ہوں نہیں سنتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مروان خلیفہ کے گھر سے یہی تھا۔ مگر خلیفہ تو شہید ہوا مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ باغیوں نے خلیفہ کے مکان کو چاروں طرف گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ حضرت علیؑ نے اپنے دونوں لڑکوں حسن و حسین کو حفاظت کیلئے بھیج دیا تھا۔ جو دروازہ پر متعین تھے یہ کہ باغی دیوار پھانڈ کر اندر داخل ہوئے اور خلیفہ کو جب کہ وہ قرآن تلاوت فرما رہے تھے شہید کر دیا۔ اثنائے محاصرہ میں پانی ختم ہو چکا۔ تو خلیفہ نے جھروکے سے پانی کی درخواست کی تو حضرت علیؑ نے دو مشکیزے بھجوائے مگر اس سے پیشتر باغی آپ خنجر پلپلچکے تھے۔ اب حضرت علیؑ اور دو چار مقتدر صحابی بھی آگئے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے خانہ نشین کیوں رہے؟

بات یہ ہے کہ یہ تمام قصہ ہی سیاسیات کی اختراع ہے۔ بلاشبہ عراق اور مصر سے مسلح و فوج سینکڑوں کی تعدادیں آئے۔ ان کی مزاحمت کرنے والا کون تھا۔ جب کہ سب کچھ ایک منصوبہ کے تحت ہو رہا تھا۔ علاوہ انہیں یہ فوج تھے اور کچھ معروضات کے لئے ہی حاضر ہوئے تھے۔ خلیفہ وقت بروز روشن دار الخلافت اور اپنے ہی مکان میں مارا گیا۔ یہ واقعہ ہے۔ باقی افسانہ۔

یہ کام نہایت ہوشیاری، نہایت خاموشی سے کیا گیا۔ باغی اپنا کام کر چکے تو حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ خلیفہ کی شہادت کی خبر جب عرب اور شام اور مصر میں شائع ہوئی تو ایک آگ تھی جو بھڑک اٹھی اور تمام عرب بالخصوص

قبائل قریش میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ یہ سازش غیر عرب مصریوں اور عراقیوں اور ایرانیوں کی دماغی کاوش کا نتیجہ تھی۔ جو عربی حکومت کا جو اپنی گردنوں سے اتار کر اپنی پہلی شان و عظمت بحال کرنا چاہتے تھے۔ بنو ہاشم ان کا آلہ کار بن کر رہ گئے۔ اب حضرت علیؑ کو بھی معلوم ہوا کہ مدینہ میں نہیں رہ سکتے۔ اس لئے دار الحکومت کوفہ میں منتقل کر لیا۔ کوفہ ارض حجاز سے اتنا ہی دور تر ہے جتنا ایران سے نزدیک تر۔ اور یہی خفیہ سازش کا مرکز بھی تھا۔ اور ہمیشہ بعد میں بھی رہا۔ بنو ہاشم عرب کا اعتماد کھو بیٹھے تھے۔ ان کے ہوا خولہ زیادہ تر نو مسلم مجوسی وغیرہ تھے۔ بنو ہاشم کو عرب پر بھی اعتماد نہ رہا۔ عرب سے وہ اتنے ہی دور تر ایرانیوں سے نزدیک تر ہو گئے۔ جیسا کہ کوفہ مدینہ سے دور تر اور مدینہ سے نزدیک تر تھا۔ عربی خلافت یا اقتدار شہادتِ عثمانؓ کے بعد خاک میں مل جانا۔ مگر ایرانیوں میں روح جہاد کا فرمانہ تھا۔ دلیر دل نہ تھا۔ مفکر و مایع ضرورتاً جو سیاسی پیشہ دوانی سے وہ کام نکالنا چاہتا تھا جو تلوار کے زور سے دل و گردنہ والی قویں نکالا کرتی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ آخر کامیاب ہو گئے۔ اور عربی حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ لیکن سردست اتنا ہی کر سکے کہ دو مقتدر عربی قبیلوں میں پھوٹ ڈال دی۔ اور ایک کے ہوا خواہ بنے اور اسے اپنا بنا لیا۔

دو عمل شروع ہوا تو عرب بنو امیہ کے گرد جمع ہو گئے۔ اصل میں یہ سیاسی جنگ اب حاکم و محکوم اور غالب و مغلوب کے درمیان تھی۔ جو ایک صدی تک جاری رہی۔ یہاں تک بنو امیہ کی حکومت کے خاتمہ پر خلافت عباسیہ قائم ہو گئی۔ یہ عربی خلافت نہ تھی۔ ایرانیوں اور ترکوں کی سلطنت تھی جس پر برائے نام ایک عربی خلیفہ کی وہی حیثیت تھی جو کسی خاندان کے پر کی ہوتی ہے۔ غیر عرب خلافت کے یہی سر پرست تھے۔ مگر سلطنت کی سداور خرقہ سلطنت خلفاء عباسیہ ہی میں صدیوں تک عطا فرماتے رہے۔ تمام خلفاء عباسیہ عجمی لوٹڈیوں کے بطن سے تھے۔ عرب ملازم کی موجودگی حریم خلافت میں قطعاً ممنوع تھی۔ خلیفہ منصور جو دراصل اول خلیفہ عباسی ہے جس نے بغداد کی تعمیر شروع کی جب اس کو معلوم ہوا کہ فلاں ملازم خالص عرب ہے تو بلا کر کہا کہ میں تمہارے

حسن خدمت سے بہت خوش ہوں۔ لیکن کوئی عرب میری حریمِ خلافت کی چار دیواری میں نہیں رہ سکتا۔

تمام مورخین طبری اور ابن اثیر وغیرہ نے ایسے واقعات بہت لکھے ہیں چونکہ ہم نے اپنی کتاب خلافت اسلامیہ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے اس لئے جہاں تک ہمارے موضوع زیر بحث کا تعلق ہے۔ اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ بساطِ سیاست پر دو کھلاڑی عرب اور عجم یعنی غیر عرب بالخصوص ایرانی تھے۔ عرب کے مہرے بنی امیہ اور عجمیوں کے بنو ہاشم تھے۔ عرب کے مہروں میں وزیر نہ تھا۔ عجمیوں کے مہروں میں وزیر کا اضافہ ہوا۔ تو عرب مات کھا گیا۔ وزارتِ امم آریہ میں ہمیشہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ لیکن اسلام میں مذہبی حکومت (PRIESTHOOD) نہیں۔ عباسیوں نے اس عجمی رسم کو زندہ کیا تو وزارت پر ہمیشہ عجمی ہی متمکن رہے۔ جن کے دلوں میں زندہ اوستا بچا ہوا تھا۔ "ژندیق" یا "زندیق" انہی کے دورِ وزارت میں ابھرے۔

انگریز مورخین نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اموی خلافت بنی خلف بنی تھی اور اس کا نصب العین اشاعتِ اسلام اور عربی زبان کی ترویج ہی رہا۔ جب ان کا تختہ الٹ گیا تو دونوں باتیں نہ رہیں۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ فرقہ بندی کے اسباب میں سے جہاں تک آزادی رائے کا تعلق ہے۔ محض اختلاف رائے پر کبھی خون خرابہ کی فوجیت نہیں آتی۔ لیکن جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے۔ باہمی جنگ، وجدل کا بازار خوب گرم رہا۔ چنانچہ جیسا کہ ہم بیان کر رہے ہیں۔ یہ سیاسی اختلاف رائے تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت واقع ہوئی اور حضرت علیؓ کا بھی نہ بچ سکے۔ سیاسیات سے الٹا ہو کر محض تفقہ فی الدین یا فکری اختلاف رائے پر کسی فریق نے اپنے مخالف فریق کو کفر سے متہم نہیں کیا۔ لیکن جب عجمی عقاید کفریہ کو بھی آگے چل کر جگہ مل گئی تو فتاویٰ کفریہ صادر ہونے لگے۔ لیکن اس پر بھی کسی کا قتل جائز نہیں سمجھا گیا۔ کسی مرتد کا قتل اسی صورت میں جائز تھا۔ جب کہ وہ عملاً حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور قتل و غارت کا مرتکب ہو۔ ہم نے اپنی کتاب "اصول فقہ اسلامی" میں اس موضوع پر کافی بحث کی ہے۔

چونکہ عموماً مرتد ہی بغاوت کے مرتکب ہوتے رہے جیسا کہ خلافت اول میں ہوئے اس لئے فقہانے یا تو بغاوت کے سبب کے لئے یا کسی اور وجہ سے محض اللہ کی سزا قتل ہی تجویز کی۔ یہ صحیح فتویٰ نہیں۔ لا اکراہ فی الدین کا مفہوم یہی ہے کہ بحیری ایمان اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔ دین کے معاملہ میں ہر شخص آزاد ہے جو چاہے روش اختیار کرے لیکن شریعت پر نہ کرے۔ اگر شرکاً مرتکب ہو تو حکومت انتظامیہ کا حق ہے کہ مناسب سزا بھی دے اور سبب بھی کرے۔

(۶) حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ایک سیاسی فرقہ شیعیان علیؓ پیدا ہو گیا۔ یہ ضرور تھا کہ ایک اور فریق بھی موجود ہو جس کا یہ مخالفت تھا۔ ظاہر ہے کہ وہی فریق ہو سکتا ہے جو پہلے ہی موجود تھا اور امت واحدہ تھا۔ اس میں وہ بھی شامل ہو گئے جو حضرت علیؓ کا حق خلافت ان حالات میں تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے دو مقتدر صحابی طلحہؓ اور زبیرؓ بھی تھے۔ جن کو عشرہ مبشرہ میں شامل سمجھا گیا ہے یعنی ان دس اصحاب میں سے تھے جن کے حسن خدمت کے صلہ میں آنحضرتؐ نے ان کو بشارت جنت دی تھی۔ حضرت زبیر بن العوامؓ آنحضرتؐ کی پھوپھی کے لڑکے بھی تھے۔ خون عثمانؓ کے انتقام کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ قسانہ لوہیوں نے حضرت ام المومنین عایشہ صدیقہؓ کی نسبت بھی لکھا ہے آپ بھی طلحہؓ اور زبیرؓ کے ساتھ اس جنگ میں شریک تھیں۔ حالانکہ آپ کا بھائی محمد بن ابی بکر اس سازش کے سرغنوں میں سے تھا جس کا مذکور ہم کر چکے ہیں اور اس کے صلہ میں حضرت علیؓ نے اسے مصر کی حکومت تفویض کی۔ حضرت عائشہؓ کی ہمدردی اگر کچھ ہو سکتی ہے تو حضرت علیؓ سے ہونی چاہیے تھی لیکن جب شیعیان علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو غاصب قرار دیا تو یہ بھی اسی عقیدہ کے لگ بھگ بات تھی کہ حضرت عائشہؓ کی نسبت بھی ایسے ہی واقعات گھڑے جائیں جو حضرت علیؓ کی دشمنی پر محمول ہوں۔

امیر معاویہ اموی تھے اور حضرت عثمانؓ سے قرابت قریبہ بھی تھی۔ خون عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ بھی آپ کی طرف سے شرعی تھا۔ لیکن جب یہ پورا نہ ہوا تو دونوں

فریق صغین میں لاؤ و لشکر کے ساتھ اتر گئے یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں۔ جو دونوں کے درمیان آگئیں اور مملکت اسلام دونوں کے درمیان تقسیم کر دی۔ اور دعوت بھی اس تقسیم میں حضرت علیؑ کی کی۔ کہ امیر معاویہ کے حصہ میں صرف ملک شام آیا۔ کاشا حضرت عمرؓ شوریٰ کی جگہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ جانشینی کا فیصلہ کرتے۔ حضرت عثمانؓ اور

حضرت علیؓ میں بھی حکومت اسی طرح تقسیم ہو سکتی تھی۔ اور ایک کی توجہ مغرب اور دوسرے کی مشرق کی طرف رہتی۔ امیر معاویہ اور حضرت علیؓ عرصہ تک تقسیم خلافت کے بعد امن سے اپنی اپنی جگہ رہے اگر خلافت پہلے ہی تقسیم ہو گئی ہوتی تو نہ خون عثمانؓ کا سوال پیدا ہوتا اور نہ امن میں خلل واقع ہوتا۔ اگر ہم ان روایات کو بھی صحیح تسلیم کر لیں جو شیعیان علیؓ بیان کرتے ہیں تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ وہ احترام شخصیت جو ان کے نزدیک حضرت علیؓ کا ہے اس زمانہ میں کسی دل میں نہ تھا۔ اور اگر یہ صورت ہوتی تو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کو کون خلافت غصب کرنے دیتا اور حضرت علیؓ بھی کیوں خاموش رہتے اگر خلافت کا حق اسی بنا پر ہے جو وہ قائم کرتے ہیں تو یہ بہت عرصہ بعد پیدا کیا گیا اگر ابتدا ہی میں ہوتا تو یہ ایسی بات نہ تھی کہ اس کا علم کسی کو نہ تھا اور یہ ایسی اہم بات تھی کہ اس کا علم اکثریت کو ضرور ہونا چاہیے تھا۔ جب کہ احادیث چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی مذکور ہے اور ایسی ناقابل ذکر باتوں کا جس کو بچے بھی جانتے ہیں۔

جو بھی فرقہ سیاسی اغراض کے ساتھ کھڑا ہوا وہ یا تو خود حکومت کا طالب تھا یا طرز حکومت کو بدلنا چاہتا تھا۔ یہ دو فرقے شیعیان علیؓ اور خوارج پہلی صدی ہجری میں پیدا ہوئے اس کے بعد ان کی شاخیں نئی نئی چھوٹی گئیں۔ اور نئے نئے ٹکڑے نکلنے لگے مفصل حالات مناسب مقام پر لکھے جائیں گے۔

ایسے فرقوں کو مذہبی فرقہ کہنا ہی درست نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قومیت کا مفہوم جیسا کہ دیگر اقوام میں ہے۔ مسلمانوں میں نہیں۔ ان کی قومیت اور ان کا وطن پھوٹنا جو کچھ بھی ہے وہ ان کا دین ہے۔ اس لئے ان میں جو بھی فرقہ پیدا ہوا وہ مذہبی رنگ میں رونما ہوا اور وہ کامیاب بھی نہ ہو سکتا تھا اگر مذہب کے نام پر نہ اٹھتا۔ اس

لا

Marfat.com

لئے وہ تمام سیاسی جماعتیں یا فرقے جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے مذہبی فرقے ہی کہلائے
 حالانکہ ان کی اغراض میں قومی تفوق اور انفرادی دنیوی مفاد وغیرہ ہی کچھ تھا جو دیگر
 اقوام کی سیاسیات میں پایا جاتا ہے۔ ان کو مجبوراً اپنے مذہبی عقاید اور اپنی سیاسی اغراض
 میں مناسبت اور مطابقت پیدا کرنی پڑی۔ شیعیان علیؑ اور خوارج کے عقاید میں اتنا
 ہی فرق ہے جتنا ان کے سیاسی نظریوں میں ہے۔ شیعیان علیؑ خلافت جس نے بعد
 ازاں "امامت" کی صورت اختیار کی اولاد علیؑ میں شخصی حق تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے
 خلافت خوارج نسبتاً نہیں و صفائی خلافت سمجھتے ہیں۔ اگر خلافت دنیوی حکومت اور
 امامت دینی حکومت تصور کی جائے۔ اور بظاہر ان میں بھی کچھ امتیاز ہے تو شیعیان
 علیؑ اعتقاداً اولاد علیؑ کو دنیوی حکومت کا حق نہیں دیتے۔ بلکہ اس عقیدہ کی تائید میں
 امام جعفر صادقؑ کا ایک قول بھی بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "دنیوی حکومت
 ہمارے لئے نہیں ہے۔"

ایران کی تاریخ میں حکمران خاندانوں میں سے شاید ایک صفوی خاندان ہی ایسا
 گزرا ہے جس کو سید کہتے ہیں۔ لیکن مورخین کے نزدیک ہر ایک شخص یا خاندان جو سید
 کہلایا ضرور نہیں کہ اولاد علیؑ ہی ہو۔ عرب میں تو یہ اصطلاح اس معنی میں ابتدائی پانچ
 صدیوں میں کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ مفصل بحث فرقہ اسماعیلیہ کے تحت کی جائے گی۔
 شیعیان علیؑ عرب بھی تھے اور زیادہ تر بٹھی بھی ہیں۔ خوارج خالص عرب تھے۔ یہ
 صحیح ہے کہ ہر ایک قوم کو خواہ عربی ہو یا عجمی جمہوریت کے لحاظ سے یہ حق حاصل ہے
 کہ آزاد ہو۔ لیکن یہ حق قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر اعتقاداً یہ تسلیم کیا جائے کہ حق حکومت
 صرف عرب کو حاصل ہے اور اس میں یہ خصوصیت پیدا کی جائے کہ خلافت کا حق صرف
 قریش کو ہے جبکہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے یا قریش میں صرف اولاد علیؑ کا
 ہے جیسا کہ شیعیان علیؑ کا ہے۔ تو یہ صرف سیاسی نظریے ہیں۔ انہیں عملاً تقویت دینے
 کے لئے آیات قرآن اور احادیث کی ضرورت تھی۔ آیات سے تائید نہ ہوتی تو احادیث
 گھڑی گئیں۔ پھر انہی احادیث کا مفہوم کھینچ کر آیات میں بھی پیدا کیا گیا۔ غرض سیاسی

نظریوں نے بھی مذہبی صورت اختیار کر لی۔ ان نظریوں کی تشریح ہم ان فرقوں کے عقاید میں کریں گے۔

فلسفہ | فلسفہ سے مراد اُتر عقلیات ہیں تو کوئی متمدن قوم اس سے خالی نہیں تھی لیکن یونان نے اسے مدون کیا اور افلاطون اور ارسطو نے اسے جس علمی رنگ میں پیش کیا۔ مسلمان جب اس سے واقف ہوئے تو اہل علم و حکمت خود بخود اس طرف کھچے آئے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا صرف دین تھا۔ اس لئے جو اشخاص فلسفہ یونان سے واقف ہوئے انہوں نے دین کے ترازو میں اس کو تولیہ بتلائی دوسویوں میں مسلمانوں کی زندگی عملی تھی۔ دماغی تعیش کی طرف توجہ اس لئے نہ تھی کہ فرصت نہ تھی۔ لیکن فتوحات کے دوران میں جن عجیب اقوام سے سابقہ پڑا۔ ان کے مذاہب اور رسم و رواج سے واقفیت بھی ہوئی۔ ایران کے مذاہب میں کوئی کشش محسوس نہ کی۔ لیکن شام میں اہل کتاب نصاریٰ زیادہ تر یونانی تھے اور حکومت بھی یونانی تھی۔ اگرچہ رومی کہلاتی تھی۔ اہل کتاب سے مسلمانوں کو خاص نسبت بھی تھی۔ مسیحیت جیسی کہ یونان میں شائع تھی۔ حضرت مسیح اور آپ کے حواریوں کا مذہب نہ تھا۔ پولوس رسول کی اختراع تھی (PAULINE CHRISTIANITY)۔ اس مسیحیت کو پولوس نے یونانیوں کے عقائد یا ذہنیت میں ڈھالا تاکہ یونانیوں میں قابل قبول ہو۔ جب مسیحیت یونانیوں کا راج و صرم ہو گیا۔ تو یونانی فلسفہ نے تشکیث اور دیگر پولوسی عقائد موضوعہ کی تائید میں اپنی قوت صرف کر دی، اگرچہ قرآن میں ان عقائد باطلہ کی پرزور تردید کی گئی۔ مگر مسلمان عرصہ تک اسے اصل مسیحیت سمجھتے رہے جو راسخ الوقت تھی۔ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ مسیح کی پیدائش اور وفات اعجازی ہے۔ بغیر باپ پیدا ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ محض زندہ رہنا اور پوشیدہ رہنا تو ان کے لئے کچھ مفید نہ تھا۔ اس لئے آبدثانی کی صورت بھی محسوس ہوئی اور مقدس منی وغیرہ کی انجیل میں ایسے فقرات بھی مل گئے جو اس عقیدہ کی تائید میں ہیں۔ حالانکہ مسیح اپنی آبدثانی اپنے زمانہ کے لوگوں کی مود خودگی میں بطور

پیش گوئی بیان کرتے ہیں۔ اور جب قبر میں ان کو مردہ سمجھ کر رکھا گیا اور تیسرے روز قبر خالی پائی گئی اور آپ حواریوں سے ملے اور ان کو یقین دلایا کہ وہ روح کو نہیں آپ کے خاکی جسم کو دیکھ رہے ہیں اور اپنی پسلی کا زخم بھی دکھایا جو رومی سیاہی کے بھالے سے لگتا تھا۔ تو آپ کی آمد ثانی پر ایمان لائے۔ اور یقین کیا کہ صلیب پر آپ فوت نہیں ہوئے تھے یہی واقعہ انجیل مقدس یوحنا اور قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔

انجیل کی عبارت حسب ذیل ہے

”مگر ان بارہ حواریوں میں سے ایک تو ما جسے تو ام کہتے اس وقت ان کے ساتھ نہ تھا جب یسوع ان سے ملا۔ پس باقی شاگرد اس سے کہنے لگے ہم نے ربی کو دیکھا ہے مگر اس نے ان سے کہا کہ جب تک میں اس کے ہاتھوں میں میخوں کے سوراخ نہ دیکھ لوں اور میخوں کے سوراخ میں اپنی انگلی نہ ڈال لوں اور اپنا ہاتھ اس کی پسلی میں نہ ڈال لوں ہرگز یقین نہ کروں گا۔“

(مقدس یوحنا ۲۰/۲۷)

آٹھ روز بعد سب حواری جمع تھے اور تو ما بھی موجود تھا۔ تو مسیح آگے۔ حواریوں نے تو ما سے کہا کہ دیکھ لے۔ مسیح نے تو ما سے کہا کہ میرے زخموں کو اچھی طرح دیکھ لے اور اپنی انگلی ڈال کر تسلی کر لے، بے ایمان نہ ہو ایمان لا۔“

تو ما چلایا۔ ربی، ربی، میں ایمان لایا۔ یسوع نے اسے کہا کہ ”تو تو مجھے دیکھ کر ایمان لایا ہے۔ مبارک ہے وہ قوم جو بن دیکھے ایمان لاتے گی۔“ (کہ میں صلیب پر فوت نہیں ہوا) یعنی اہل اسلام

قرآن میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ

”وما قتلوه یقیناً... وان من اهل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ، ویوم الیقینہ یكون علیہم شہیداہ (۲)“

”اور یقیناً مسیح کو انہوں نے نہیں مارا... اور اہل کتاب (انجیل) سے کوئی ایسا نہیں مگر یہ کہ بالضرور ایمان (اس امر پر کہ مسیح مصلوب و مقتول نہیں ہوا) لائے

اس کی (طبعی) موت سے پیشتر اور قیامت کے دن تو وہ ان پر گواہ ہوگا۔
 ”من اهل الکتاب“ سے مراد اس آیت میں ”توما“ اور اسی قبیل کے لوگ ہیں
 جو پہلے ایمان اس امر پر نہ لائے مگر جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ایمان لائے۔

مسلمانوں نے آیات قرآن کو بھی نصاریٰ کے عقائد کی روشنی میں دیکھا۔

اس لئے کہ الوانعزم رسول اور نبی کے بارہ میں جو معجزہ بھی بیان کیا جائے مان لینا
 چاہئے۔ آیات محولہ بالا کی نسبت یہ سمجھے کہ مسیح دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے
 اور جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے یہود کو ان کے کفر کی سزا دیں گے۔ اس وقت اہل
 کتاب (یہود) ایمان لے آئیں گے اور نصاریٰ تثلیث ترک کر دیں گے۔ حالانکہ آیات
 کا سیاق سباق واضح کر رہا ہے کہ واقعہ صلیب زیر بحث ہے۔ حواریوں نے دور سے
 یہ نظارہ دیکھا اور اس وقت سب حواری بھی موجود نہ تھے۔

”مقتول اس شخص کو کہتے ہیں جو بذریعہ قتل مارا جائے اور مصلوب وہ ہے جو
 صلیب پر مارا جائے۔ اور یہ تو نصاریٰ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یسوع کی ہڈیاں صلیب
 سے اتار کر توڑی نہیں گئیں۔ اور ایک بادو چوروں کی ہڈیاں اس لئے توڑی گئیں کہ ابھی
 زندہ تھے۔ اور یسوع کی نسبت یہ خیال رومی سپاہیوں کو ہوا کہ صلیب پر ہی دو تین
 گھنٹوں میں مر گیا۔ اس لئے آپ قتل نہیں کئے گئے۔ حواریوں نے یہ سمجھا کہ جب آپ
 صلیب پر آویزاں کئے گئے تو ضرور مر گئے۔ یہ غلط فہمی اس وقت رفع ہوئی جب ان
 سے ملے۔

مسلمانوں نے یہ کہہ کر بحث ختم کر دی کہ انجیل محرف ہے۔ صحیح یہی ہے کہ مسیحؑ
 کی جگہ کوئی اور (ناکردہ گناہ) شخص صلیب دیا گیا۔ جو شکل و صورت میں ملتا جلتا تھا اور
 جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے آپ آسمان کی طرف اٹھائے گئے اور آخری زمانہ میں
 پھر نازل ہوں گے

اس حد تک تو مسلمانوں کا عیسائیوں سے مذہبی عقائد میں اتفاق اور اختلاف
 رہا۔ لیکن جب یونانی فیلسوفوں افلاطون اور ارسطو وغیرہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں

تو پھر سے اپنے عقائد کا جائزہ لیا کہ کس حد تک مطابق یا مخالف ہے۔ بعض تو اتنے مرعوب ہوئے کہ فلسفہ یونان کو جیسا کہ فلاطون و ارسطو نے پیش کیا تھا، ایک حقیقت سمجھنے لگے۔ فارابی اور بوعلی سینا اور ابن رشد جیسے بلند پایہ حکماء بھی مسلمات اولیٰ (FIRST PRINCIPLES) سمجھتے رہے۔ غالباً پہلا فرقہ جو یونانی فلسفہ سے متاثر ہوا "معززہ" ہے۔ اب علمائے اسلام کی توجہ بھی اس طرف ہوئی انہوں نے یہ سمجھا کہ فلسفہ نے مسلمانوں کے عقائد دربارہ ذات و صفات الہیہ اور حیات بعد ممات و جنت و جہنم متزلزل کر دیے ہیں۔ اس لئے انہوں نے بھی مذاقت کے لئے

اسی ہتھیاروں سے کام لیا جس کو فلسفی استعمال کر رہے تھے۔ یعنی استدلال عقلی "متکلم" کہلائے۔ اس طرح علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی۔ بعض مسلمان علماء ایسے بھی تھے جو سرے سے فلسفہ کو کفر سمجھتے اور مسلمانوں کو اس سے باز رکھتے۔

امام محمد غزالی اور امام رازمی نے علم کلام کو خروج پر پہنچا دیا۔ امام غزالی نے اپنی کتاب "احیاء العلوم الدین" میں فلسفہ کا رد و شرح و بسط سے کیا ہے۔ آپ کی کتاب "تہافت الفلاسفہ" میں آپ کا ایک خطبہ ہے جو اسی موضوع پر دیا۔ اس میں آپ مسائل فلسفہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جو اسلام کے موافق ہیں۔ دوسرے وہ جو اصول اسلام کے مخالف نہیں۔ تیسرے وہ جو اسلام کے عقائد کے مخالفت ہیں۔ اس میں عالم کا قدم و حدود اور حشر اجساد وغیرہ داخل ہیں۔ زیر بحث یہی تیسری قسم ہے، امام صاحب جہاں تک اس مادی دنیا کے محسوسات کا تعلق ہے بحث خوب کرتے ہیں۔ اور ہر ایک شخص بسہولت سمجھ سکتا ہے لیکن جب مابعد الطبیعیات پر بحث کرتے ہیں تو تصوف کی آرٹ لیتے ہیں۔ تصوف ابتداء اسلام میں عملی زندگی تزکیہ نفس و تصفیہ قلب اور اخلاق حسنة تک محدود تھی۔ اب امام صاحب اور دیگر متکلمین، شیخ اکبر محمدی الدین ابن عربی اور مولوی جلال الدین رومی صاحب مثنوی معنوی وغیرہم کے ہاتھوں میں فلسفہ کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ مسلمات میں سے ہے کہ حقائق کا اظہار انسان پر تحقیقاً مشاہدہ اور تجربہ سے

ہوتا ہے اور تقلیداً خیر صحیح سے اور دونوں میں استدلال عقلیہ ہی کار فرما ہے۔ جب امام صاحب یہ کہتے ہیں کہ حشر و نشر وغیرہ ایک حقیقت ہے تو اس کی شہادت میں صوفیہ کرام کا مشاہدہ پیش کرتے ہیں یا انبیاء کا۔ تو اس کی حیثیت خیر صحیح کی رہ جاتی ہے۔

اس پر یقین کیا جاسکتا ہے مگر یہ "علم" نہیں جو صرف شاہد کو حاصل ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں مکہ معظمہ گیا اور وہاں یہ کچھ دیکھا۔ یہ خیر صحیح ہے لیکن اگر کوئی شخص انکار کرے تو اس کو مکہ معظمہ دکھایا بھی جاسکتا ہے۔ اس طرح خیر صحیح وہی علم کے درجہ کی حیثیت رکھتی ہے جو مشاہدہ میں اُسکے۔ ایک صاحب بصر کہتا ہے کہ آفتاب روشن ہے اور نابینا انکار کرتا ہے۔ تاہم آفتاب کو کسی صورت میں دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن استدلال عقلیہ ان محسوسات پر ہو سکتا ہے جن کا تعلق دیگر جو اس سے ہے جس سے نابینا محروم نہیں۔ اس لئے استدلال عقلیہ بشرطیکہ جو اس ظاہری و باطنی سے علیحدہ نہ ہو ذریعہ علم و یقین ہو سکتا ہے۔ امام صاحب مادہ پرست دہریوں کو کہتے ہیں کہ

”ذوق این مے شناسی بجناتا نہ پیشی“

ابن رشد نے امام غزالی کے فلسفہ کا رد لکھا اور طنزاً کہا کہ

”یہ شخص ایسا احسان فراموش ہے کہ فلسفہ ہی سے سب کچھ سیکھا اور اسی کا رد کرتا ہے۔“

اور یہ بھی لکھتا ہے کہ

”اس کا کوئی خاص مذہب بھی نہیں۔ بظاہر اشعری ہے مگر صوفی بھی ہے اور فلسفی بھی ہے۔“

ابن رشد تو بالکل ارسطو کا گردیدہ ہے بلکہ اسی نے ارسطو کا نام زندہ کیا جس کو یونان بھی بھول چکا تھا۔

امام صاحب نے آیہ قرآنی پر عمل کیا کہ

”و دشمنان دین اللہ اور اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے ہر ممکن قوت

بہم پہنچاؤ۔“

بیزہ اور تیر کچھ آنحضرتؐ کی اختراع نہ تھے مگر دشمنوں کے مقابلہ میں انہی کے ہتھیاروں کو انہی کے مقابلہ میں استعمال کیا۔ عقل کا واحد مالک کچھ افسلاطون اور ارسطونہ تھا البتہ استدلال عقلیہ جس روش پر استعمال کیا۔ اسی طرح امام صاحب نے بھی کیا لیکن وہ خود کشف حقائق علم کلام پر منحصر یقین نہیں کرتے۔

معتزلہ فلسفہ یونان سے مرعوب تھے تو ان کے مقابلہ میں اشعری اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی فلسفہ ان کے خلاف استعمال کیا۔ بغدادی کی کتاب "تُرُقُ بَیْنِ الْفِرَقِ" کا یہی موضوع ہے۔ غرض مسلمانوں میں فرقہ بندی کے اسباب میں سے ایک فلسفہ بھی ہے۔

عصمت انبیاء شخصیت پرستی کا سنگ بنیاد عصمت انبیاء اور شفاعت وغیرہ عقائد ہیں۔ چونکہ ان دونوں عقائد عصمت انبیاء اور شفاعت پرستی اور شبیحہ دونوں کا اتقاق ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے۔ کہ یہ عقائد کب اسلام میں داخل کئے گئے۔ حالانکہ قرآن اور احادیث صحیحہ میں ان کی کوئی سند نہیں۔

عصمت سے ہماری مراد عصمت عن الخطا والذنیان ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا انسان خواہ وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو خطا و ذنیان سے معصوم اور مصون ہے؟ غلط فہمی سے لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ عصمت سے مراد گناہ صغیرہ و کبیرہ میں انبیاء اور اماموں کا کیا مذکور ہے ایک نیک آدمی خواہ وہ غیر مسلم ہی ہو دیدہ و دانستہ ایسے فعل کا مرتکب نہیں ہوتا جسے وہ شمع یقین کرتا ہو۔ سہواً انسان سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جنہیں گناہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہود عصمت انبیاء کے قائل نہیں تھے۔ البتہ مسیحی ایک مسیحؑ کی شخصیت کو معصوم یقین کرتے ہیں۔ چونکہ یوں نے آپ کو الوہیت کا درجہ دیا اس لئے اس کا لازم نتیجہ یہ تھا کہ آپ کی ذات بے عیب ہے۔ یہ عقیدہ ائمہ آریا میں عام ہے، وہ اپنے دیوتاؤں اور اوتاروں بلکہ راجوں کو بھی "نہ کلنک" (بے عیب معصوم) یقین کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب منظر الوہیت تھے۔ اور اللہ ہر ایک عیب سے پاک ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ

اگر کوئی مظہر الوہیت ہو تو وہ معصوم ہوگا۔

مذہبی آزادی خلافت اسلامیہ میں ہر ایک غیر مسلم کا پیدائشی اور قومی حق تسلیم کیا گیا جب خلافت عباسیہ کے دور میں مذہبی مباحثہ بھی شروع ہو گیا تو غیر مسلم اقوام کے عقائد سے بھی واقفیت ہوئی۔ اسلام عالمگیر دین ہے۔ تبلیغ بھی ایک فریضہ اہل علم و حکمت پر ہے۔ اس لئے دوران تبلیغ میں بحث مسائل بھی ناگزیر امر تھا۔ ہر ایک اہل مذہب اپنے مذہب کی فوقیت پر دلیل لاتا۔

مسیحی یہ کہتے کہ مسیح پیدائشی معصوم ہے اس لئے کہ بلا باپ پیدا ہوئے۔ آدم کا گناہ آپ کو وراثتاً نہیں ملا۔ ان ایام میں مسلمان علماء عیسائیوں کی کتب بالخصوص انجیل سے واقف نہ تھے۔ وہ "بارتھیل" کو محرف سمجھتے ہوئے اس کا مطالعہ تفسیر اوقات خیال کرتے۔ اگر وہ انجیل کا مطالعہ کرتے تو خود مسیح کی اپنی شہادت موجود ہے کہ آپ معصوم نہ تھے، اول تو آپ اپنے آپ کو بار بار "ابن آدم" کہتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ آپ کو "مردم الارث" کیا گیا تو خود مسیحی عقیدہ کے مطابق آپ نے تمام جہاں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور اس کی پاداش میں تین دن جہنم میں میں بھی رہے۔ (نقل کفر کفر نباشد) حسب روایت مقدس متی (۱۹/۱۴)

"ایک شخص آپ کے پاس آیا اور آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ اے نیک استاد، بتاؤ کہ میں کون سی نیکی کر دوں کہ حیات ابدی پاؤں، آپ نے فرمایا کہ "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے۔ نیک تو صرف ایک ہی ہے اور وہ آسمانی باپ (دب) ہے؟"

مسلمان سچ کہتے ہیں کہ عیسائیوں نے انجیل میں تحریف لفظی اور معنوی ہر ایک زمانہ میں کی اور اس لئے کہ ان کے پوٹوسی عقائد سے مطابقت پیدا ہو جائے۔

میں نے جو انجیل آج سے زائد از چالیس سال پڑھی تھی اس میں وہی عبارت ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ موجودہ اردو ترجمہ مطبوعہ ۱۹۴۶ء جو بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور نے کیا اور گریٹ بریٹن مطبع نے شائع کیا حسب ذیل ہے۔

”اور دیکھو ایک شخص نے پاس آکر اس سے کہا ”اے استاد! میں کونسی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں اس نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے۔ نیک تو ایک ہی ہے لیکن اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر۔ وغیرہ

بائبل کا عربی میں ترجمہ قاہرہ (مصر) میں ۱۹۲۸ء میں طبع ہوا۔ انہی آیات محولہ بالا کا عربی میں ترجمہ حسب ذیل ہے:-

”واذ واحد تقدم وقال له
ايها المعلم الصالح ائني صلاح اعلم
لستكون لي الحيوۃ الابديه -
فقال له لماذا تدعوني صالحا
ليس احد صالحا الا واحد
وهو الله“
(انجیل متی ۱۹/۱۶)

اور جب ایک شخص اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ اے نیک استاد میں کون سا عمل کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ تو اس نے اسے کہا کہ تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے، ہرگز کوئی نیک نہیں ہے۔ مگر ایک، اور وہ اللہ ہے۔

انگریزی ترجمہ لندن میں جو ”آئیر و سپوٹس ووڈ، ۳۳ پیٹر نو سٹرو، انی، سی، EYRE & SPOTTISWOODE, 33, PATERNOSTER ROW, E.C.) نے شائع کیا۔

حسب ذیل ہے:-

16. AND BEHOLDE ONE COME
AND SAID UNTO HIM,
GOOD MASTER, WHAT
GOOD THING SHALL I DO,
THAT I MAY HAVE ETERNAL
LIFE.

”اور دیکھو ایک اس کے پاس آیا اور کہا اس کو نیک استاد، میں کون سا نیک عمل کروں۔ کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔“

17. AND HE SAID UNTO HIM اور اس نے اس سے کہا ”تو مجھے

WHY CALLEST THOU

ME GOOD, THERE IS NONE

GOOD, BUT ONE, THAT

IS GOD.

نیک کیوں کہتا ہے۔ کوئی نیک

نہیں، مگر ایک، یعنی اللہ۔

اردو ترجمہ میں جس تشریف سے کام لیا گیا ہے عربی اور انگریزی کے تقابل سے واضح ہو سکتا ہے۔

مسلمان عیسائیوں کو الزامی جواب دیتے ہوئے اس لئے بھی تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دیتے کہ ایسا نہ ہو کہ بخت کی گرمی میں حضرت عیسیٰ ابن مریم کی شان میں کوئی ناشائستہ کلمہ منہ سے نکل جائے۔ اور آنحضرت ﷺ نے بھی فرما دیا تھا کہ "میرا اور انبیاء سابقہ کا مقابلہ کرتے وقت کوئی ایسی بات نہ کہو کہ ان میں سے کسی کی توہین ہو۔"

یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء بالخصوص حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی نسبت جو کچھ بھی بڑھ چڑھ کر بیان کرتے مسلمان "امتا و صدقنا" کہتے۔ مسلمانوں کا تو ایمان توراہ اور انجیل پر ایسا ہی تھا جیسا قرآن پر (والذین یؤمنون بما انزل علیک وبما انزل من قبلک)۔ اور یہود و نصاریٰ دونوں قرآن اور ان حضرت کی رسالت کے منکر تھے اور اب بھی ہیں۔ جب مسیحی یہ کہتے کہ مسیحؑ بلا باپ پیدا ہوئے اور ہر ایک گناہ سے جو انسان کرتا ہے معصوم ہیں۔ تو یہ مسیحؑ کو گنہگار ثابت نہ کر سکے، کانپ اٹھتے کہ ایک الوالعزم پیغمبر کی شان میں یہ کیسے کہیں کہ وہ بھی آخر انسان تھا اور فطری کمزوری سے پاک نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اسی حربہ سے کام لیا جو دشمن استعمال کر رہا تھا۔ اور اصولاً ماننا پڑا کہ تمام انبیاء معصوم ہی تھے۔ اس لئے اگر مسیحؑ معصوم ہیں تو یہ کوئی خصوصیت انہی کی ذات تک محدود نہیں۔ لیکن جب دیکھا کہ آیات قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی تو تاویل سے کام لیا کہ ہر ایک نبی نبوت سے پہلے ہو سکتا ہے کہ گنہگار بھی ہو لیکن جب اللہ نے نبوت عطا فرمائی تو بالکل معصوم ہو گیا۔ اور یہ کہ

”توبہ گناہوں کو محو کر دیتی ہے۔ حضرت موسیٰ کو فرعون نے سر دربار جب یہ کہا کہ
 ”تیری پرورش شاہانہ طریقہ پر ہوئی۔ اس احسان کا بدلہ تو نے یہ دیا کہ
 ایک قبطی افسر کو مار ڈالا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ پرورش تو اس لئے
 کی کہ مجھے میری قوم کے خلاف آلہ کار بنایا جائے۔ یعنی میری پرورش نیک
 نیتی سے نہیں کی۔ البتہ میں نے قبطی کا خون ضرور کیا۔ (فعلتہا اذا اذانا
 من الضالین) (۲۶) اور اس وقت میں گمراہ تھا۔“

قتل کے فوراً بعد کہا ”هذا من عمل الشیطن انہ عدو مفضل مبین“ (۲۷) یہ
 شیطانی عمل تھا۔ تحقیق وہ علانیہ دشمن ہے۔“

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی نسبت مذکور ہے کہ قوم ستارہ پرست تھی۔ آپ نے
 بھی سورج، چاند اور زہرہ کی پوجا کی لیکن جب نبوت عطا ہوئی تو فرمایا کہ لا احب الا فلین
 میں فانی ہستیوں کو بحیثیت معبود ناپسند کرتا ہوں،
 اسی طرح آنحضرتؐ کی نسبت ارشاد ہے: ”ووجدك ضالاً فهدی“ (۲۸)
 جب نبوت عطا ہوئی تو ہدایت پائی۔“

حضرت آدمؑ کی نسبت ارشاد ہے کہ ”وعضی ادم ربہ فغوی ثم
 ربه فتاب علیہ وهدی“

امام غزالیؒ ”احیاء علوم الدین“ (جلد چہارم باب اول در بارہ توبہ) میں لکھتے
 ہیں کہ:-

”کوئی شخص اعضا کے گناہ سے خالی نہیں کیونکہ اعضا کے گناہ سے تو
 انبیاء تک نہ بچ سکے۔ قرآن و حدیث میں انبیاء کی خطاؤں اور ان کی
 توبہ اور خطاؤں پر گریہ و زاری کا ذکر موجود ہے۔ اگر بعض اوقات انسان
 اعضا کے گناہ سے محفوظ بھی رہے تو دل سے قصد گناہ سے نہ بچے گا۔
 اور اگر دل میں بھی قصد نہ ہوگا تو وسوسہ شیطانی سے نہ بچے گا کہ وہ خیالات
 پریشان دل میں پیدا کرتا ہے اور اس سے یاد الہی سے غفلت پیدا ہوتی ہے

اور اگر دوسواں سے بھی خالی رہے تو اس بات سے نہیں بچ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال کی واقفیت میں غفلت اور قصور ہو اور یہ سب باتیں نقصان کی ہیں۔ اور ہر نقصان کا کوئی سبب ہے اور اس نقصان کو چھوڑنا اور اس کی ضد نفع کو اختیار کرنا توبہ کی غرض ہے اور کسی انسان کے متعلق یہ متصور نہیں ہو سکتا کہ وہ اس نقصان سے خالی ہے (آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ما عرفناك حق معرفتك، البتہ مقدار نقصان کے بارہ میں لوگ مختلف رائے ہیں، اصل نقصان کچھ نہ کچھ ہر ایک میں موجود ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ "انہ لیسعان علی قلبی حتی استغفر اللہ فی الیوم واللیلۃ سبعین مرۃ" (بے شک میرے دل پر زنگ کا پردہ آجاتا ہے یہاں تک کہ میں دن رات میں ستر بار استغفار پڑھتا ہوں۔ رواہ مسلم) اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بزرگی عطا فرمائی۔ اور ارشاد فرمایا "یغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر" (اللہ نے تیری اگلی پھلی خطائیں معاف فرمائیں) جب ایسے عالی شان نبی کا یہ حال ہو تو دوسروں کا کیا ہوگا۔

امام صاحب (متوفی ۱۱۱۱ھ) کے زمانہ میں عصمت انبیاء پر بحث اس شد و مد سے نہیں تھی۔ جس روز سے بعد میں جاری رہی۔ مسلمانوں کا عام عقیدہ یہی تھا کہ کوئی انسان خواہ وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو خطا سے معصوم نہیں۔ مگر جب فلسفہ یونان سے واقف ہوئے اور عجمیوں کے عقاید کا بھی جائزہ لیا تو وہاں ان کے عقیدہ کے خلاف دیوتاؤں اور قاروں کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ "نہ کلنک" ہیں اگرچہ بقول سقراط، یونانی ایسے ہی بد اخلاق واقع ہوتے تھے جیسے ان کے دیوتا تھے۔ بہر حال اگر کسی بشر کو الوہیت کا درجہ دیا جائے تو اسے معصوم ہی کہنا پڑے گا۔

امام صاحب نے بحث کرتے ہوئے یہ پتہ کی بات کہی ہے کہ

چہ ممکن است رووداغ بندگی ز جبین
زمین فلک شود و آدمی خدا نشود (بیدل)

علامہ محمود شبستریؒ "گلشن راز" میں لکھتے ہیں کہ

مگو ممکن ز حد خویش بگذشت !

نہ این واجب شدتے ممکن او گشت

لیکن ہمیں فلسفیانہ بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل صاف اور سیدھی
سادھی ہے کہ واجب ہے کہ انسان غلطی کرے اور گناہ بھی کرے مگر ارادۂ نہ کرے۔ سہو غلطی
خاصہ بشری ہے اور اسی میں اس کے ارتقا کا راز مضمون ہے۔ ہم نے اپنے مقالات میں
اس موضوع پر کافی بحث کی ہے کہ ہر ایک شے اتباع فطرت طوعاً کرتی ہے اور اسی میں اس

کی زندگی بھی ہے۔ لیکن ترقی بھی نہیں کرتی۔ مگر انسان غلطی بھی کرتا ہے اور ترقی بھی کرتا ہے

اگر یہ غلطی نہ کرتا تو حیوان مطلق ہوتا مگر غلطی ارادۂ کرتا ہے تو بہائم سے بھی بدتر ہے۔ اگر

انسان معصوم ہو تو وہ یا تو خدا ہو گا جیسا کہ بعض فرقوں کا عقیدہ ہے یا حیوان مطلق ہے

بلکہ اس سے بھی بدتر جیسا کہ میں سمجھتا ہوں۔ اس لئے جو حضرات خوش عقیدت کی وجہ

سے انبیاء اور اپنے بزرگوں کو معصوم عن الخطا کہتے ہیں وہ نادان دوست ان کو انسانیت

کے درجہ سے گراتے ہیں۔ اس غلط فہمی میں الجھے ہوتے ہیں کہ اگر انبیاء اور رسل خطا کار

تھے تو جو کچھ وہ بذریعہ وحی کہتے وہ بھی پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتے گا۔

اس موضوع پر شیعہ علماء نے خوب موضوع گافی کی ہے۔ "مجلسی" اپنی کتاب "حیات القلوب"

میں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو کہا کہ میں تجھ کو لوگوں کا امام بناتا ہوں (انہی جاعلک

للناس اماماً ۲۱) بھلا جو خود ہی خطا کار ہو وہ دوسروں کی رہبری کیسے کر سکتا ہے۔

"خفتہ را خفتہ کے کند بیدار"

اور کون عقلمند ایسے امام کی امامت قبول کرے گا جو فاسق حسب ارشاد قرآن اہل نار

ہے۔ (واما الذین فسقوا فما دلوہم النار۔ ۲۱) سستی علماء اماموں کی عصمت کے قائل

نہیں۔ ان کو اتنی بصیرت نہیں کہ سمجھ سکتے کہ ظلم اور فسق و فجور امام کی شان سے بعید تر ہے

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خلفاء بنو امیہ و عباسیہ کی امامت باوجود ان کے ظلم و فسق و فجور تسلیم کر لی۔

اہل سنت و الجماعت بے شک ابتدا میں عصمت انبیاء کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ امام غزالی کا ہم حوالہ دے چکے ہیں لیکن غزالی کے بعد ابھی ایک صدی بھی نہ گزری تھی۔ کہ سنی بھی شیعوں کے ہم عقیدہ ہو گئے۔ فخر الدین رازی صاحب تفسیر کبیر (متوفی ۱۲۱۰ء) نے تفسیر کے علاوہ ایک رسالہ عصمت انبیاء پر بھی لکھا۔ اس میں وہ انبیاء کی عصمت ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ حالانکہ غزالی اور رازی دونوں شافعی المذہب تھے۔ مگر تصوف سے بھی فی الواقعہ شناس تھے۔ صوفیوں کا تو مذہب ہی عصمت امام ہے

جسے سجادہ رنگین کن گرت پر مخاں گوید

کہ سالک بے خیر نبود ز زادہ و رسم منزلہا

(خواجہ فہم)

مشہور صوفی شیرانی کہتا ہے کہ

”آں حضرت اپنے چاروں طرف دیکھتے تھے۔ آپ کو گذشتہ اور آئندہ

کا بھی علم تھا۔ اپنا قدر و قامت بھی چھوٹا بڑا کر سکتے تھے۔ آپ کا سایہ نہ تھا

کیونکہ آپ کا جسم نور تھا۔ اور نور کا سایہ نہیں ہوتا۔“

شیرانی غزالی سے ایک صدی پیشتر گزرا ہے۔

اب ہم حضرت مجلسی کے مقالہ کو زیر بحث لاتے ہیں۔ یہی آیت (انی جاعلت

لناس اماما۔ ۲/۱۱۱) جس کا اس نے حوالہ دیا ہے پوری حسب ذیل ہے

”قال انی جاعلت للناس اماما قال ومن ذریعتی قال لا ینال عہدی

الظالمین واذ جعلنا البیت مثابة للناس وامنا..... واذ قال ابراہیم

رب اجعل هذا بلداً آمناً وارزق اہلہ من الثمرات من امن منهم باللہ والیوم

الآخر قال ومن کفرنا متعہ قلیلہ“

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ عرض کی کہ میری اولاد

بھی (عہد برکت کی وارث ہوگی) فرمایا ہمارا عہد (برکت) ظالموں تک نہیں پہنچتا اور جب ہم نے "البیت" (کعبہ) کو زیارت گاہ عام اور جائے امن مقرر فرمایا... تو ابراہیم نے عرض کی اے میرے پروردگار اس شہر کو جائے امن بنا اور یہاں کے رہنے والوں کو اس لئے کہ وہ غیر ذی نفع ہے اپنی رحمت اور فضل سے پھلوں کا نذر عطا فرما۔ جو بھی ان میں سے اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے۔ فرمایا (نہیں) جو کفر کرے گا اسے بھی تھوڑا (دنوی) فائدہ دیا جائے گا۔

"مجلسی نے انہی آیات کے شروع فقرہ کا حوالہ دیا ہے۔ انہی آیات میں حضرت ابراہیم کی دو غلطیاں واضح کی گئی ہیں۔ جب بشارت امامت ملی تو بہ تقاضا بشریت اپنی ذریت کا خیال آیا کہ یہ عہد برکت یا عہد امامت میری اولاد میں موروثی ہو۔ ارشاد الہی ہوا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارا عہد ظالموں کے حق میں نہیں جو بھی ظالم ہوگا خواہ وہ تیری ذریت ہی سے کیوں نہ ہو وہ اس عہد برکت یا امامت کا اہل نہیں سمجھا جائے گا۔

دوسری غلطی یہ کہ اس تنبیہ سے یہ سمجھا کہ امامت تو صرف اہل ایمان ہی کو ملے گی۔ اس لئے اس داد غیر ذی نفع میں اپنی ذریت یا یہاں کے باشندوں کو رزق شہر بھی اہل ایمان ہی کو ملنا چاہیے۔ اس لئے اپنی دعا میں اہل ایمان کی تخصیص کر دی ارشاد ہوا کہ نہیں دنیوی مفاد جو فی الحقیقت بمقابلہ آخرت متاعِ قلیل ہے کافروں کو بھی دیا جائے گا۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف امام غزالی نے اشارہ کیا ہے کہ انسان خواہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہونا ممکن ہے کہ خطا سے محفوظ ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ ایسا ہو تو وہ حیوان مطلق ہوگا انسان نہیں ہوگا۔ ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی فطرۃً حیرت انگیز کام کرتی ہے۔ آج ماہران فن تعمیر نفیس سے تفسیر اوزاروں کے ہوتے شہد کا چھتہ نہ بنا سکے۔ کیمیائی طریقہ سے شہد بنا لیتے ہیں۔ جو پہلے ہی پھلوں اور پھولوں میں موجود ہے مگر آفرینش سے مکھی ایک ہی حالت میں ہے

ترقی نہیں کرتی۔ یہ انسان ہی غلطی کرنے والا ہے۔ جو برابر ترقی کرتا آ رہا ہے اور کرتا جائے گا۔ اس کے لئے "اجر غیر ممنون" ہے۔ اس لئے واجب ہے کہ انسان غلطی کرے گناہ کے بارہ میں امام غزالی نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ غلطی بھی گناہ ہی ہے، خواہ صغیرہ ہے۔ ان تنگ نظر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو بھی جو "وسع علی کل شیء" ہے تنگ ہی دیکھا۔

گرمزاج کرم آنست کہ من می دالم عالمے رابخطائی من تنہا بخشند

جناب کرم افسوں وسیع پیش مسبر

بے گناہی گئے نیست کہ آنجا بخشند (بیدل)

حافظ شیرازی کہتا ہے کہ

سہو و خطا، بندہ چوں گیرند اعتبار

معنی عفو و رحمت پروردگار چیت؟

بیدل نے کیا اچھا لکھا ہے اور کیا ہی اچھا حکیمانہ خیال ہے کہ

نہ ساز معید رحمت ہمیں نواست بلند

کہ اے عدم صفتاں کاش کے گناہ کنید

انسان فطرۃً "ضعیف" مخلوق ہے۔ اس کو قوت انہی غلطیوں سے حاصل

ہوتی ہے جب ایک غلطی کرتا ہے تو اس کے نتائج بھی محسوس کرتا ہے اس لئے اسے

رفع بھی کرتا ہے۔ غلطی تقاضا میں جوں جوں رفع ہوتے جاتے ہیں تکمیل مقصد بھی

ہوتی جاتی ہے۔

بنو امیہ پر یہ الزام کہ وہ ظالم اور فاسق و فاجر تھے کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔ ہم

نے اس موضوع پر اپنی کتاب "خلافت اسلامیہ" میں بحث کی ہے۔ لیکن اس میں

کچھ شک نہیں کہ اگرچہ وہ فاسق و فاجر نہ تھے مگر آخری تاجداران ضرور ظلم کے مرتکب

ہوئے اور حکومت ان سے لی گئی۔ یہ سنت اللہ ہے۔ لیکن بالفرض اگر وہ فاسق و فاجر

بلکہ کافر بھی ہوں تو دنیوی حکومت سے نہ وہ محروم ہو سکتے ہیں اور نہ اور قومیں عجمی اس

سے محروم ہوئیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ امامت کے اہل نہیں تھے۔ امامت پر ہم مناسب مقام پر بحث کریں گے۔

شفاعت | شفاعت پر بھی سنی اور شیعہ متفق ہیں کہ بروز حضرتؑ حضرتؑ اپنی امت کی شفاعت فرمائیں گے۔ اور حضرتؑ اور شہداء اور صالحین مسلمین کی شفاعت بھی قبول کی جائے گی۔

قرآن سے اس عقیدہ کی تائید نہیں ہوتی۔ مگر سنی اور شیعہ کے پاس احادیث اس کی تائید میں ہیں۔ روایات یہ ہیں کہ لوگ خواہ وہ کسی امت سے تعلق رکھتے ہوں بروز حضرتؑ اپنے انبیاء اور رسل کے پاس حضرتؑ آدم سے لے کر حضرتؑ مسیح تک جائیں گے لیکن وہ سب کالوں پر ہاتھ رکھیں گے اس لئے کہ وہ خطا کرتے اور خطا کار شفیع نہیں ہو سکتا۔ خطا کار کو تو ضرورت ہے کہ کوئی اس کی دست گیری کرے۔ چنانچہ حضرتؑ آدم کی نسبت روایت ہے کہ جب آپ بہشت سے بوجہ منصبت نکلے گئے۔ تو صد ہا سال روتے رہے آخر حضرتؑ کا نام مبارک شفاعت کے لئے درمیان میں لائے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے آدم تجھے "محمد" کا نام کیسے معلوم ہوا۔ آدم نے عرض کی کہ "جب تو نے مجھے پیدا کیا عرش عظیم کا پایہ میری آنکھوں کے سامنے تھا اس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ تیرا محبوب ہے کہ اپنے نام کے ساتھ اسے بھی لکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "وہ تیری ذریت سے ہوگا اور تو اسی کے نور سے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی دن سے حسب الحکم خداوندی آدم کی کنیت ابو محمد ہو گئی۔"

"شفاعت" اہم آریہ اور مسیحیوں کا بنیادی عقیدہ ہے۔ مسیحی کہتے ہیں کہ مسیحؑ نے

تمام جہانوں کا گناہ اپنے کندھوں پر اٹھالیا ہے اور خود ہی اس کی سزا بھی بھگتی لیکن سنی اور شیعہ میں شفاعت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرتؑ اور امامان معصوم اور شہداء اور صالحین مومنین مسلمان گنہگار کی شفاعت خدا سے کریں گے اور خدا ان کو بخش دے گا۔

یہود جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ چھو نہیں سکتی مگر چند روزہ وہی مسلمان بھی

کہنے لگے کہ اول تو ہماری شفاعت میدانِ حشر ہی میں ہوگی لیکن بعض گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جانا ہی پڑے تو پندرہ روز بھی شفاعت کام آئے گی۔ لیکن عصمتِ نبیہ کا عقیدہ باطل ہو کر رہ جاتا ہے اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ تمام انبیاءِ آدم سے حضرت عیسیٰ تک ایک دو گناہوں کی وجہ سے شفاعت کا وصف کھو بیٹھے تھے۔ مناسب ہے کہ پہلے آیات قرآن میں تدبیر کیا جائے۔

مشرکین کا عام عقیدہ تھا کہ ان کے دیوتا اور دیویاں شفیع ہیں۔ اس کی تردید فرمائی گئی "فما تنفعهم شفاعۃ الشافعیوں" (۲۹/۱۶)

"تو ان مشرکین کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے (جیسا کہ ان کا عقیدہ تھا) کچھ بھی تو فائدہ نہ دیا۔"

قرآن میں لفظ "نفع" لفظ "ضرر" کے مقابل استعمال ہوا ہے۔ آیہ محولہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے عقیدہ کے خلاف ان کے ٹٹا گراں کو اس ضرر سے نہ بچا سکے جو دوزخ میں لاقی ہو رہا تھا۔

اہل کتاب کے عقیدہ دربارہ شفاعت کی تردید فرمائی گئی ہے۔

"اتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها شفاعۃ ولا یؤخذ منها عدلٌ ولا ہم ینصرون" (۱/۲۱)

اس دن سے ڈرو جب کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی امر میں کام آئے گا اور نہ اس کی شفاعت قبول ہوگی اور نہ کفارہ لیا جائے گا اور نہ کوئی اللہ کے سوا مددگار ہی ہوگا۔

مسیحی عقیدہ دربارہ کفارہ یہ ہے کہ اولادِ آدم سب گنہگار ہے اور یہ گناہ وراثت میں ان کو مورثِ اعلیٰ آدم سے بلا ہے۔ اس کا کفارہ مسیح ہو گئے اور اس طرح ان کی شفاعت ہو گئی جو مسیح پیدا ایمان لاتے ہیں۔ آیت محولہ بالا میں یہ واضح کیا گیا کہ

اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف ہے کہ ایک گنہگار کے عوض کسی بے گناہ کو ماخوذ فرمائے خواہ وہ خود ہی کسی وجہ سے اپنے آپ کو پیش کرے۔ عند اللہ ہر ایک اپنے اعمال کا بدلہ لے گا۔

کل نفس بما کسبت رعدتہ

لا تزوروا
ذرات
من
الارض
والبحر
والجبال
والنہر
والانہار
والجبال
والنہر
والانہار
والجبال
والنہر
والانہار

ذمہ دار ہے اور اسی کو سزا جزا ملنی چاہیے۔

من ذا الذی یشفع عنده الذی باذنه یعلم ما بین یدیه وما خلفهم

ولا یحیطون بشئی من علم الا بما شاء (پہ)

”کون ہے جس کو یہ دعویٰ ہو کہ وہ اللہ کے ہاں سفارش کر سکتا ہے مگر یہ کہ اسی کے اذن سے، اور وہ تو جو کچھ ان کے اعمال گزشتہ و آئندہ کا علم بھی رکھتا ہے اور اس کے علم پر کسی اور کا احاطہ نہیں البتہ اس میں سے جو کچھ بھی چاہے اپنے بندوں کو عنایت فرمائے“

”شفاعت کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے کہ قاضی صاحب فریقین کے حالات سے واقف نہ ہو۔ تو گواہان فریقین اپنے اپنے فریق کے حق میں وہ بات کہتے ہیں جو اپنے فریق کے حق میں مفید ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر ایک شے کے عمل کو کلمہ جانتا ہے اس سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اس لئے اگر شفاعت کی یہ غرض ہو تو بالکل باطل ہے۔ البتہ ایک بات ہے بعض جرائم قابل معافی اور بعض قابل راضی نامہ اور اور بعض قابل راضی نامہ باجارت عدالت ہوتے ہیں۔“

بروز قیامت اگر ایک شخص اس بات پر رضامند ہو کہ مستغاث علیہ سے کسی ضرر کا بدلہ نہ لے تو اگر یہ قابل معافی یا قابل راضی نامہ ہے تو اس کا اختیار ہے۔ لیکن اگر یہ عدالت کی اجازت کی بھی ضرورت ہے تو یہ عدالت کا اختیار ہے کہ اجازت دے یا نہ دے۔ آیات مجملہ بالا کا یہ مفہوم ہے کہ ایسی شفاعت قابل قبول ہو سکتی ہے اکثر علما مابہل روایت نے روایات کی روشنی میں اس آیت کی تاویل کرتے ہوئے ٹھوکر کھاتی سے۔

شرعی جرائم یا گناہ دو قسم کے ہیں۔ اصطلاح میں ہم جرائم ان کو کہتے ہیں جن سے

حقوق العباد تلف ہوتے ہیں۔ اصطلاح قرآن میں ان کو الذمہ وغیرہ سے تعبیر کیا

گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیشی کے وقت عدالت الہیہ میں فریقین اپنا دعویٰ یا استغاثہ

اور جواب پیش کریں گے۔ فرض کرو دعویٰ یا مستغاثیت دعویٰ سے دست بردار ہو جائے

تو کیا اللہ تعالیٰ اسے مجبور کرے گا کہ دست بردار نہ ہو اور اگر دست بردار ہو گیا تو مجرم کو سزا ضرور دے گا۔ البتہ اس کے رحم کا تقاضا یہ ہے کہ مدعی کو اپنی رحمت سے وہ دے کہ ضرر کا معاوضہ ہو جائے اور گنہگار کو بخش دے۔ فرض کرو کہ مدعی اپنے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوتا اور اس کا دعویٰ بھی سچا ثابت ہوتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اسے مجبور کریگا کہ دست بردار ہو جائے اور مجرم کو سزا نہ دے۔ وہ وہی کچھ کرے گا جو اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ لیکن فرض کرو کہ اللہ تعالیٰ کینہ و غیرہ کے جذبات محو کر دے اور مدعی یہ کہے کہ میں نے مجرم کا جرم اگرچہ سنگین ہے معاف کر دیا تو اللہ اپنی رحمت سے معاوضہ دے گا اور مجرم کو بخش دے گا۔ مگر بعض بلکہ اکثر جرائم ایسے ہوتے ہیں کہ اگرچہ افراد سے سرزد ہوتے ہیں اور بلا واسطہ افراد پر اس کا اثر پڑتا ہے مگر بلا واسطہ اس کی زد میں ایک جماعت یا قوم بھی آجاتی ہے مثلاً قتل عمد، اگرچہ ایک شخص مارا گیا مگر ایک جماعت جس کا یہ فرد ہے اس کا جماعت پر اور جماعت کا اس پر سہی ہے۔ اور جماعت اس کے قتل کی وجہ سے اس فائدہ سے محروم ہو گئی جو اس کی ذات سے متوقع تھا۔ مقتول کے وارثان قصاص کا دعویٰ بھی اسی بنا پر کرتے ہیں۔ اس لئے ایسا جرم تمام جماعت یا قوم ہی معاف کر سکتی ہے۔ عدالت قوم کی نمائندہ ہے۔ وارثان مقتول اگر معاف کرنے پر رضامند بھی ہوں تو ان کو پہلے عدالت کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر عدالت اجازت دے دے تو یہ معافی کل قوم کی طرف سے ہوگی۔

یہ مفہوم ہے آیات محولہ بالا کا۔ اس کی تائید آیت "یشفعون الا لمن ارتضى" (۲۱) سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی شفاعت کے لئے عدالت کی رضامندی کی بھی ضرورت ہے ان آیات سے یہ مفہوم پیدا کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و اولیاء کو پہلے ہی اجازت دے رکھی ہے کہ اپنی امتوں کے لئے سفارش کریں تو ان کی مغفرت ہو جائے گی۔ اعمال نیکہ بد میں ہر ایک تیزاٹھ جائے گی۔ اور ہر ایک شخص معصیت پر دلیر ہو سکتا ہے۔ آنحضرتؐ جب اپنے لخت جگر کو یہ کہتے ہیں کہ "تیرا ایمان و عمل ہی کام آئے گا۔ یہ خیال نہ کرنا کہ میرا باپ نبی اور رسول ہے تو وہ کام آئے گا۔ البتہ یہودیہ کہتے ہیں کہ دونوں کی آگ میں

جانا ہی پڑے گا تو یہی چند روز مسلمان بھی انہی کی سی باتیں بناتے ہیں۔
 دوسری قسم جرم کی وہ گناہ ہے جس سے حقوق الہی تلف ہوتے ہیں۔ تو یہ معاملہ
 بندوں اور خدا کے درمیان ہے۔ اس میں کون دخل دے سکتا ہے۔ وہ خود بہتر
 جانتا ہے کہ اس کے عدل اور رحم کا کیا تقاضا ہے۔ جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے
 تو یہ معاملہ بندوں کا بندوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان میں انصاف فرمائے گا اور فرما رہا
 ہے۔ قرآن میں واضح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

”جہاں تک حقوق الہیہ کا تعلق ہے“ ”شُرک“ کے سوا سب ”ذُنُوبٌ بِحَسْبِ
 دَرَجَاتٍ“ (ظلم عظیم ہے) (لقمان ۲۱)

ضعیف الاعتقاد یہ عذر کرتے ہیں کہ شفاعت ایک ”دعا“ ہے۔ اور بعض لوگ دعویٰ
 کرتے ہیں کہ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ اللہ کے پیارے بلکہ بہتر بہ اولاد ہیں
 یہ باطل عقیدہ اہل کتاب نصاریٰ کا ہے۔

ابوالانبیاء حضرت نوحؑ کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا والد کے
 حق میں رد کی جاتی ہے۔ اور ہم مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ اس بات میں ابراہیمؑ کا بھی
 اتباع نہ کرو۔ حضرت لوطؑ کی خاتنہ زوجہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ ان حضرات نے دعا کا
 مفہوم بھی نہ سمجھا۔ یہ تو اقرار عبودیت ہے۔ اور طلب کسی مقصد کی جائز وسائل سے ہے
 جہاں وسائل منقطع ہوں یا دسترس سے باہر ہوں۔ وہاں عجز و نیاز سے اللہ کی نصرت
 کی طلب ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے مفصل بحث کی گنجائش اس مقام پر نہیں۔
 قیامت کا کیا مذکور ہے۔ قوم لوط کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے کیا کچھ زور دعاؤں میں
 نہیں لگایا کچھ بھی شہواتی نہ ہوئی۔ لوگ روزانہ دعائیں مانگتے ہیں کوئی بھی قبول نہیں
 ہوتی۔ اس لئے سوچنا چاہیے کہ یا تو دعا کا وہ مفہوم نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہوا ہے یا
 ان کے ذہن نشین کیا گیا ہے۔ بعض مدعیان قبولیت دعا کے پاس لوگ جاتے ہیں
 کہ میرے حق میں دعا کرو اس امید پر کہ یہ مقرب ہیں ان کی اللہ سنا ہے حالانکہ وہ ورد
 اور وہ تفرع ان مدعیوں کے قلب میں ممکن ہی نہیں کہ پیدا ہو جو اس شخص کے دل

میں ہے جو مصیبت میں مبتلا ہے۔ ویسے ہر ایک مومن مسلمان کو خیر اندیش ہی ہونا چاہیے۔ اور اس جذبہ اخوت کے تحت اپنے بھائی کے حق میں دعائے خیر ہی کرنی چاہیے۔ نری دعاؤں سے کام نہیں چلتا کچھ بوقت ضرورت عملی مدد بھی کرنی چاہیے اسی پر آنحضرتؐ بیعت بھی لیتے تھے۔

ارشاد قرآن ہے کہ

وَقَالُوا شَهِدِ الرَّحْمَنُ ذُلًّا سَيَجْنُؤُا۟ بِلِ عِبَادِكُمْ كَرِهَ مُونَ هَ لَا يَسْقُونَ
بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْوَالِهِمْ يُعْلَمُونَ هَ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ
ارْتَضَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفَعُونَ هَ وَمَنْ يَظَلْ مِنْهُمْ إِلَىٰ آلِهِمْ مِنْ دُونِ ذَلِكَ
يَجْزِيهِ جَهَنَّمُ كَذَٰلِكَ يَجْزِي الظَّالِمِينَ (الانبیاء ۷۷)

اور کہتے ہیں کہ اللہ کا بیٹا ہے۔ اللہ اس سے پاک ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن کو یہ پوجتے ہیں اللہ کے مکرم بندے ہیں۔ انہیں اتنی جرأت نہیں کہ بڑھ کر اللہ کے حضور بات کریں۔ وہ تو اسی اللہ کے حکمروار ہیں۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کا حال ہے اور جو کچھ ان کا ماضی ہے اور وہ اللہ کی رضا مندی کے بغیر کسی کی شفاعت بھی نہیں کرتے اور مائے ڈر کے کانپ رہے ہیں اور ان میں سے جو بھی کہے ہیں اللہ ہوں اللہ کے ہوتے تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے اور ظالموں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

ہم اسے ایک معاصر مفسر قرآن نے "بل عبادکم کرہ مونی" سے یہ بات پیدا کی ہے کہ یہ آیت صریحاً عصمت انبیاء پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں میں یہ عقیدہ بلا اختلاف تسلیم شدہ ہے کہ انبیاء معصوم ہی ہوتے ہیں۔

مکتہ مونی سے یہ بات پیدا کرنا کچھ عجیب ہی بات ہے۔ ارشاد قرآن ہے کہ

لَقَدْ كَرِهَ مَنَا بَنِي آدَمَ (۱۵)

انبیاء تو انبیاء ہی ہیں۔ اس مفروضہ سے تو تمام بنی آدم معصوم ہیں۔ تکریم و تقرب بلاشبہ عزت افزائی کا مفہوم واضح کرتے ہیں اور جس شخص کے اخلاق پسندیدہ ہوں تو وہ بیشک

واجب الاحترام شخصیت عند اللہ اور عند الناس بھی ہونی چاہئے لیکن بقول امام غزالی یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ اس میں بشری کمزوری بھی نہیں۔ اور یہ کہ اس کا قلب تمنا سے خالی ہے۔ حالانکہ نص قرآن سے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ آنحضرتؐ سے پیشتر کوئی نبی اور کوئی رسول تمنا سے خالی نہ تھا اور اس نے جب بھی تمنا کی شیطان نے اس میں اٹھایا کیا۔

آیت میں الفاظ نبی اور رسول استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اس حیثیت کے ہوتے بھی وہ الفاظ شیطانی سے پاک نہ تھا۔

آیت محولہ بالا میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ لوگ جو "من دون اللہ بندوں کو بلکہ شجر و حجر کو پوجتے ہیں۔ تو اس لئے کہ ان کو مظہر الوہیت یقین کرتے ہیں چونکہ وہ "عباد مکرہوں" ہیں اس لئے ان کی عصمت اور شفاعت کا عقیدہ بھی اخذ کرتے ہیں۔ ان تمام عقاید باطلہ کی بنیاد ایک ہی عقیدہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو خدا بناتے ہیں یا خدا زادے جو بھی یہ دعویٰ کرے یا کسی بشری شخصیت سے ایسا دعویٰ منسوب کرے یا کسی بشر کو اللہ یقین کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔

مکرم میں "فضیلت" کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے اور اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ انبیاء اور رسل کو عوام الناس پر ایک گونہ فضیلت ہونی ہے لیکن وہ فوق البشر نہیں ہوتے۔ "قل انا بشر مثکم" ایسے ہی بشر ہوتے ہیں جیسے او شما۔

یہ عقیدہ مشرکین کا ہے کہ وہ اپنے معصرا نبیاء پر پھرتی جہلتے کہ یہ کیسا رسول ہے "پیٹھ اور شرابی اور محصول لینے والوں کا دوست" (انجیل) مسیح کے زمانہ میں رومی حکومت یہودیوں پر مسلط تھی جو محصول وصول کرتی۔ علماء یہود نے فتویٰ دیا تھا کہ جو شخص حکومت کی مدد وصولی محصول میں کرے گا، کافر ہے۔ مسیح سے بھی فریو

نے سوال کیا تھا کہ محصول دیں یا نہ دیں، فرمایا "جو قبصر کا ہے قبصر کو دو" مسیح کا ایک عواری مقدس منی رومی گورنمنٹ کا ملازم تھا۔ اور محصول وصول کیا کرتا۔ کفار کہتے "یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا پیتا، بازاروں جوتیاں چھٹانا پھرتا ہے۔" ان کے ذہن میں انبیاء اور

رسول کا یہ تصور تھا کہ اسے فوق البشر ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ملائکہ بھی ہوں جو لوگوں کو ڈرائیں و صمکائیں۔

مفسر ممدوح نے لکھنے کو تو لکھ دیا کہ عقیدہ "عصمت انبیاء" متفق علیہ ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھا کہ کب سے اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہوا ہے؟ اور کیوں ہوا؟ کسی نظریہ پر محض اتفاق تو اسکی صداقت کی دلیل نہیں۔ اگر بادشاہ وقت حضرت ابراہیم کو یہ کہتا کہ کل عالم انسانی یا کم از کم ہماری قوم کا اتفاق اس امر پر ہے جس کی تو مخالفت کرتا ہے تو حضرت ابراہیم کے پاس اس کا جواب تھا مگر معلوم نہیں مفسر ممدوح کیا جواب دیتا۔ ہم کہتے ہیں کہ صداقت صداقت سے خواہ تمام جہاں اسے تسلیم نہ کرے اور گناہ گناہ ہے خواہ تمام جہاں اسے کارِ ثواب سمجھے۔ اگرچہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ حق و باطل میں تمیز اہل علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں۔ اور ان کی تعداد ہمیشہ تھوڑی ہی رہی ہے۔ ان کے نظریوں میں بھی اختلاف رہا ہے۔ اور خلف سلف سے ہمیشہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اگر نہ کریں تو ذہنی ارتقار ک جائے گا۔

"ڈوائٹ، ایم، ڈونلڈ سن، ڈی ڈی، پی ایچ ڈی مشہد، ایران۔"

(Dwight M. Donaldson, D.D., Ph.D) اپنی

کتاب "شیعہ مذہب" (THE SHIITE RELIGION) میں اسلامی عقیدہ دربارہ عصمت کے تحت لکھتا ہے کہ:-

"ہجرت کے بعد تیسری صدی تک عصمت کا عقیدہ مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا۔ جب مسلمانوں اور عیسائیوں میں مذہبی مجاذلہ شروع ہوا تو اس وقت بھی اسلامی لٹریچر میں اس عقیدہ کا مذکور نہیں۔ خلیفہ مامون شیعہ کے عہد (۸۱۳-۸۳۳ء) میں ایک مکتوب عبداللہ ابن اسمعیل ہاشمی نے عبدالملک ابن اسحاق الکندی کو لکھا۔ اگرچہ راقم مکتوب کا موضوع بحث دعوی اسلام کی صداقت ہی ہے مگر عصمت انبیاء پر ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ اگرچہ جواب میں الکندی نے آنحضرت کے دعوی رسالت

پر مخالفانہ بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن جو اب میں بھی عصمت انبیاء پر اشارتاً یا صراحتاً کچھ نہیں لکھا۔ خلیفہ متوکل (۸۴۷-۸۵۰ء) کے عہد میں طبرستان کا ایک مسیحی پیشوا ابن نے (علماء اسلام سے اکثر مذہبی مباحثہ کیا۔ آخر اس پر حقائقیت اسلام واضح ہو گئی تو اسلام قبول کر لیا۔ اور کتاب "کتاب الدین والدولہ" لکھی۔ اس میں بھی عصمت انبیاء کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ مولف علی طبری نے اس کتاب میں توریت اور صحف انبیاء اور انجیل سے ان تمام پیش گوئیوں کو جمع کیلئے جو آنحضرتؐ کی بعثت کے متعلق ان میں ہیں۔ اور ان پیش گوئیوں کے موضوع کے لحاظ علیحدہ علیحدہ باب باندھا ہے۔

(یہ کتاب عربی سے انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے اور ہمارے مطالعہ میں رہی ہے)

اگر تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ تو قیاس غالب یہی ہے کہ عصمت انبیاء کا عقیدہ اور اس کی اہمیت شیعہ مذہب کے ارتقا کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئی۔ اہل تشیع کی غرض یہ تھی کہ اپنے اماموں کے دعویٰ کی فضیلت مستی خلفاء کے دعویٰ خلافت پر ثابت کی جائے۔ اس لئے ضرورتاً اماموں کی عصمت کا بھی قائل ہونا پڑا جو انبیاء کے ہی جانشین ہیں۔ جن استدلال سے شیعہ کام لیتے ہیں وہ "معتزلہ" کہے۔ اگر ابراہیمؑ معصوم نہ ہوتا تو گنہگاروں کا امام کیسے ہوتا۔ اسی طرح اگر علیؑ معصوم نہ ہوتا جو ابراہیمؑ کا جانشین بالواسطہ ہے تو لوگ اس کی اطاعت کیوں کرتے۔ آل بویہ عباسی خلافت کے ایام انحطاط میں خلافت کے سرپرست بغداد میں تھے۔ اور عالی شیعہ تھے کلینی اور شیخ مفید اور ابن بویہ صدوق سب آل بویہ کے اقتدار میں گذرے ہیں۔ انہوں نے عصمت انبیاء امام کا عقیدہ اپنی پوری نشان کے ساتھ نمایاں کیا۔ انہی ایام میں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے اپنی کتاب "تبصرۃ العوام" میں یہی عقیدہ بحث کا موضوع بنایا۔ کلینی نے اپنی کتاب کافی میں عصمت انبیاء کے بارہ میں جو احادیث روایت

کی ہیں اس کے قریب تر زمانہ میں فقہ اکبر میں بھی درج کی ہیں۔ اس کی تدوین دسویں
 صدی عیسوی میں ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ تک تو سینوں
 میں یہ عقیدہ نہ تھا ان میں کب آیا؟

(اس دعویٰ کا ثبوت موجود ہے کہ مجلسی اپنی کتاب "حیات القلوب" میں
 ملا سعد الدین سنی کی تردید کرتا ہے کہ ملا کتاب ہے کہ امام اور خلیفہ کا انحصار
 قوت اور فتح پر ہے۔ مجلسی کتاب ہے کہ یہ بے ہودہ عقیدہ ہے)
 عقاید نسفی میں بھی عصمت اہلبیت کا ذکر نہیں۔ النسفی امام رازی سے
 دو نسلیں پیشتر گزر رہے۔

شفا عت کے بارہ میں ارشاد قرآن ہے :-

"قل لله الشفاعة جميعا، له ملك السموات والارض ثم اليه ترجعون"
 "کہو کہ شفاعت تو ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ اسی کا ہے ملک السموات والارض
 اور اسی کی طرف تمہارا رجوع ہے۔" (۲۲)

اصل میں بات یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے قرآن میں آنحضرتؐ کے بارہ میں
 یہ پڑھا کہ

"ما ضل صاحبكم وما غوى، وما ينطق عن الهوى، ان هو الا
 حى يوحى، ما زاغ البصر وما طغى" (۲۶)

"تمہارا رفیق نہ تو سیدھی راہ سے بھٹکا اور نہ بہکا۔ اور نہ اپنے جی سے باتیں بناتا
 ہے۔ بلکہ جو کچھ کہتا ہے وہ تو وہی ہے جو اسے وحی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ (مشاہدہ آیات
 کے وقت) اس کی نظر نہ بہکی اور نہ اچھٹی۔"

تو قیاس یہ کیا کہ آنحضرتؐ جو کچھ بھی ارشاد فرماتے وہ وحی ہے۔ اور وحی
 میں غلطی نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن تمام وحی ہے اور اس میں باطل کا دخل
 نہیں اور یہ کہ بوقت نزول وحی آنحضرتؐ کا قلب سلیم ان تمناؤں سے خالی تھا۔ یہ
 مفہوم ہے "ما ضل صاحبكم وما غوى" اور "ما زاغ البصر وما طغى" کا۔ اس لئے

جہاں تک وحی کا تعلق ہے وہ ہر ایک غلطی سے پاک ہے۔ لیکن اگر یہ دعویٰ کیا جائے

کہ آنحضرتؐ جو کچھ بھی فرماتے وہ سب وحی ہی ہے۔ تو ان حضرتؐ کی بشریت کی

نفی ہو جائے گی، اس لئے جب عصمت انبیاء کا عقیدہ پختہ ہو گیا تو اس کی تائید

میں ان احادیث کو جو ان حضرتؐ سے منسوب ہیں اہل حدیث (سنی اور شیعہ) نے

وحی "غیر متلو" یا "نخعی" کہہ کر دلوں کو تسلی دے لی۔ وحی نخعی کا یہ مفہوم ہے کہ معانی

یا مطالب مجرد تو وحی ہوتے۔ مگر الفاظ کا جامہ ان کو ان حضرتؐ نے خود پہنایا۔ یہ

قیاس مع الفارق ہے۔ یہ لوگ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "علم النفس" سے واقف نہیں

دل میں کوئی خیال بلا الفاظ پیدا ہی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ معانی یا حقیقت مجردہ کا احسا

انسان کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اس لئے ارشاد قرآن ہے کہ

"کسی بشر کے لئے (خواہ وہ رسول ہی کیوں نہ ہو) ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ

اس سے کلام (جو حقیقت مجردہ ہے) فرمائے۔ مگر (اسکی تین ہی صورتیں ہیں)

یہ کہ وحیا یا من وراہ حجاب (رویا یا تصورات ذہنی کی صورت میں) یا کوئی

(بشر) رسول بھیج دیتا ہے۔ (جس سے وحیا یا من وراہ حجاب کلام

فرماتا ہے وہ عوام الناس کو اسی وحی سے آگاہ کرتا ہے)

وحی "بلفظہ ممکن ہے۔ الفاظ دل میں ہی ہر ایک خیال کے ساتھ ہی بیک وقت پیدا

ہوتے ہیں۔ اور زبان پر جو بے شعور آگے صوت ہے آتے ہیں، یعنی جو دل میں ہوتا ہے

وہی زبان پر آتا ہے۔ وحی اور عام خیالات میں فرق یہ ہے کہ وحی میں تصنع نہیں

ہوتا اور نہ اس میں انسانی ارادہ کا دخل ہوتا ہے۔ تذکرہ تدبر و تفکر سے جو خیالات

ہمارے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جن کا اظہار ہم لفظوں میں کرتے ہیں۔ اس میں

ہمارے ارادے کا دخل ہوتا ہے۔ اور اس میں غلطی کا بھی احتمال ہے۔ بلکہ اختلاف

کثیر اس میں واجب ہے۔ اور یہی کیفیت احادیث کی ہے۔ یعنی یہ آنحضرتؐ کا

بشری عقلی کلام ہے۔ اور ایسا کلام ہمیشہ وقتی ہی ہوگا۔ اور بالاستقلال محفوظ دائمی

صداقت نہ ہوگا۔ وحی غیر متلو یا نخعی تو کوئی چیز ہی نہیں۔

اگر احادیث مستقل شریعت اسلامیہ ہوں تو ضرور ہے کہ ان کا ہر ایک حرف محفوظ بھی ہو۔ کیونکہ آئین و قوانین لفظاً اور معنیاً محفوظ ہوں تو ان پر عمل ہو سکتا ہے۔ مگر احادیث لفظاً تو محفوظ ہی نہیں اس لئے معنیاً بھی نہیں۔ آنحضرتؐ تو اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ اور عام ذہنیت کے تقاضا کو بھی سمجھتے تھے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ

”جو کلام مجھ سے منسوب ہے۔ سوائے قرآنِ قلم بند نہ کیا جائے“

جب کلام قلم بند ہو جائے تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ

”پہلی امتوں کی گمراہی کا باعث بھی یہی تھا کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی احادیث کو ”ما انزل اللہ“ کے ساتھ مخلوط کر دیا۔“

جب مسلمانوں نے اس ارشاد نبوی پر عمل نہ کیا تو عصمتِ انبیاء اور شفاعت اور آمد ثانی وغیرہ کے مسائل بھی موضوعات کے ساتھ ان کے عقاید میں داخل ہو گئے اور یہاں تک غلو سے کام لیا کہ احمد بلا میم اور عرب بلا عین بھی کہنے لگے۔

اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب ”علم تصوف“ میں کافی بحث کی ہے۔

۹ امامت

صدر اسلام میں خلافت اور امامت میں کچھ فرق نہ تھا۔ ان

اصطلاحات کے مفہوم میں فرق بعد میں پیدا کیا گیا۔ خلافت سے

مراد دینی حکومت لی گئی۔ جن کو دنیوی حکومت نہ ملی۔ انہوں نے دینی حکومت

سنجھال لی۔ دینی حکومت دنیوی حکومت سے کم نہ تھی بلکہ کچھ بڑھ کر ہی تھی اس

کے جواز میں ایک حدیث بھی پیش کی گئی کہ ”آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ”میرے بعد تیس

سال تک تو خلافت رہے گی اس کے بعد لوگ ہوں گے۔ اور یہ کہ ”جو شخص اپنا

امام وقت نہ پہچانے اور مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔“ اس عقیدہ پر

سنی اور شیعہ کا اتفاق ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ امامت کا تقرر اللہ کے اختیار

میں ہے یا لوگوں کے ہاتھ میں۔ امامیہ شیعہ اور اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ تقرر اللہ فرماتا

ہے۔ مگر سنی کہتے ہیں کہ انتخاب مسلمانوں کے اقتضائے پر ہے۔ امامت کی

شرائط میں بھی بقدر اس فرق کے فرق ہے

بات دراصل یہ ہے کہ سنیوں نے امامت کا مسئلہ عصمت اور شفاعت کی طرح باہر ہی سے لیا۔ اور ان کے نزدیک امام اور خلیفہ ایک ہی ہے۔ اس سے انکار شیعہ فرقہ کو بھی نہیں ہے لیکن جب کسی کے ہاتھ میں دنیوی حکومت نہ ہو تو امامت ہی سہی۔ اس لئے ضرورتاً ان کو امامت کو خلافت سے علیحدہ کرنا پڑا چونکہ امام وقت کا پہنچانا جاہلیت کی موت مرنا ہے اور ماسویٰ حضرت علیؑ کوئی بھی ہاشمی خلیفہ امامیہ کے عقیدہ کے مطابق نہیں ہوا۔ اس لئے بھی امامت کو خلافت سے علیحدہ ہی کرنا پڑا۔ اس موضوع پر "مجلسی" نے اپنی کتاب "حیات القلوب" میں مفصل بحث کی ہے۔ ملاحظہ باقر مجلسی صفوی خاندان کے دور دورہ میں بہت بلند پایہ شیعہ مجتہد تھا۔

امامت کے بارہ میں اہم سوال یہ ہے کہ آیا امامت واجب ہے اور جزو دین ہے اس پر علماء اسلام کا اختلاف رائے ہے۔

ابن خلدون نے اپنے "مقدمہ" میں ذکر کیا ہے:

"صرف اسی ایک سوال پر اختلاف رائے نے مسلمانوں میں کئی فرقے پیدا کر دیے"

شہرستانی نے اپنی کتاب "ملل و نحل" میں ان فرقوں کا نام بنا کر ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے اس لئے باہمی کشت و خون بھی مسلمانوں میں ہوتا رہا۔ اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگا۔

امامت کے "وجوب" پر مجلسی لکھتا ہے کہ

"جاننا چاہیے کہ دربارہ تقرر امام علماء میں اختلاف رائے ہے۔ سوال یہ

ہے کہ کیا اماموں کا تقرر بعد ختم نبوت واجب ہے؟ اور اگر ہم اس کا

جواب اثبات میں دیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وجوب اللہ کے

لئے ہے یا اماموں کے لئے۔ ہر دو صورتوں میں وجوب معقول ہے یا منقول

یعنی اسے عقل واجب ٹھہراتی ہے یا احادیث کی بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

تمام مستند شیعہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وجوب فی الحقیقت اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اس کی تصدیق معقول اور منقول دونوں دلائل سے ہوتی ہے۔ اہل سنت والجماعت۔ اشعری اور معتزلہ کے بعض فرقے یہ کہتے ہیں کہ اماموں کا تقرر لوگوں کی خواہش پر منحصر ہے اور ایسا واجب نہیں جو معقول ہو۔ صرف احادیث کی رو سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ معتزلہ کا ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ اماموں کا تقرر جائز ہے اگر زور بازو سے نہ ہو۔

لفظ "امام" کے معنی میں نمونہ یا مثال یا رہنما۔ جب اس کا اطلاق بوقت صلوة ہوتا ہے تو مراد وہ شخص جس کے پیچھے مقتدی نماز ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کا اصل مفہوم وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے خلیفہ یا نائب رسول اللہ مقرر کیا جائے۔ بعض اوقات اس کا اطلاق خود رسول اللہ پر بھی ہوا ہے۔ اکثر احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ امام کا رتبہ نبی سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کو نبوت پہلے عطا ہوئی اور امامت بعد میں۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ

"انی جاعلک للناس اماماً (۲/۱۵)

بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ امام وہ شخص ہے جس کو اللہ حکومت دینی اور دنیوی امور میں عطا فرمائے اور وہ نبی ہی کی مثل ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نبی کو تو بلا واسطہ اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے جو لوگوں کو بتاتا ہے اور امام نبی کے ذریعہ کلام کرتا ہے۔

لیکن یہ امتیاز بمشکل قائم رہ سکتا ہے کیونکہ پانچ الوالعزم انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کے احکامات کو وہ انبیاء جو ان کے بعد آتے لوگوں تک پہنچاتے رہے (یہ پانچ نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد ہیں) اور اکثر احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے اماموں کو بلا واسطہ روح القدس کی منجانب اللہ تائید حاصل تھی

اس لئے جو کچھ اوصاف آنحضرتؐ میں پائے جاتے ہیں وہ اماموں میں بھی ہیں۔ مثلاً بدی کارفع کرنا، شریعت کی محافظت، لوگوں کو اطاعت پر مائل کرنا اور ان سے ظلم کو دور کرنا اور اپنے بعد جانشین امام کے حق میں حکم خدا و صیبت کرنا۔ یہ امر کہ امام کی اقامت واجب ہے۔ اس پر سید مرتضیٰ نے "شافی" میں اور شیخ طوسی نے "تلخیص" میں بہت دلائل پیش کئے ہیں۔ ہم بھی اسی کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

تقاضا رحمت باری تعالیٰ | تقاضا رحمت اللہی یہ ہے کہ اپنے بندوں پر جو بھی بہتر شے ہے ارزانی فرماتا ہے (مجلسی

نے رحمت پروردگار پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ امام کا وجود واجب ہے۔ یہ تو معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جہاں ایک جماعت ہوگی وہاں ان کے حقوق اور حقوق کی حفاظت کا سوال بھی پیدا ہوگا اس لئے ایک شخص ایسا ہونا چاہیے جس کا وہ حکم بانی اور امن سے رہیں۔

محافظ شریعت | شریعت یعنی احکام رسول خدا کی حفاظت واجب ہے تاکہ اس میں تحریف لفظی و معنوی نہ ہو۔ اس میں کمی بیشی

نہ ہو۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو۔ آیات قرآن مجمل ہیں اور اکثر احکام کا مفہوم واضح نہیں۔ اس لئے واجب ہے کہ کوئی شخص نامور من اللہ مسائل شرعیہ کا مفصل استنباط آیات سے کرے۔ یہی وہ بات تھی جو رسول خدا بوقت وفات بتانا چاہتے تھے اور قلم اور دوات طلب فرمائی مگر عمرؓ نے روک دیا اور کہا کہ آپؐ ہدیٰ میں ہیں۔ قرآن ہمارے لئے کافی ہے (حبنا کتاب اللہ) حالانکہ رسول خدا ﷺ چاہتے تھے تاکہ امت آپ کے بعد گمراہ نہ ہو۔ یہ عمرؓ تھا جس نے روک دیا۔ حالانکہ وہ قرآن کی ایک آیت سے بھی واقف نہ تھا اور وہ اس کا دوست ابو بکرؓ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی علیؓ کے پاس چھپ کے آتے اور وہ ان کی مشکل کشائی کر دیتے۔ خود سنیوں کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ستر دفعہ عمرؓ

نے کہا کہ :-

”اگر علی نہ ہوتا تو عمر ملاق ہو گیا ہوتا“

”اگر کتاب اللہ کافی ہوتی تو ان میں جو اسے ملتے ہیں اختلاف کثیر ہی کیوں ہوتا؟
مثلاً ایک آیت ہے کہ

”اتما انت منذر وکل قوم ہاد“ (۱۳)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”منذر“ اور ”ہادی“ ایک ہی شخصیت ہے لیکن بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ ”تو ڈرانے والا ہے اور ہر ایک قوم میں ہادی ہوتا ہے“۔
بہر حال ہدایت عذاب سے ڈرانے پر منحصر سہی۔ یہ تو واضح ہے کہ کوئی زمانہ امام سے
خالی نہیں ہوتا۔ بصائر الدرجات میں امام باقر سے مروی ہے کہ

”منذر تو رسولؐ بخدا ہیں اور آپ کے بعد ہر ایک زمانہ میں ہم میں سے
ایک ہادی ہے جو لوگوں کو قرآن کی طرف دعوت دیتا رہے گا۔ اور بعد وقت
آنحضرتؐ ہادی علیؑ ابن ابی طالب اور آپ کے بعد وہ امام جو جانشین
ہوتے۔ اور یکے بعد دیگرے تار و زقیا مت یہ سلسلہ جاری رہے گا“

ابن بویہ نے ”کمال الدین“ میں لکھا ہے کہ

”امام باقر نے آیت ”یکل قوم ہاد“ کی یہ تفسیر کی کہ اشارہ امام کی طرف
ہے جو ہر ایک زمانہ میں لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور ہوتا ہے“۔

دوسری مثال یہ آیت ہے کہ

”ولقد وصلنا بہم القول لعلم یتذکرون“ (۱۴)

اکثر مفسرین یہ تفسیر کرتے ہیں کہ

”اللہ تعالیٰ نے آیات یکے بعد دیگرے اور اسی طرح واقعات اور

نصائح اور امثال وغیرہ ملتے جلتے بیان فرمائے تاکہ لوگوں میں فہم پیدا ہو
اور اچھے برے میں تمیز کر سکیں“۔

لیکن اہل بیت کے ذریعے جو احادیث روایت ہوئی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ

حقیقی مفہوم یہ ہے کہ امام کے بعد دیگرے آتے رہیں گے۔

ابن بابویہ نے مجالس اور کنال الدین میں روایت امام زین العابدین سے کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

”ہم لوگ مسلمانوں کے ہادی اور حجۃ اللہ ہیں اور ہماری ہی شفاعت

پر شیعان جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں

ایسے چمک دار ہوں گے گویا نور سے دھوئے ہیں۔ بحیثیت ہادی مومنین

ہم اللہ تعالیٰ کے غضب سے لوگوں کو بچائیں گے۔ جب تک ستارے

آسمان کی حفاظت کرتے ہیں زمین پر جب تک ہم ہیں روز قیامت قائم

نہ ہوگا اور نہ عذاب نازل ہوگا۔ لیکن جب ہم زمین پر نہ ہوں گے تو ہلاکت

کے آثار روئے زمین پر ظاہر ہوں گے۔ ستارے جھڑ جائیں گے یہ آسمانوں

کے خاتمہ کا نشان ہوگا۔

اور یہ بھی فرمایا کہ

”ہم وہ ہیں کہ ہمارے ذریعہ سے آسمان قائم ہیں۔ اگر ہم نہ ہوں تو آسمان

گر پڑے اور تمام اہل زمین ہلاک ہو جائیں اور یہ ہماری ہی برکت کی وجہ

سے ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین پر مینہ برساتا ہے اور رحمت فرماتا ہے اور

زمین اپنی نعمتیں دیتی ہے۔ اگر کوئی امام روئے زمین پر نہ ہو تو طبقات زمین

متضاد ہوں اور تمام اہل زمین ہلاک ہو جائیں گے۔“

اس لئے دیکھو کہ آدم سے تا ایں دم زمین کبھی حجۃ اللہ یا ناسدہ سے خالی نہیں رہی خواہ

۱۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ یہ روایت اس لئے قابل قبول نہیں کہ اس میں

خود ستاتی کے سوا اور کچھ نہیں۔ پیران نبی پر نند مریدان می پرانند ہم کہتے ہیں

کہ اس لئے صحیح نہیں کہ نانا تو یہ کہتا ہے کہ لا اقول کم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب

ولا اقول کم اتی ملکت ان اتبع الا ما یوحی الی (ک) (باقی حاشیہ صفحہ ۹۷ پر)

یہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ بہر حال زمین پر خدا کا شاہد ہمیشہ موجود رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ اگر حجۃ اللہ زمین پر نہ ہو۔ اللہ کی عبادت بھی کوئی نہ کرے گا۔ کیونکہ امام ہی ان کو عبادت کا طریقہ تعلیم کرے گا۔

اس عقیدہ امامت اور امام کے بعد مشکل یہ پیش آئی کہ اگر کسی وقت امام موجود نہ ہو۔ تو ظاہر ہے کہ نظام عالم درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ اس کا حل "مجلسی" حسب ذیل بتاتا ہے کہ:-

"امام زین العابدین سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر حجۃ اللہ غائب یا پوشیدہ ہو تو لوگ اس کی تعلیم وغیرہ سے کیسے مستفیض ہو سکتے ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا کہ اسی طرح جس طرح سورج بادلوں میں پوشیدہ ہے اپنا فیض پہنچا رہا ہے۔"

مجلسی کہتا ہے کہ خواہ امام غائب ہو اہل زمین کو اس کا فیض پہنچا رہتا ہے۔ وہ لوگوں سے مل کر بھی ان کو راہ راست پر لاتا ہے اگرچہ ان کو شور نہیں ہوتا کہ یہی امام ہے جس کو ان کا انتظار تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اگر وہ ظاہر ہو تو جو منتظر ہیں اس کی امامت تسلیم نہ کریں تو اور گنہگار ہوں۔ اور اگر ظاہر ہو اور اس کو تسلیم بھی کر لیں۔ تو رافضی جہاد وغیرہ سے جی چرائیں۔ جس کا حکم وہ دے تو کہیں کے نہ رہے۔ اس لئے امام کا غائب رہنا ہی ان کے جی میں بہتر ہوگا۔ علاوہ ازیں ایسی آنکھیں جنہوں نے اس کو نہیں دیکھا تو اس کے جلال کی تاب نہ لائیں جس طرح سورج کو دیکھنے سے آنکھیں پھیرے اور دنیا سے بوجاتی ہے بادشاہ اور امراء کا تو اس پر ایمان ہے کہ امام منتظر تشریف لائے گا لیکن جب وہ جاتے اور اس کا اقرار کریں تو ایمان بھی گیا۔ جبکہ وہ امیر فقیر کو ایک سطح پر رکھے جیسا کہ پیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زبیر کو وہ کچھ دیا جو ایک غلام کو دیا تھا۔ تو انہوں نے بغاوت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۶ "لیس لہ من دوقہ ولی ولا بشقیہ اعلمہ متقون"

(۱۳) لا املک نفسی نقلاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ ولو کنت اعلم الغیب ان تکثرت من الخیر وما حسنی السویہ (۹) انما الالبس مثلم۔

کی ان کیلئے یہی کافی ہے کہ امام کی موجودگی واجب ہے خواہ ظاہر ہو یا غائب، اس پر ایمان انہیں ضرور نفع دے گا۔

ضرورت امام پر مجلسی نے طویل بحث کی ہے۔ یہ بھی لکھتا ہے کہ

امام کا تقریر یا تو اللہ کی طرف سے یا نبی کی جانب سے واجب ہے

اس لئے واجب ہے کہ ہر ایک امام اپنا جانشین خود نامزد کرے۔

عباسی کہتے ہیں کہ امامت یا نامزدگی یا وراثتاً ہی صحیح ہے۔ اور تمام مستی اس امر پر متفق ہیں کہ یا تو بذریعہ انتخاب یا نامزدگی درست ہے۔ لیکن ان کے عقائد کے خلاف بے شمار برہان ہیں۔

(۱)۔ امام کا معصوم ہونا واجب ہے اور عصمت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اللہ ہی پر اس کا تقرر لازم ہے۔

(۲) تاریخی واقعات سے اہل عقل پر واضح ہو چکا ہے کہ اگر حکمران مستقل مزاج،

مضبوط دل و گروہ کا آدمی نہ ہو تو نظام و انتظام بگڑ جاتا ہے۔ لوگ قانون شکنی

پر اتر آتے ہیں اور فتنہ و فساد روتا ہوتا ہے۔ لیکن "اللہ فساد پسند نہیں فرماتا"

جب اللہ فساد پسند نہیں فرماتا تو ضرور ہے کہ سبب اب بھی کرے لیکن یہ اسی

صورت میں ممکن ہے کہ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو جو فساد پیدا نہ ہونے

دے اور اگر ہو تو رفع کرے۔ ایسا آدمی امام ہے۔

(۳) اللہ کی رحمت کاملہ کا تقاضہ ہے کہ اس نے رسول مبعوث فرمایا اور چھوٹی

سے چھوٹی بات بھی نہیں جو بذریعہ رسول بیان نہ کی ہو۔ مثلاً لباس اور جسم کی

پاکیزگی، وضو اور تیمم وغیرہ۔ لیکن ضرور ہے کہ احکام شریعت جو رسول خدا کے ذریعہ

ہمیں ملے، اس کی حفاظت بھی ہو۔ اس کا محافظ امام ہے۔

(۴) چوتھی دلیل یہ ہے جس پر سنیوں کا بھی اتفاق ہے کہ آدمی اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

انتیاءرگانہ دستور رہا ہے کہ اپنا جانشین مقرر کرتے رہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب

مدینہ سے مکہ کی طرف جاتے تو کسی کو مدینہ میں اپنا جانشین چھوڑ جاتے۔ اعمال

اور دیگر اولی الامر کا تقرر بھی آنحضرتؐ کی قائم مقامی ہی ہے اس لئے یہ کتب باور ہو سکتا ہے کہ اُن حضرتؑ اپنے بعد کسی کو نامزد نہ فرماتے۔ (جسے نامزد فرمایا وہ علیؑ ابن ابی طالب ہے)

(۵) اگر لوگوں پر امام کا تقرر چھوڑ دیا جائے تو ہر ایک اپنی محدود عقل کے مطابق جسے چاہے مقرر کر سکتا ہے۔ امامت اور نبوت ایک ہی جیسی ہے۔ اگر امام کا تقرر لوگ کریں تو نبی کو بھی اپنے میں سے منتخب کر سکتے ہیں۔

(۶) اگر انتخاب لوگوں پر چھوڑ دیا جائے تو لوگ غلطی سے پاک نہیں اس لئے ممکن ہے کہ وہ غلط انتخاب کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدائیں جس کا انتخاب ہو وہ اچھا ہی ہو مگر عموماً دیکھا گیا ہے کہ جب حکومت ہاتھ آتی ہے تو ظلم و غیرہ پر اُتر آتے ہیں۔ اس لئے امام ایسا ہونا چاہیے جس سے غلطی کا امکان نہ ہو۔ اور ایسے شخص کو اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور وہی منتخب بھی فرماتا ہے۔

(۸) بالفرض اگر امام جس کو ایک جماعت منتخب کرے بہرہ و وجوہ موزوں بھی ہو ممکن ہے کہ دوسری جماعت کسی وجہ سے تسلیم نہ کرے تو دونوں میں لڑائی جھگڑا ہو گا لیکن اگر خدا سے مقرر کرے تو اس کی مدد بھی کرے گا اور دشمنوں کو نیچا دکھائے گا۔ جیسے نبی کے مقابلہ میں کفار کو شکست دیتا رہا ہے۔

تسلیم کر لیا جائے کہ امام اور نبی میں کچھ فرق نہیں تو مجلسی کے دلائل نہایت دقیق و مضبوط ہیں۔ غالباً سنی بھی مرعوب ہو کر ہمنوا ہو گئے۔ بحکم الدین السنفی نے عنایتِ اہل سنت و الجماعت پر جو کچھ لکھا اس کی شرح سعد الدین تفتازانی نے کی خلافت و امامت کے تحت سنفی لکھتا ہے کہ:

آنحضرتؐ کے بعد بہترین خلائق صدیق اکبر اور آپ کے بعد عمر فاروق اعظم اور آپ کے بعد عثمان ذی النورین اور آپ کے بعد علی مرتضیٰ اسی ترتیب سے ہیں۔ ان کی خلافت تیس سال رہی، ان کے بعد بلوک اور امر ہوئے۔

”واجب ہے کہ امت مسلمہ میں کوئی امام ہو جو صاحبِ نظم و نسق ہو اور خداوند
سے تجاوز نہ کرنے دے جو ممالک اسلامیہ کی سرحدات کا محافظ ہو جو دشمنانِ دین و
ملت کے مقابلہ کے لئے لشکر آراستہ کرنے، زکوٰۃ اور خیرات اور صدقات وصول
کریے اور آئین شکن لوگوں کو کوتاہ دست کریے۔ اور صلوٰۃ بالخصوص صلوٰۃ یوم الجمعہ
ادا کریے۔ اور تنازعات باہمی کا تصفیہ کریے۔ مالِ غنیمت تقسیم کریے اور یتیموں اور
یتامی کا مناسب انتظام دربارہ نکاح وغیرہ کریے۔“

”واجب ہے کہ امام ظاہر ہو، نہ کہ غائب یا منظر آدر واجب ہے کہ قبیلہ قریش
سے ہو، ضرور نہیں کہ ہاشمی ہو۔ ضرور نہیں کہ اولادِ علی سے ہو۔ ضرور نہیں کہ وہ معصوم
عن الخطا ہو اور نہ یہ ضرور ہے کہ وہ بلحاظ تقویٰ بہترین ہو۔ لیکن ضرور ہے کہ وہ آزاد
ہو اور اسے کامل اختیار حکومت ہو۔ امام محض کسی بدی کے ارتکاب یا ظلم کی وجہ
سے معزول نہیں ہو سکتا۔“

موجودہ عقیدہ اہلسنت والجماعت ہے کہ ”ضرور نہیں کہ وہ قبیلہ قریش سے ہو۔“
امام کے جو فرائض نسفی نے بیان کئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ خلافت کی تعریف
کر رہا ہے مگر اس خیال سے کہ خلافت صرف تیس برس رہی۔ ان کو خلیفہ نہیں کہتا
بعد میں جو بھی ہوتے وہ ملوک یا امرا یا امام ہوتے۔ مگر یہ سب صاحبِ حکومت ہی
تھے۔ اگر امامت کو صرف دینی حکومت تک محدود کر دیا جائے تو ہر ایک مسجد کا ملا
امام ہے۔ خواہ یہ فقیر، مدرسہ یا مجتہد بلحاظ مدارس ہو۔ لیکن اس کو صرف قبیلہ قریش
میں محدود کرنا کئی مشکلات کا موجب ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین یا مذہب
حکومت کا خادم ہو کر رہ جائے گا۔

امامت کے بارے میں مسلمانوں کے دو بڑے مذاہب کے اکابر کا عقیدہ ہم نے
واضح کر دیا۔ اب ہم دونوں کے عقائد کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور ان پر
علمی بحث بھی کریں گے۔

بلاشبہ ”امامت“ نصِ قرآنی سے حضرت ابراہیمؑ کے حق میں ثابت شدہ حقیقت

”انی جاعلک للناس اماماً“

لیکن یہ حقیقت ذہن نشین کرنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کو امام و صفیاً بلحاظ ایمان و عمل بنایا گیا نہ کہ نسباً۔ آپ کا باپ آذر مشرک تھا اور محمدؐ بیٹے کی دعائے مغفرت بھی اس کے حق میں قبول نہ ہوئی۔

ارشاد قرآن ہے کہ:

”قد كانت لکما سورة حسنة فی ابراهیم والذین معه..... الا
قول ابراهیم لا بیبراد استغفرون لک وما املک من اللہ من
شئی“ (۲۸/۲)

”تحقیق تمہارے لئے ابراہیمؑ میں ایک نمونہ ہے اور ان میں جن کو اس کی معیت حاصل ہے..... مگر اس قول ابراہیمؑ میں نہیں کہ اپنے باپ سے کہا کہ میں ضرور تیرے لئے مغفرت مانوں گا۔ ویسے اللہ کے ساتھ میرا کچھ زور تو چلتا نہیں۔“

نصوص قرآنی سے امامت کے بارے میں چند اصولی باتیں بالکل صاف ہیں۔

۱۔ ہر ایک شخص صاحب ایمان و عمل و صفیاً امام ہو سکتا ہے نہ کہ نسباً۔ اگر نسباً امامت ہوتی تو نہ صرف حضرت ابراہیمؑ کا والد امام ہوتا بلکہ آپ کی ذریت بھی ہوتی خواہ وہ ظالم ہی ہوتے۔

۲۔ ہر ایک امام کا اتباع علی بصیرت ہی جائز ہے نہ کہ اس کی بشری شخصیت کا یعنی کور کورانہ تقلید نا جائز ہے۔ اتباع ”ما انزل اللہ“ علی بصیرت واجب ہے کسی بشری شخصیت کا اتباع شرک ہے۔

۳۔ امامت کوئی موروثی منصب نہیں، و صفیاً ہر ایک شخص ہو سکتا ہے۔

۴۔ امام معصوم عن الخطا برگز نہیں ہوتا اور محض خطا مانع منصب امامت نہیں۔

۵۔ یہ ضرور نہیں کہ امام کی ہر ایک بات قابل قبول ہو۔ ہر ایک نامعقول بات رد کرنی چاہیے خواہ کسی نبی سے منسوب کی گئی ہو اور ہر ایک معقول بات تسلیم کرنی

چاہیے۔ خواہ وہ کسی نبی سے منسوب نہ ہو۔

آیات محولہ بالا (عجل) سے توضیح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی امامت مسلّمہ ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ آپ کا اتباع ہر ایک قول میں کیا جائے۔ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کن باتوں میں اتباع کرنا چاہیے اور کن باتوں میں نہیں کرنا چاہیے؟ لیکن اس کا مفصل جواب قرآن میں موجود ہے۔ اس لئے اس پر بحث تکمیل حاصل ہے ارشاد قرآن ہے کہ

”فبشر عباده الذين يستقون القلب فيتبعون احسن ما اوليت اذین
هداهم اللہ واولیک ہما اولوا البابہ (عجل)۔“

”پس ہمارے بندوں کو بشارت دو جو کلام کان و دھر کر سنتے ہیں اور اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں۔ وہی ہیں جن کو اللہ ہدایت فرماتا ہے۔ اور وہی عقل مند بھی ہیں۔“

نیز ارشاد ہے کہ

”یجعل التّجسس علی الذّین لا یعقلون (عجل)۔“

”جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ اللہ ان کی ذہنیت گندی بنا دیتا ہے۔“
نبی ہو یا رسول یا امام یا کوئی مصلح ہمیشہ دعوت الی الخیر دے گا۔ ہمارے پاس پرکھے کا ذریعہ صرف بصیرت ہے۔ اس لئے جب ہم کسی کا اتباع کریں تو اس کی بشری شخصیت کا نہیں کرتے بلکہ حق کا کرتے ہیں۔

ارشاد قرآن ہے کہ

”قل هذا سبیلی ادعوا لی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعتی و سبحان اللہ وما انا من المشرکین (عجل)۔“

”کہو کہ یہ ہے میرا طریق کہ اللہ کی طرف دعوت علی بصیرت دیتا ہوں۔ میں اور وہ بھی جو میرا اتباع کرتا ہے اور سبحان اللہ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں (جو اللہ کو چھوڑ کر شخصیت کا اتباع کرتے ہیں)۔“

نیز ارشاد ہے کہ

وَأَذِّنْ لِلَّذِينَ إِذْأَذَكَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخْرُجُوا عَلَيْهَا حَتْمًا وَعَمِيَانًا ه (۱۹)

اور (اللہ کے بندے) وہ ہیں کہ جب ان پر ہماری آیات سنائی جائیں تو انہیں

اور بہرے ہو کر ان پر نہ گریں (کوہ کو روانہ تعلقید کریں)

جو شخص کسی بشری شخصیت کا اتباع من دون اللہ کرتا ہے وہ آیت اللہ کے

تحت مشرک ہے۔ اس قسم کا اتباع اور اطاعت وہی لوگ کرتے ہیں جن کی ذمہ داری

انتہائی ہست ہوتی ہے اور وہ بندوں کی بندگی کرتے ہیں اور ان کے گن گاتے ہیں

جن کا کھاتے ہیں۔

امانیہ کے جتنے فرقے ہیں وہ سب امام کو معصوم عن الخطا یقین کرتے ہیں ،

اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ جب ایک دفعہ یہ عقیدہ پختہ ہو گیا تو ظاہر ہے کہ امام

جو کچھ بھی کہے گا وہ عین صواب ہی ہو گا۔ اس لئے اتباع امام بے چون و چرا ہی کرنا پڑے

گا۔ لیکن ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ سستی بھی انبیاء کو معصوم عن الخطا

یقین کرتے ہیں۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ بہت عرصہ بعد سستیوں کے

مذہب میں داخل ہوا۔ مجلسی کہتا ہے کہ منصب امامت رسالت اور نبوت سے بھی

افضل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ منصب نبوت و رسالت کے بعد ہی ملا۔ اگرچہ یہ دعویٰ

محل نظر ہے مگر سروسٹ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم امامت پر تاریخی نقطہ

نظر سے بحث کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی امامت برائے نص قرآن ثابت شدہ حقیقت ہے۔ لیکن

آپ کو یہ منصب اس وقت ملا جب آپ کی آزمائش ایمان و عمل پوری طرح ہوئی۔

”وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ

إِمَامًا ۖ قَالَ وَمَنْ ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنْبَغُ لَكَ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ه (۱۰)

”جب ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے ان باتوں میں آزمایا جو امامت کے لئے ضروری

ہیں، اور وہ امتحان میں پورے اترے تو فرمایا کہ میں تجھے لوگوں کا امام مقرر کرتا ہوں۔

یہ تقاضائے بشریت عرض کی کہ یہ منصب موروثی ہوگا اور میری ذریت بھی
 فرمایا کہ ہمارا عہد ظالموں تک نہیں پہنچتا۔
 ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ امامت کوئی موروثی عہدہ نہیں۔ اس کا
 استحقاق چند شرائط سے وابستہ ہے۔

۱۔ اول یہ کہ "قلب سلیم" ہو (اذ جاہد ربہ بقلب سلیم۔ یعنی اور یہ کہ اس کے
 ایمان و عمل کا امتحان ہو چکا ہو۔ یہ اوصاف "امامیہ" کے اکثر فرقے بھی تسلیم کرتے ہیں
 ان اوصاف کے ہوتے اگر کوئی شخص کسی امام کا بیٹا بھی ہو تو اس کا تقرر بھی ہو سکتا ہے
 یہ امر کہ وہ صرف ایک امام کا بیٹا ہے کوئی قابلیت نہیں۔ لیکن اگر اس میں شرائط
 امامت پائی جاتیں تو وہ ایسا ہی مستحق ہے جیسے اور لائق افراد امامت۔ یہ تو نامعقول
 بات ہے۔ کہ ایک ہمہ وجوہ لائق آدمی اس لئے محروم ہے کہ اس کا باپ امام تھا۔
 حضرت عمرؓ نے جب تقرر خلافت شوریٰ کے ہاتھ میں دے دیا تو یہ بھی کہا کہ میرا بیٹا
 چالیسین تہ ہوگا۔ البتہ شوریٰ میں شامل رہے گا۔ حضرت عمرؓ نے دورانہ شیشی سے کام
 لیا۔ آپ کو یہ ڈر تھا کہ یہ عہدہ یا منصب موروثی نہ ہو جائے۔ اور عقیدت شرائط قابلیت
 نظر انداز کر دے۔ آیہ استخلاف میں بھی ایمان و عمل صالح شرط ہے۔ اس میں کوئی
 شرائط ایسی نہیں کہ کسی خاص خاندان میں امامت محدود کی جائے۔ اگر نفسیات کے
 نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ شیعیان علیؓ نے محض عقیدت اور محبت
 اولاد علیؓ کی وجہ سے امامت آپ کے خاندان میں مخصوص کی۔ ہم اس موضوع پر
 ایک اور پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

لفظ "امام" مشتق ہے "ام" سے۔ جس کا مفہوم ہر ایک شے کی اصل ہے
 مثلاً "ام الکتاب" ایسی کتاب ہے جس سے تمام انسانی علوم جو کتب میں درج
 ہیں ماخوذ ہیں۔ یہ صحیفہ فطرت ہے۔ لاریب فیہ۔ "ام القری" کوئی مرکزی بستی
 یا ایسی بستی جو لحاظ تجارت وغیرہ خاص یا مشہور شہر ہو۔ جیسے عرب میں مکہ معظمہ۔
 لفظ "امت" بھی ایسی سے مشتق ہے۔ ایسی جماعت جس کی اصل ایک ہی ہو جب

اس کا اطلاق کسی ایک شخص پر ہو تو مفہوم یہ ہے کہ امت یا جماعت کے افراد میں جو بات یا امتیازی خصوصیت فرداً فرداً پائی جاتی ہے وہ بہیئت مجموعی اس ایک شخص میں موجود ہے یا یہ کہ جماعت کی قوت کی اصل اس شخص میں پائی جاتی ہے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت ارشاد ہے کہ:-

”ان ابراہیم کان امة قانتا لله“

امام رابع لکھتا ہے کہ

عبادت الہی میں قائم مقام جماعت، یعنی بلحاظ عبادت ابراہیمؑ میں وہ سب خوبیاں ہیں جو ایک جماعت میں بہیئت مجموعی مشاہدہ ہو سکتی ہیں:-

چونکہ ”ملت“ کی اصل حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوئی اس لئے جو بھی اس ملت کا اتباع کرتا ہے وہ امت ابراہیمی میں داخل ہے۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ کو امام کا لقب عطا ہوا۔ یہ لفظ بھی ”ام“ سے مشتق ہے۔ امام ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کسی امت یا جماعت کا رہنما یا پیشوا ہو۔ اس لئے اس کا اطلاق ہر ایسے شخص پر ہوتا ہے جو کسی جماعت کی رہنمائی کسی مقصد کے لئے کر رہا ہو۔ بلحاظ اس امر کہ یہ مقصدی نفسہ اچھا یا بُرا ہے۔ بڑوں کے بھی امام ہوتے ہیں جیسے اچھوں کے۔ زیر بحث صرف امامت ایسی جماعت کی ہے جو دین اسلام میں کسی جماعت کا امام ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسا امام کون ہو سکتا ہے؟

ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ شخصیت بہ نص قرآن حضرت ابراہیمؑ کی ہے۔ اور یہی جب تک اسلام زندہ ہے امام رہیں گے۔ باقی خواہ آپ کی ذریت ہو یا غیر ذریت بشرطیکہ مومن صالح ہوں اور ظالم نہ ہوں بالمتبع امام ہیں۔ اور ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی بروئے نص قرآن اصل امام نہیں خواہ یہ موسیٰ یا عیسیٰ ہو خود آنحضرتؐ کو ارشاد الہی ہے کہ:-

”شداوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراہیم حنیفا وماکان

من المشركين : (۱۳۲)

”پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ملت ابراہیم کا اتباع کرو جو ایک ہی اللہ کا پورا پورا تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔“

یہود و نصاریٰ کے بارے میں ارشاد ہے کہ

”وقالوا حسودا و نضری تہتدوا قل بل ملة ابراهيم

حنيفا (۱۳۳)

”اور یہود کہتے ہیں کہ یہودی اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیحی ہو جاؤ تو راہ راست پر آؤ۔ کہو کہ نہیں بلکہ اصل ہدایت ملت ابراہیم ہے۔ وہ جو ایک ہی اللہ کا پورا پورا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔“

”ومن یرغب عن ملة ابراهيم الا من سفه نفسه طوقدا صطیفة
فی الدنیا و اخرہ فی الاخرة لمن الصالحین ؕ (۱۳۴)

”اور کون ہے جو ملت ابراہیم سے انحراف کرے مگر وہی جس کی عقل ماری گئی ہو اور بے شک ہم نے اس کو دنیا میں بھی منتخب کر لیا اور آخرت میں بھی وہ نیکوں میں سے ہے۔“

”قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا طوما كان من
المشركين ؕ (۱۳۵)

”کہو کہ اللہ کا ارشاد سچ ہے اس لئے ملت ابراہیم کا اتباع کرو جو ایک ہی اللہ والا تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔“

اسلام نام بھی حضرت ابراہیم کا تجویز کردہ ہے جس پر صریح قرآن نے بھی
ثبت کر دی۔

Thesis

”وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملة ابراهيم طھو ستمکم
المسلمین ؕ من قبل و فی هذا لیکون الرسول شهیدا علیکم و تكونوا
شھدا علی الناس : (۱۳۶)

”دین کے بارے میں ہم نے تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی۔ اور یہ ملت
ابراہیم ہے جو (اسے ذریت ابراہیم) تمہارا مورث اعلیٰ تھا اس نے تمہارا نام
مسلمان رکھا اور قرآن میں بھی یہی برقرار رکھا گیا اس لئے کہ اس کی شہادت
رسول تم پر دے اور تم دنیا جہاں کے لوگوں پر شہادت دو۔“

”وَمِنَ احْسَنِ دِيْنًا قَمْتَنَ اسْلَمَ وَجْهَهُ لَلّٰهِ وَهُوَ مَحْسَنٌ وَّاَتَّبِعْ مِلَّةَ
ابْرٰهِيْمَ حَنِيفًا وَّاَتَّخِذْ اِلٰهًا اِبْرٰهِيْمًا حَلِيْمًا (۲۱۳)“

”اور اس شخص سے کس کا دین بہتر ہے جس نے اللہ کے حضور سر تسلیم
خم کر دیا اور وہ مومن بھی ہے اور یہ ملت ابراہیم ہے اسی کا اتباع کرتا ہے جو ایک
ہی اللہ والا تھا اور ابراہیم کو اللہ نے اپنا مخلص قرار دیا۔
امامت کے بارے میں قطعی فیصلہ یہ ہے کہ

”وَاِذَا بَيَّنَّا اِبْرٰهِيْمَ رَبَّهُ بِكَلِمَاتٍ فَاتَّبَعْنٰهُ نَهْتًا وَّاَقَالَ اتَّبِعُوا مِلَّةَ
اٰمَانًا وَّاَقَالَ وَمَنْ ذَرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يِنَالُ عَهْدِيْ الظَّالِمِيْنَ ؕ وَاِذْ جَعَلْنَا
الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاٰمَنًا وَّاَتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مَوْصِلًا (۲۱۴)
” اور ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور جہانے امن ٹھہرایا اور حکم دیا کہ
ابراہیم کے مقام کو جائے نماز مقرر رکھو۔“

تمام آیات محولہ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ امامت حضرت ابراہیم کو عطا ہوئی
اس لئے آپ کے بعد جو بھی اس ملت ابراہیم کا اتباع کرنے والے ہیں خواہ نبی اور
رسول ہی کیوں نہ ہوں سب کے امام حضرت ابراہیم ہی ہیں۔

امتنان
ممكن ہے کہ بعض اشخاص کو کچھ غلط فہمی ہو یا پیدا کریں۔ اس لئے
یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہئے کہ خود حضرت ابراہیم

کی بشری شخصیت قابل اتباع نہیں۔ آپ کی ملت ہی قابل اتباع ہے۔ خود
حضرت ابراہیم حضرت نوح کے پیرو تھے۔

”وَاتَّخِذْ مِنْ شٰيْعَتِهِ اِبْرٰهِيْمًا (۲۱۳)“

”اور نوح کے طریق پر چلنے والا ایک ابراہیم بھی تھا۔“

ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علی طرح ذریت نوح سے اور بھی ہوں۔ آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ یقیناً تھے لیکن چونکہ یہ سلسلہ اب منقطع ہو چکا ہے۔ اور حضرت ابراہیم کی امامت باقی ہے اس لئے ہماری بحث کا موضوع صرف یہی ہے۔ توحید بلا شائبہ شرک صرف ملت ابراہیم میں پائی جاتی ہے۔

”دین“ ایک ہی ہے۔ اور یہ انسانی اختراع نہیں۔ ہر ایک شے کی فطرت میں ودیعت ہے۔ اور صرف عالم انسانی کا نہیں بلکہ کل کائنات کا ہے اس لئے یہ دین الحق دین اللہ ہے۔

”لَا اسلم من فی السموات والارض“

”اسی اللہ کا فرماں بردار ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے“

ملت وہ روش ہے جو حضرت ابراہیم نے دین اللہ میں اختیار کی یہ صرف انسان ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر ایک نوع کی اختلاف صورت کے ہوتے الگ الگ ہے۔

”وما من دابة فی الارض ولا طیر یطیر بجناحہ الا امم“

امثالک۔ (۱۱)

”اور جتنے حیوانات چلتے پھرتے ہیں روئے زمین پر اور پرندے جو اڑتے پھرتے ہیں یہ سب تمہاری طرح امتیں ہیں۔“

امامت اور امامت لازم و ملزوم ہیں کوئی امام بلا امت نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی جماعت یا امت بلا امام معور نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ امر بالکل صاف ہے کہ امت مسلمہ کا امام حضرت ابراہیم ہی ہیں لیکن خود حضرت ابراہیم کی دعا اور ارشاد الہی سے واضح ہوتا ہے کہ یہ منصب امامت آپ کی ذریت میں وراثتاً منتقل ہو رہا ہے اور امام وہ ہے جو آپ کی ذریت میں انبیاء اور رسول ہوتے۔ لیکن یہ سلسلہ نبوت یا دینی حکومت انحضرتؐ ”خاتم النبیین“ پر ختم ہو گیا۔

یہ حقیقت اچھی طرح دل نشین کرنی چاہیے کہ آنحضرت ﷺ سے پیشتر ملت
ابراہیمؑ صرف ذریت ابراہیمؑ کا مذہب تھا۔ اور تمام انبیاء و رسل ذریت
ابراہیمؑ کے انبیاء و رسل تھے۔ اس لئے نبوت و رسالت و امامت بھی آپ ہی
کی ذریت میں محدود رہی۔

”توراة“ میں لکھا ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ

” دنیا جہاں کی قومیں تجھ سے برکت پائیں گی“ (تکوین ۱۸)

یہ آیت ہم معنی آیت ”قال انی جا علیک الناس اماما (۱۶) کے ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ
کل عالم انسانی کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے۔

”انی رسول اللہ ابعکم جمیعاً ناذی الہ ملک السموات والارض (۹)

دینی حکومت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ختم ہو گئی۔ صرف
امامت رہ گئی۔ اور اب ذریت ابراہیمؑ میں محدود نہ رہی جیسا کہ ملت ابراہیمؑ
ذریت ابراہیمؑ میں محدود نہ رہی۔ امت مسلمہ میں سے ہر ایک شخص و صفاً امام ہو
سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلے بھی و صفاً ہی ذریت ابراہیمؑ میں امام ہوتے۔ ایام
جاہلیت کی خصوصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے جب کہ قوموں میں وہ رابطہ اتحاد نہ
تھا جو اب ہے، امامت و صفاً ذریت ابراہیمؑ میں محدود رہی اور اس کا فائدہ
کسی دوسری قوم کو نہ پہنچا۔

شیعانِ علیؑ سب سے پہلا فرقہ جو امت مسلمہ میں پیدا ہوا وہ شیعانِ علی رضی
کا ہے۔ اور حضرت علیؑ کی زندگی ہی میں دوسرا فرقہ جو شیعان

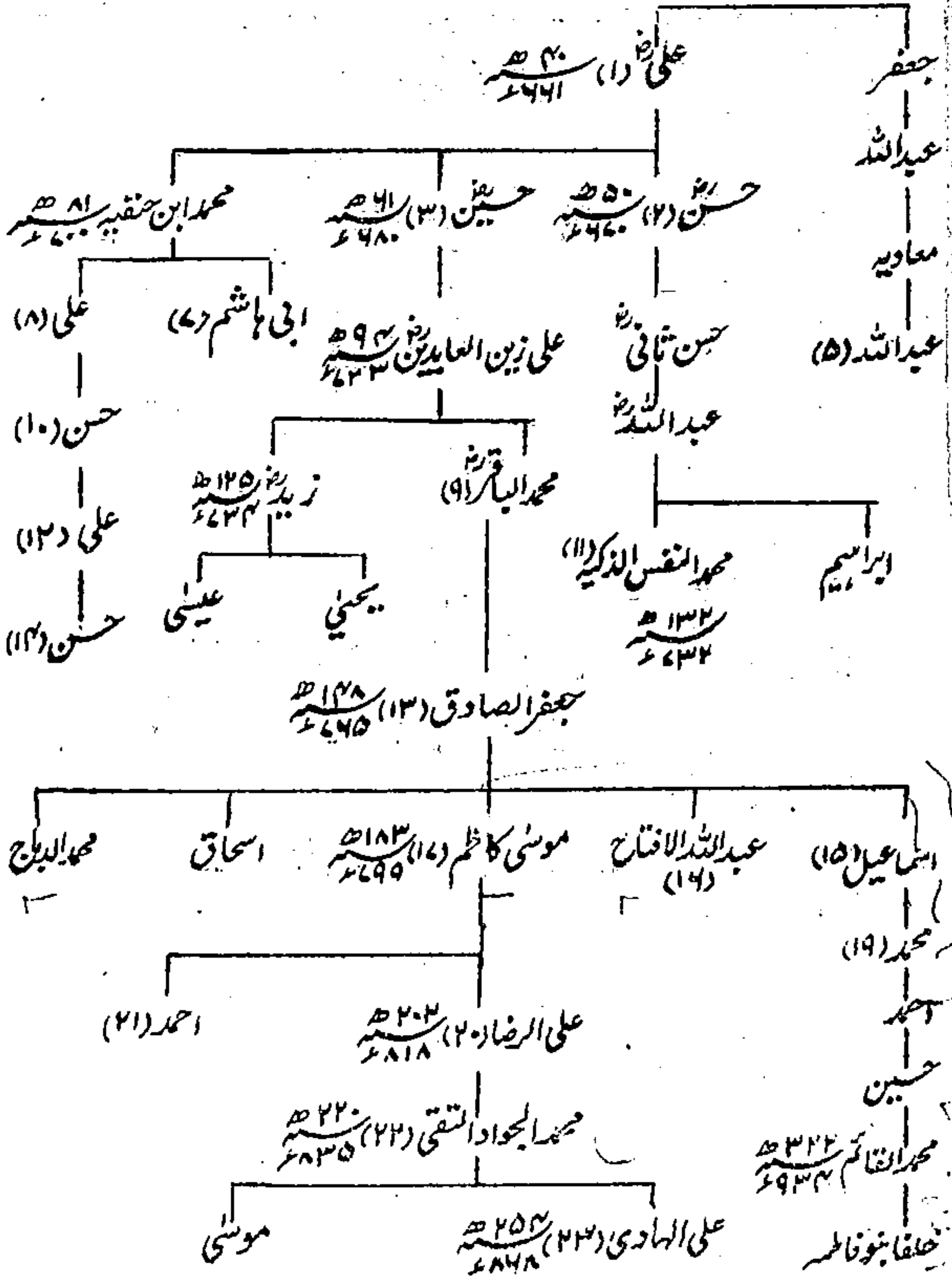
علیؑ سے علیحدہ ہو گیا ”خواارج“ کے نام سے مشہور ہے۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ دونوں سیاسی فرقے ہیں۔ اور سیاسی الجھن کی پیداوار
ہیں۔ اور دونوں خلافت کی گتھی کو سلجھاتے رہے ہیں اور خلافت ہی ان کے

امت یازی عقائد کا سنگ بنیاد ہے۔ بعد میں جو کچھ عقائد کی عمارت بلند کی اس میں
 اختلاف چند فقہی مسائل کا ہے جو ان کے عقیدہ خلافت یا امامت کے مناسب
 ہیں۔ یعنی انہوں نے اپنے مذہب کو ایسی صورت میں ڈھالا کہ عقیدہ خلافت یا امامت
 سے لگا کھائے۔ لیکن اہل تشیع کے بھی ہزاروں فرقے بعد میں پیدا ہوئے اور ان میں سے
 معتزلہ بہت مشہور فرقہ ہے۔ معتزلہ بھی فرقہ در فرقہ ہے۔ لیکن اکثر عقیدہ در بارہ
 امامت سنیوں کے مطابق ہے کہ امامت "اختیار پر مبنی ہے نہ کہ نص اور تعیین پر۔"

شجره نسب امامان شیعہ

الوطالب



علی البادی (۲۳) ۲۵۲ھ
۶۸۴۸

جعفر (۲۶)

حسن العسكري (۲۵) ۲۴۰ھ
۶۸۶۲

محمد (۲۲)

محمد المهدي القائم (۲۷) ۲۴۰ھ
۶۸۶۲

شجره نسب خلفای عباسیه

العباس

عبدالله

علی

محمد (۲۸)

ابراہیم

منصور ابو جعفر

موسی

عبدالله السفاح

محمد المهدي

عیسی (۲۹)

Marfat.com

شیعان علیؑ دو قسم ہیں ایک وہ جو بنو فاطمہ سے وابستہ ہیں اور دوسرے جو حضرت عیسیٰؑ کی اولاد غیر بنو فاطمہ "علوی" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عقاید و بارہ امامت میں اختلاف ہے۔ شہرستانی نے اپنی کتاب "المسلل والنحل" میں ان تمام فرقوں کے ناموں کی فہرست دی ہے اور ان کے عقائد بیان کئے ہیں یہ فہرست طویل ہے ان میں سے اکثر کا اب صرف نام تذکروں میں رہ گیا ہے۔

شہرستانی فرقہ "کیسانیہ" سے شروع کرتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق کیسان حضرت علیؑ کا غلام تھا اور بقول شہرستانی تمام علوم ظاہر و باطن کی تعلیم باب مدینتہ العلم یعنی حضرت علیؑ سے بجاہ راست حاصل کی اور بعض روایات یہ ہیں کہ امام محمد حقیقہ کا شاگرد تھا۔ آخر الذکر روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ فرقہ اور اس کی بے شمار شاخیں امام محمد حقیقہ کو وہ درجہ دیتی ہیں جو عیسیائی مسیح کو۔

ان اوراق میں ہم نے مختلف مذاہب کا تذکرہ لکھا ہے۔ ان میں سے اکثر اپنے آپ کو حضرت علیؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ بلکہ ایک غیر مسلم مورخ نے یہاں تک لکھ دیا کہ

"اگر اسلام میں حضرت علیؑ کی شخصیت نہ ہوتی تو غالباً فرقہ بندی سے جو بشر انگیز تفرقہ پیدا ہوا نہ ہوتا"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے دور خلافت میں ایک سیاسی فرقہ ضرور پیدا ہوا جس کو آج شیعان علیؑ کہتے ہیں اور یہ پُر جوش حامی اہل بیت کے تھے۔ لیکن بعد میں جو عقائد ان لوگوں نے پختہ کئے اس کی ذمہ داری کسی طرح حضرت علیؑ پر عاید نہیں ہوتی۔ یہ عقاید صحیح ہوں یا غلط سردست ہماری بحث کا موضوع نہیں لیکن ہر ایک محقق مورخ کی یہی رائے ہونی چاہیے کہ حضرت علیؑ ان عقاید کے معلم اول نہیں ہیں۔ نو مسلم مجوسی اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے اور اپنے گھوٹے ہوئے اقتدار کو بحال کرنے کے لئے بہت کچھ ہر ایک دور خلافت اسلامیہ میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔

اور دین میں ایسے ٹھانسنے بھی نکالے جن میں مزدکی اور ناتوی عقائد کی آمیزش صاف پائی جاتی ہے۔ اگر یہ عقائد عین اسلامی ہوتے اور قرآن سے ان کی تصدیق ہوتی تو کچھ اور بات تھی۔ مگر یہ کیفیت نہیں ہے۔ ان لوگوں کی عرض یہ تھی کہ اس سلطنت اور زرتشتی مذہب کا احیا ہو۔ یہ تاریخی واقعات ہیں۔ اور بعض فرقوں کے حالات میں اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایرانی اپنی قومی حکومت اور مذہب کی بحالی جس طرح چاہتے کرتے۔ ان کے لئے بالکل جائز تھا لیکن جیسا کہ قاسم زادہ نے اپنی کتاب "جلوہ ریزی روح ایران" اور محسن فانی نے "دلت مذہب" میں لکھا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے لباس میں مزدکی وغیرہ مذہب کی اس میں مسلسل کوشش کرتے رہے۔ سیاسیات میں یہ بھی جائز ہے۔ بہر حال ہمارے تک ہمدردی اور متقدمین کی تحقیق ہے۔ ان مذہب سے حضرت علی مرتضیٰ کو وہ کی نسبت بھی نہیں۔

مختار یہ | ابن خلکان (مولود ۶۰۸ھ متوفی ۶۸۱ھ) اپنی کتاب "ذوقیات الاعیان" میں جو الہ جوہری کی کتاب "الصحاح" لکھتا ہے کہ "کیسان" لقب مختار بن ابی عبید اللہ ثقفی کا ہے۔ لیکن دیگر مورخین یہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت علی کا غلام تھا۔ بہر حال اس نے لوگوں کو محمد بن علی بن ابی طالب المعروف ابن الحنفیہ کی امت کی طرف دعوت دی۔

امام زین العابدینؑ اس وقت زندہ موجود تھے۔ مختار نے پہلے آپ کی طرف رجوع کیا۔ مومن کی فراست نور ہوتا ہے۔ اس کی روشنی میں مختار کی اغراض آپ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لئے صاف انکار کر دیا۔ آپ اس وقت مدینہ منورہ میں تھے۔ مسجد نبویؐ میں لوگوں کو جمع کیا اور مختار کی شرارت سے آگاہ کیا۔ اب مختار نے عبد اللہ بن زبیرؓ کی طرف رجوع کیا۔ آپ ارض حجاز میں اپنی خلافت قائم کر چکے تھے اور آپ کا بھائی مصعبؓ بصرہ میں آپ کی حکومت کو تقویت دے رہا تھا۔ یہ وقت شورش اور شوریدہ سروں کے موافق تھا۔ مختار کو فہم تھا جو شروع

سے آخر خلافت عباسیہ تک شورش کامرکز رہا۔

یزید فوت ہو چکا تھا۔ اس کے بعد معاویہ ثانی نے چند ماہ حکومت کی اور فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یزید ثانی تھا۔ اکابر اس کے پاس جمع ہوئے لیکن اس نے اس حکومت سے یزیدی کا اظہار کیا جس نے دنیا و اسلام میں شریعت کر رکھا تھا۔ کہا کہ :-

”اس خلافت کے حالات سے میں خوب واقف ہوں۔ افسوس ہے

کہ تم میں ایسے چھ آدمی بھی نہیں ہیں کہ میں خلیفہ کا انتخاب ان کے سپرد

کردوں اور ایک بھی ایسا شخص نہیں کہ اس کے حق میں وصیت کروں

تم ہی شوری ہو جس کو چاہو منتخب کر لو میں بری الذمہ ہوں۔“

اور گوشہ نشین ہو گیا۔

دنیا نے اسلام میں کئی دعویداران خلافت کھڑے ہو گئے اور طول و عرض میں

بد نظمی شائع ہو گئی۔ عبداللہ بن زبیر نے حجاز میں علم خلافت بلند کیا اور مکہ معظمہ کو

دارالمخلافت قرار دیا۔ آپ کا بھائی مصعب عراق کو زبیری خلافت میں شامل کرنا چاہتا

تھا۔ مختار ثقفی کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جس کے نام پر علم حکومت بلند کرے

وہ جانتا تھا کہ کوفہ ہی ایسی جگہ ہے جہاں اسے کامیابی کی امید ہو سکتی ہے۔ جب حضرت

زین العابدین اس کے بھرے میں نہ آئے تو عبداللہ بن زبیر کے پاس گیا اور کہا کہ

وقت ہے کہ آپ شام پر حملہ کریں۔ آپ نے کہا کہ اتنا لشکر کہاں سے لاؤں۔ کہا کہ

کوفہ سے، اور یہ کام میرے سپرد کروں۔ میں شامیوں سے نپٹ لوں گا۔ ابن زبیر

نے اجازت دے دی۔ مختار کوفہ میں آیا اور اہل کوفہ کو جمع کر کے کہا کہ

”تم نے اولاد علیؑ سے جو کچھ سلوک کیا اس کی پاداش میں تم سب اس لائق

ہو کہ ہلاک کئے جاؤ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ بنو امیہ سے خون حسینؑ

کا بدلہ لو تو بہ کرو اور بنو امیہ کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

لوگوں کی حقیقت اس سے بڑھ گئی۔ اور اس پر اضافہ اس طرح ہوا کہ بیت المال

کا دروازہ کھول دیا اور داد و دہش سے لوگوں کو بالکل اپنا کر دیدہ بنایا۔ جب بصرہ میں مصعب کو اطلاع ہوئی تو بھائی کو لکھا کہ مختار آپ کے نا پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ ابن زبیر نے مختار سے جواب طلب کیا تو اس کا جواب عملاً یہ دیا کہ ابن زبیر کی خلافت سے انکار کر دیا اور لوگوں کو کہا کہ خلافت کا حق بنو ہاشم کا ہے۔ لیکن علیؑ (زین العابدین) بن حسینؑ اس کا اہل نہیں اس لئے محمد بن الحنفیہ کو اپنا امام سمجھو۔ تاریخی واقعات کا تذکرہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہے۔ ان عقائد کا جائزہ لینا ہے جو فرقہ مختاریہ یا کیسانیہ سے منسوب ہیں۔

ابن خلکان "وفیات الاعیان" میں لکھتا ہے کہ:۔
 "آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو ایک فرزند کی بشارت دی اور فرمایا کہ اس کا نام میرا نام اور اس کی کنیت ابوالقاسم میری کنیت ہوگی میری امت میں کسی کے لئے جائز نہیں کہ میری کنیت اختیار کرے۔ مگر میرا نام اپنی اولاد کا رکھ سکتا ہے۔ صرف اسی ایک کے لئے میری کنیت جائز ہے۔ چنانچہ جب محمد بن الحنفیہ خولہ بنت جعفر کے بطن سے پیدا ہوا تو کنیت ابوالقاسم سے مشہور ہوا۔"

یہ بہت بڑا عالم دین تھا اور زہد و تقویٰ میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ "شہید القویۃ" ایسا تھا کہ اس بارہ میں عجیب حکایات مشہور ہیں۔ اس لئے عبد اللہ بن زبیر کی بیعت سے انکار کر دیا تو ابن زبیر نے خطبہ دیا کہ

"تمام لوگوں نے میری بیعت کی مگر یہی ایک جوان محمد بن الحنفیہ اڑا ہوا ہے۔ میں اسے غروب آفتاب تک مہلت دیتا ہوں اگر بیعت نہ کی تو مارا جائے گا۔"

عبد اللہ بن عباسؓ اور محمد بن الحنفیہ نے ابن زبیر کو کہا کہ "جب تک دنیا را سلام تیری خلافت پر متفق نہ ہو ہم بیت نہیں کریں گے۔" ابن الحنفیہ کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ مدینہ میں فوت ہوا اور ابان بن عثمان بن عفان نے نماز جنازہ پڑھی اور جنت البقیع میں دفن ہوا۔
 بعض کہتے ہیں کہ طائف کی طرف گیا اور ابن زبیر سے لڑا اور وہیں فوت ہوا۔
 بعض کہتے ہیں "ایلمہ" میں رحلت کی۔ مگر فرقہ مختاریہ یا کیسانہ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ جبل "رضوی" میں غائب ہو گئے۔ اور کسی وقت شروج فرمائیں گے۔ جبل رضوی کے متعلق بھی اختلاف ہے کہتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر قرظا سے دو منزل پر واقع ہے۔

مہدی کے بارہ میں روایات جو بھی مشہور ہیں فرقہ مختاریہ محمد بن الحنفیہ ہی کو اس کا مصداق یقین کرتا ہے۔ چنانچہ سید حمیری اور شاعر کثیر نے بہت اشعار آپ کی مدح میں لکھے ہیں جن کو مسعودی مروج الذهب میں اور ابن خلکان "وفیات" میں نقل کرتا ہے۔ کثیر کہتا ہے کہ

الذات الائمة من قریش

ولادہ الحق اربعة سوار

سن رکھو کہ امام تو قریش سے ہی ہیں

مگر دوست داران حق چار شخص ہیں

عی والثلثة من بنیہ

حمالا سباطیس ہم خفا

ایک تو علی اور اس کے بیٹوں میں سے تین تن

جن کا نانا پیغمبر ہے اس میں کوئی بات چھپی ہوئی نہیں

سبط سبط ایمان و سبط

وسبط غیبہ کربلا

ان میں سے ایک صاحب ایمان اور نیکو کا ہے

اور دوسرا کربلا میں مدفون ہے

وسبط لا تراہ العین حتی

يقود الخیل يتبعها السوار

اور وہ تیسرا فوت نہ ہو گا جب تک لاؤ شکر کے ساتھ

اور پرچم لہراتا ہوا خسرو ج زکری

یغیب لادیری فیہما مائتا

برضوی عندہ غسل و ما

اس عرصہ تک رضوی میں پوشیدہ ہے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا

اور اس کے پاس شہد اور پانی (کی نہیں) ہیں

آمد ثانی کا عقیدہ اب جزو مذہب بن گیا۔ مختار اور مصعب براہر عبد اللہ بن نبیر

میں جنگ ہوئی۔ مختار مارا گیا۔ لیکن جس مذہب کی طرح ڈال چکا تھا زندہ رہا۔ زندگی کی ایک

نشانی یہ بھی ہے کہ جاندار شے بڑھے، پھولے پھلے۔ چنانچہ کیسانہ یا مختاریہ کی بہت ستھیں

پھوٹیں۔ اور عقیدہ آمد ثانی اور حلول وغیرہ نے مستقل صورت اختیار کر لی۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ مختاریہ فرقہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد

قریب تر زمانہ میں پیدا ہوا۔ اور اس نے بنو فاطمہ کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ محمد بن الحنفیہ کے

حالات کا علم کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہمیں معلوم نہیں۔ کچھ حکایات ہیں اور روایات ہیں

اور آپ کی شخصیت کو ایسے رنگ روپ میں پیش کیا گیا کہ آپ فوق البشر انسان تھے

آنحضرتؐ سے قرابت قریبہ محض حضرت علیؑ کو نہ تھی۔ بنو عباس کو بھی مساوی دعویٰ

اس رشتہ کا تھا۔ بنو فاطمہ نے دعویٰ خلافت اس دلیل پر کیا کہ وہ حضرت علیؑ کی اولاد،

حضرت فاطمہ دختر آنحضرتؐ کے بطن سے ہیں۔ یہ دعویٰ بنو عباس اور بنو فاطمہ میں

ماہہ الشراع رہا۔ آخر فیصلہ برہان قاطع یعنی تلوار نے کر دیا۔

سردست دیکھنا یہ ہے کہ فرقہ مختاریہ وغیرہ نے بنو فاطمہ کو چھوڑ کر محمد بن الحنفیہ کی

طرف رجوع کیوں کیا؟ کو تو ہمیشہ شورہ پشتی کامرکز رہا ہے۔ اور اس فرقہ کی ابتداء بھی ہمیں سے

ہوتی۔ اور تائید بھی نو مسلم ایرانیوں کی طرف سے ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مختار اولاد علیؑ

کی اڑیں اپنا اٹو سیدھا کرنا چاہتا تھا۔ بنو فاطمہ پر تو اس کا جادو نہ چلا اس لئے علوی خاندان کے نام پر کھڑا ہوا۔

محمد بن الحنفیہ خود تو کسی لڑائی میں شریک نہیں ہوا۔ مختار ہی ابن زبیر اور آپ کے بھائی سے لڑتا رہا اور مارا گیا۔ اس لئے یہ بھی مشتبہ امر ہے کہ محمد ابن الحنفیہ و عویدار خلافت تھے۔

محمد بن حنفیہ کی نسبت ان لوگوں کا عام عقیدہ تھا کہ وہ دشمنان دین کے خوف **باشمبیہ** سے روپوش ہے اور کسی مناسب وقت پر ظاہر ہوگا۔ اور اس وقت کا انتظار ہے۔ اس لئے امامت کے بارہ میں اب تین صورتیں پیدا ہو گئیں۔ امام ظاہر، امام غائب، امام منتظر۔

امام غائب زندہ کہیں موجود ہے مگر وہ خاص خاص مقربین کے ذریعہ احکام نافذ کرتا رہتا ہے۔

امام منتظر وہ جس کا انتظار ہے اس کے بارہ میں اختلاف ہے کہ وہ کون ہے آیا محمد بن حنفیہ یا کوئی اور۔ عقیدہ "مہدی" کے تحت اس کی وضاحت کی جائیگی۔ محمد حنفیہ تو امام غائب ہے مگر اس کا کوئی قائم مقام یا "وکیل" ہونا چاہیے۔ اس کے بعد بیٹا ابی ہاشم بن محمد بن حنفیہ ہے۔ فرقہ "باشمبیہ" جو اس کے نام سے موسوم ہے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام علوم اصل و فرع بنی کا مالک باپ تھا ابی ہاشم اس کے بیٹے میں منتقل ہو گئے۔ اگرچہ یہ سب فرقے سیاسیات کی پیداوار تھے۔ مگر جب مختار کو بساطِ سیاست پر شکست ہوئی اور مات کھا گیا۔ اور متبعین میں قوتِ عسکری نہ رہی تو وہی رنگ میں قائم ہے۔ اور یہ امید منقطع نہ ہوئی کہ حالات سازگار ہوئے تو پھر سے اقتدار حاصل کریں گے۔

ابی ہاشم کی وفات کے بعد اس کے متبعین پانچ فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ ابی ہاشم شام سے مراجعت کے وقت شراہ میں فوت ہو گیا اور محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں وصیت امامت کر گیا۔ اس طرح یہ فرقہ

بنو عباس کی امامت کے بارہ میں کتاب ہے کہ خلافت بوجہ قرابت آنحضرتؐ بنو عباس کا حق ہے۔ اسی قرابت کو مد نظر رکھتے ہوئے خلیفہ عباسی ابو جعفر اور محمد النفس الذکیہ میں حق خلافت بحث کا موضوع رہا ہے۔

مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب "صدیق اکبر" اور خلافت اسلامیہ (حصہ اول) میں کی ہے۔

منصوریہ و لیل پیش کرتا ہے کہ وراثت میں عمر کا حق اولاد و خیر پر فائق ہے: اور یہی دلیل فرقہ ہاشمیہ کا عقیدہ ہے۔ دوسرا فرقہ ہاشمیہ یہ کہتا ہے کہ بعد وفات ابی ہاشم حق امامت آپ کے بھائی حسین بن علی بن محمد حنفیہ کا ہے۔

ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ ابی ہاشم نے وصیت عبداللہ بن عمرو بن حرب کندی کے حق میں کی تھی۔ اس لئے امامت بنی ہاشم سے عبداللہ مذکور میں منتقل ہو گئی۔ صرف بعد امامت ہی نہیں بلکہ روح ابی ہاشم بن محمد حنفیہ بھی حلول کر گئی۔

اب ایک اور شاخ امامت میں تنازع کا کھڑا کیا گیا۔ عبداللہ مذکور کے بارہ میں شہرستانی لکھتا ہے کہ

وہ تنازع کا قاتل تھا اور اس کا دعویٰ یہ تھا کہ روح اللہ عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور آپ کی روح کا حلول مجھ میں ہوا ہے۔ اس لئے دعویٰ نبوت بحیثیت مثیل مسیح اور الوہیت بلحاظ روح اللہ کیا۔ یہ فرقہ قیامت کا منکر تھا اور عقیدہ رکھتا تھا کہ ثواب و عذاب اسی دنیا میں ہے اور آئیے "لیس علی الذین آمنوا عملوا الصلوات حجاج قیما ظموا" کی تاویل یہ کرتا کہ جس نے امام کو دیکھا وہ کہاں کو پہنچ گیا اور خور و نوش میں حلال و حرام کا امتیاز بھی اٹھ جاتا ہے۔

شہرستانی کی رائے یہ ہے کہ یہ مذہب "مزوکیہ" کا تھا اور ہے ہم نے یہی بات اس کتاب کے شروع میں لکھی ہے کہ (سلمانوں میں فرقہ بندی کی بنیاد تو سیاسیات ہیں یا وہ فلسفہ جیونان اور ایران سے داخل ہوا) جو فرقے سیاسیات کی اغراض کے ساتھ

کھڑے ہوتے ان میں تو قتل و غارت بھی لازمی نتیجہ تھا اور جو محض فلسفیانہ رنگ میں رنگین تھے اور خود بھی امن پسند تھے اور ان سے کچھ تعرض بھی نہ ہوا۔ لیکن سیاسی اغراض کی تکمیل ان عقاید کے بغیر بھی ممکن نہ تھی جس میں فلسفہ کی رنگ آمیزی نہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کا حق حکومت اپنے ہی ہم جنس انسانوں پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک اس شخص کو "فوق البشر" تسلیم نہ کیا جائے۔ تاریخی زمانہ میں دیوتاؤں کی اولاد یونان و روم اور مصر و ایران اور ہندوستان میں راجے اور بلوک بہت گزرے ہیں۔ اور یہی عقیدہ "تفوق" کسی نہ کسی رنگ میں ہمیشہ جلوہ نما ہوتا رہا۔ بادشاہوں کے آسمانی حقوق (DEVINE RIGHTS OF KINGS) وہی حق امامت ہے۔ جسے بہ نص قرآن شیعان علیؑ ثابت کرتے رہے اور اب پختہ عقیدہ ہو چکا ہے۔ لیکن اگر تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ عبداللہ بن عمرو بن حرب کنڈی کا دعویٰ کہ مسیح کا روح اس میں حلول کر گیا ہے۔ وہی مسیحی عقیدہ ہے کہ مسیح روح اللہ ہے اور منظر الوہیت ہے۔ اس فرقہ کو "سٹریپیہ" کہتے ہیں۔

✓ یہ فرقہ عراق میں زور پکڑ گیا۔ مگر عبداللہ خراسان میں مارا گیا تو اس کے متبعین میں پھر فرقہ رونما ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ زندہ ہے اور دوبارہ آئے گا اور دوسرا فرقہ کہتا کہ فوت ہو گیا مگر اس کا روح اسحق بن زبید بن حارث انصاری میں منتقل ہو گیا۔ اس فرقہ کو "حاشیہ" کہتے ہیں۔

✓ اسی ہاشمیہ کی ایک شاخ "بنانیہ" ہے جو بنان بن سمان سے منسوب و موسوم ہے۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ منظر الوہیت ہیں۔ اور تفسیر آیہ "قل ینظرون اللہ ان ینزلہم اللہ فی ظلل من الغمام" یہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد امام المتقین حضرت علیؑ ہیں کہ ظلل میں آئے گا اور بعد اس کی آواز ہے اور برق اس کا تبسم ہے۔

✓ اور بنان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ جزوالہی جو حضرت علیؑ کی بشری صورت میں تھا۔ اس میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس لئے مستحق امامت و خلافت میں ہی ہوں۔ دلیل یہ

پیش کرتا کہ یہ روح الہی یا جزوا الہی ہی تھا کہ جب آدم میں نفع ہوا تو ملائکہ مسجد میں گر پڑے اور جو اکر اڑا وہ راندہ درگاہ الہی ہوا۔ اس لئے میرا منکر شیطان اور ذریت شیطان ہے ہمارے زمانہ میں بھی ایک مدعی نے مخالفین کو "ذریت الہی" (حرام زادے) کے مخاطب کیا۔

ابن ہاشم بن محمد حنفیہ کا انتقال ۸۰ھ میں ہوا۔ عبد اللہ بانی مذہب حریبیہ اس صدی کے آخر میں ظاہر ہوا۔ بنان بن سمعان کے بارے میں ابن حزم لکھتا ہے کہ وہ تائب ہو گیا اور آخر متقی مومن بن گیا۔

شہرستانی بھی تائید کرتا ہے۔ بنان کے متبعین نے اسے چھوڑ کر عبد اللہ بن معاویہ کی طرف رجوع کیا۔ پست فطرت ایسے ہی ہوتے ہیں۔

میرے ایک دوست نے مجھے باتوں باتوں میں کہا کہ "دنیا میں دو قسم آدمی ہوتے ہیں۔ ایک عابد دوسرے معبود۔ عابد کثرت سے ہیں۔ انہیں ہمیشہ کسی نہ کسی معبود کی تلاش رہتی ہے۔ جہاں کسی کا شہرہ سنا پروانہ وار گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ ملنے نہ ملنے یہ اسے معبود بنا کر چھوڑتے ہیں۔ اگر اس معبود سے کسی وجہ سے برگشتہ ہوتے تو کسی اور معبود کی تلاش جاری رہتی ہے۔"

حریبیہ اور بنائیبہ فرقوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا یعنی اللہ آدمی کی صورت رکھتا ہے۔ جزو بجزو اور عضو بعضو اور یہ کہ تمام اجزا و اعضاء ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ "الدوجہ"

رزامیہ | یہ فرقہ رزام بن زعم سے منسوب ہے۔ ان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ امامت حضرت علیؑ کے بعد محمد حنفیہ کی طرف منتقل ہوئی۔ پھر اس کے بیٹے ابی ہاشم کی طرف اور ابی ہاشم کی وفات کے بعد حسب وصیت علی بن عبد اللہ بن عباس امام برحق ہے۔ علی نے اپنے بیٹے محمد کے حق میں وصیت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ابراہیم کی طرف منتقل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خلافت بنو امیہ

دوبہ زوال تھی اور دعویٰ دارانِ خلافت بنو ہاشم اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنے داعی ملک
سلاویہ کے طول و عرض میں پھیلا دئے۔ ابو مسلم خراسانی ابراہیم کا خاص معتمد تھا۔
انسان میں اس فرقہ کا بہت زور تھا۔

شہرستانی لکھتا ہے کہ

”ابو مسلم کا مذہب کیسانیہ“ تھا اور ابستہ میں اسی مذہب پر اس کی تعلیم و
تربیت ہوئی۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح امام جعفر بن محمد الصادق
کو اپنے دامِ تزویر میں پھانسنے۔ مگر جب ادھر سے ناامید ہوا تو ابوالعباس
بن محمد کی طرف رجوع کیا۔ اسی کی کوشش سے بنو امیہ کا تختہ حکومت
شام میں الٹ گیا اور خلافت پر قبضہ بنو عباس کا ہو گیا۔ لیکن ابو مسلم
کی نسبت اس کے خراسانی جانثاروں کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ منظر الوہیت
ہے۔ اور وہ خود بھی اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔“

بلیغ منصور عباسی جب اس کے ارادوں سے آگاہ ہوا تو ایسی سیاسی چال چلا کہ ابو مسلم
منصوبہ خاک میں مل گیا۔ ابو مسلم مارا گیا مگر اپنے بعد ایک مذہب چھوڑ گیا جو بعد میں
حرمیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ دین صرف معرفت امام ہے
دریس۔ اسی کی ایک شاخ کا یہ عقیدہ ہے کہ دین دو امر پر مشتمل ہے۔ معرفت امام و
دار امانت۔ جس کو یہ دو باتیں نصیب ہوں وہ کمال حاصل کر سکتا ہے اور تمام تکالیف
شرعیہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

یہ فرقہ جو امام محمد حنفیہ سے منسوب ہیں۔ ان کو ”علویہ“ کہنا چاہیے۔ اگر بنو فاطمہ
دعویٰ دار امانت یا خلافت ہوتے تو علویہ فرقوں کا ظہور ہی نہ ہوتا اور جب کھڑے ہوئے
تو یہ فرقے گوشہ گنہامی میں جا بیٹھے۔ لیکن جس سیاسی غرض کے ساتھ ان کا ظہور ہوا وہ
ایسی نہ تھی کہ قریب تر زمانہ میں اپنی موت مر جاتے۔ اسی غرض کی تکمیل کے لئے وہ بنو
ہاشم یعنی اول بنو عباس اور پھر بنو فاطمہ سے وابستہ رہے۔ اور پھر عملاً دونوں سے الگ
ہو کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔ لیکن عقاید میں فرق نہ آیا اگر آیا تو وہ صرف ”علویہ“ ہی تھا

اس لئے شہرستانی اور بغدادی اور دیگر مورخین ان کو "غلالت" سے موسوم کر رہے ہیں۔ شہرستانی شیعہ "غالیہ" کے تحت لکھتا ہے کہ

"وہ بیابان ضلالت اور پھر طغیان میں اس حد تک بڑھ گئے کہ حلویہ اور تنا سنجیہ کے مشابہ ہو گئے۔ اور ملت یہود و نصاریٰ ان کا مذہب بن گیا۔ کیونکہ یہود تشبیہ خالق کرتے ہیں خلق کے ساتھ اور تنزیہ خلق بخالق۔"

اسی کا اثر تھا کہ بعض اہل سنت "اعتزال" کی طرف مائل ہو گئے۔ چار فرقہ ہیں تشبیہ اور حلول سب میں ایک جیسا عقیدہ ہے اور مختلف ممالک مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔

اصفہان میں ان کو "خرمییہ" و "کوریہ" اور رے میں ان کو "مزویہ" اور اور آذربائیجان میں "قولیہ" اور "محمد" اور "سرخ پوش" اور ماموراء النہر میں (سفید پوش) اور مقنعیہ کہتے ہیں جو حکیم مقنن سے منسوب ہیں۔

"غلالت" میں سب سے پہلا فرقہ "سیائیہ" یا "سبئیہ" ہے جو عبداللہ بن سب سے منسوب ہے۔ اس کے حالات ہم لکھ چکے ہیں۔ عبداللہ بن سبا حضرت عثمان عہد میں مسلمان ہوا۔ اور حضرت علیؑ کے ہوا خواہوں یا بدخواہوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ "آنحضرت ص کے بعد حضرت علیؑ کا حق خلافت جو مسلسل غصب ہوتا رہا اور حضرت علیؑ کی نسبت ان کا یہ عقیدہ ہے کہ "آپ منظر الوہیت ہیں۔"

کمالیہ | اس فرقہ کا بانی "ابن کامل" تھا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ "آنحضرت ص کی وفات کے بعد تمام صحابہ ماسویٰ علی مرتد ہو گئے۔ علیؑ کا بھی قصور ہے۔"

آپ نے ان مرتدین کے خلاف جہاد نہ کیا۔ لیکن بایں ہمہ عقاید دربارہ حضرت علیؑ آپ کو الوہیت کا درجہ بھی دیتے ہیں۔ "ابن کامل" کہتا ہے کہ ایک ہی نور ہے جو آپ شخص میں نبوت اور دوسرے میں امامت کی صورت میں جلوہ نما ہوتا ہے اس فرقہ

یہ عقیدہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک مکان میں قائم اور ہر ایک زبان میں ناطق اور
 ایک بشری شخصیت میں ظاہر ہے۔ غرض حلول اور تناسخ ان کے عقیدہ کی بنیاد ہے
 لیتے ہیں کہ حلول یا جزوی ہوتا ہے یا کلی جزوی اس طرح جیسے سورج کی روشنی پرا
 یا بلور یا شیشہ میں کہیں۔ اور کلی کی صورت یہ ہے جیسی فرشتہ کی آدمی کی صورت
 یا ظہور شیطانی حیوانی شکل میں۔ اور مراتب تناسخ چار ہیں "نسخ" اور "مسخ" اور "فسخ"
 نسخ و تناسخ کی تفصیل ہندوؤں اور مجوسیوں کی کتابوں میں دی گئی ہے کہ اعمال
 و عقاید کا اثر کیا کچھ اگلے جنم میں ہوتا ہے۔ اس لئے بحث تحصیل حاصل ہے۔

یہ فرقہ علی بن ذراع اسدی سے منسوب ہے۔ یہ اور اس کی شاخیں انتہائی
 غالی شیعہ ہیں۔ ان کے عقیدہ میں علیؑ کا مرتبہ آنحضرتؐ سے بھی اعلیٰ اور
 فاع ہے۔ بلکہ علیؑ اللہ ہے جس نے آنحضرتؐ کو مبعوث فرمایا۔ اور آنحضرتؐ کی
 شت کا مقصد ہی اتنا تھا کہ لوگوں کو حضرت علیؑ کی متابعت کی تلقین کریں۔ اس فرقہ
 "ذمیہ" بھی کہتے ہیں۔ ان میں سے دوسرا فرقہ "عیینیہ" کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک
 علی عین محمدؐ اور محمد عین اللہ ہے۔ تیسرا فرقہ "میمنیہ" سے موسوم ہے۔ یہ فرقہ بیعت
 منظر الوہیت یقین کرتا ہے۔ یعنی آنحضرتؐ اور علیؑ اور حسنؑ اور حسینؑ اور فاطمہؑ
 حضرت فاطمہ کو فاطمہ کہتے ہیں کہ تائید کا اطلاق آپ پر صحیح نہیں۔ چنانچہ ان کے
 ایک شاعر کا شعر ہے کہ

تولیت بعد اللہ فی الدین خمستہ

نبیاً و سبطیہ و شیخا و فاطمہ

اللہ کے بعد میں پانچ کو دوست رکھتا ہوں، نبی اور دو نبیر گان (حسن و حسین)

در علی اور فاطمہ کو۔

جب تک اموی خلافت عروج پر تھی حضرت امام حسینؑ کے بعد بنو ہاشم
 دبے رہے لیکن کبھی خاموش نہ بیٹھے۔ ان کے داعی کچھ تو بوجہ عقیدت
 و اکثر اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے عراق اور ایران میں پھیلے ہوئے تھے۔

ہجرت کے بعد ایک سو سال کے عرصہ میں اسلام اگرچہ دنیا بھر میں اسلام کے طول و عرض میں شائع ہو چکا تھا۔ مگر عوام غیر عرب ابھی تک حقیقت اسلام سے واقف نہ ہوئے تھے۔ عجمی یا تو ایرانی آریا نسل سے تھے۔ جیسے ایرانی اور ہندوستانی یا ترک تھے یہ لوگ ابھی تک اپنے آبائی رسم و رواج اور مذہبی عقائد کو نہ بھولے تھے۔ جو ان کی طبیعت میں ہونے لگی تھی۔ اور یہ کہنا کچھ بے جا نہیں کہ سارے تیرہ سو سال کے بعد بھی نہیں بھولے۔ عجمی مذاہب میں دیوتا پرستی غالب ہے اور جب کسی شخص سے عقیدت کسی شخص یا جماعت کو اس شخصیت سے وابستہ کر دیتی تو وہ اس کو الوہیت کا درجہ خود بخود دیتے رہے۔ اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ وہ آنحضرتؐ اور حضرت علیؑ اور ان کے جن کو آنحضرتؐ سے قرابت قریبہ تھی۔ بمنزلہ "اللہ" یقین کرتے۔ داعیان بنو ہاشم ان لوگوں کے مذاہب کو اپنا سیاسی آلہ کار بنالیا اور ان کو کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی داعی عرب اور شام اور افریقہ میں بنو امیہ کے فسق و فجور کے افسانے اٹھتے بیٹھے ایک جگہ بیان کرتے۔ اور دوران ممالک میں جہاں عجمیوں کی اکثریت تھی بنو ہاشم بطور دیوتا پیش کرتے اور پیشگوئیاں گھڑتے جو آنحضرتؐ سے منسوب کرتے۔ ان میں سے مہدی اور نزول عیسیٰ کے بارہ میں احادیث مشہور ہیں۔

تعجب ہے کہ صحیح بخاری میں مہدی کی آمد کے بارہ میں ایک بھی حدیث نہیں اور نزول عیسیٰ کے متعلق ایک جمل سی حدیث ہے جو الحاقی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ کی آمد ثانی کا عقیدہ مسیحی ہے اور مسلمانوں کو اس کا علم تھا۔ اور مہدی کے بارہ میں بخاری بہت پہلے روایات شائع ہو چکی تھیں۔ غالباً اس لئے کہ ان میں سخت اختلاف اور رواۃ ثقہ نہ تھے جو بخاری کے معیار پر پورے نہ اترے اس لئے لاکھوں احادیث کے طومار میں ان کو بھی موضوع سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

بنو امیہ کے زوال کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب ہی سیاسی تحریک تھی جو بنو ہاشم نے مسلسل ایک صدی تک جاری رکھی۔ مسلمانوں کا اوڑھنا پھوننا یہی ایک دین اسلام ہے اس لئے ان ایام میں بلکہ اب بھی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی

جب تک اس پر مذہبی رنگ نہ چڑھا ہو۔ اس لئے ہر ایک تحریک گو وہ سیاسی ہی تھی مذہبی قرار پائی۔ اور ہر ایک مذہبی فرقہ بن گیا۔ اس کے بعد فرقہ در فرقہ پیدا ہوتا گیا بنتا اور بگڑتا رہا۔ ہمارے زمانہ میں جو کچھ اب چند فرقوں کی ہستی ہے وہ مناسب مقام پر بیان کی جائے گی۔ سر دست ہم ان ابتدائی سیاسی فرقوں کے حالات لکھتے ہیں۔

فرقہ "مغیرہ" مغیرہ بن سعید عجمی سے منسوب ہے۔ یہ شخص محمد بن عبد اللہ بن حسن بن علی کا داعی تھا۔ مغیرہ موالی خالد بن عبد اللہ قسری کا تھا جو اس وقت داعی عراق بنو امیہ کی طرف سے تھا اور ولایت عراق پر ولید اور ہشام کے عہد میں متمکن رہا۔ اس نے اکثر داعیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ مغیرہ کی نسبت طبری اور ابن جریر کی روایت ہے کہ زندہ جلا دیا گیا۔

محمد بن حنفیہ تاریخ میں "نفس ذکیہ" کے لقب سے مشہور ہے پہلا شخص ہے جس کی نسبت مغیرہ نے اعلان کیا کہ

"یہی مہدی موعود ہے جس کی نسبت آل حضرت کی پیشگوئی ہے کہ اس کا

نام میرا نام اور اس کے والد کا نام میرے والد کا نام ہوگا۔"

مغیرہ کو داعی عراق خالد بن عبد اللہ نے ۱۱۹ھ میں حکومت وقت کے خلاف بغاوت کے جرم میں قتل کیا۔ نفس ذکیہ نے حجاز میں اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ اکثر علماء دین نے تائید کی۔

کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ پر بھی شبہ تھا کہ وہ بھی خلافت نفس ذکیہ کا حق سمجھتے تھے۔

اس لئے جب عباسی خلیفہ منصور مظفر منصور ہوا۔ اور نفس ذکیہ میدان جنگ میں ۱۲۰ھ میں کام آیا تو امام ابو حنیفہ کو قید و بند کی سختی برداشت کرنی پڑی۔ لیکن اس روایت کی صداقت مشتبہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ امام صاحب چونکہ کوفی تھے اور کوفہ شورش کا مرکز تھا اس لئے آپ پر بھی شبہ ہوا ہو۔ امام صاحب اور آپ کا شاگرد ابو یوسف تو عباسی دور دورہ میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز نظر آتے ہیں۔

مغیرہ کی کوشش سے اکثر اہل عراق بنو فاطمہ کے حق میں علم بغاوت بلند کرنے

کے لئے تیار تھے اور وہ یہی کہتا کہ مناسب وقت پر امام برحق کا ظہور ہوگا اور وہ کن اور مقام کے درمیان لوگوں سے بیعت لے گا۔ یہ پیشگوئی جس کا مذکور احادیث میں ہے اگرچہ عبد اللہ بن زبیر کے حق میں پوری ہو چکی تھی مگر ان لوگوں کے عقیدہ کے مطابق آپ امام و خلیفہ برحق نہ تھے۔ غالباً اس لئے کہ کامیاب نہ ہوتے۔ بہر حال نفسِ ذکیہ کے حق میں پوری ہوئی مگر کامیاب وہ بھی نہ ہوا۔

منصور یہ | یہ فرقہ ابو منصور اسمعیلی سے منسوب ہے۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ امامت اولاد حضرت علیؑ میں منتقل ہوتی رہی۔ اور اب ابو جعفر محمد بن علی ابن الحسین ابن علی مرتضیٰ میں آئی۔ ابو جعفر الملقب بہ الباقر جب تک زندہ رہے ابو منصور آپ کی امامت کا قائل رہا لیکن آپ کی وفات کے بعد خود دعوے دار امامت ہوا۔ امام باقر کا انتقال ۶۸۶ھ میں ہوا۔ ایک اور فرقہ "باقریہ" آپ کے نام سے منسوب ہے ان کا عقیدہ ہے کہ امام باقر پانچویں امام ہیں اور یہی مہدی ہیں۔ یہ فرقہ امامیہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ ابو منصور محض امامت پر قانع نہ رہا اس لئے وہی دعویٰ کیا جو مسیحی مسیح سے منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے آید

"ان یروا کسفا من السماء ساقطاً یقولوا سبحان من یرحمہ"

"اگر کوئی ٹکڑا آسمان سے گرتا ہوا دیکھیں تو کہیں گے کہ یہ بادل کے ٹکڑے جمع ہو گئے ہیں (اور بارش کی تمہید ہے جو مفید ہے) یہ کی کہ "کسف ساقط سے مراد اللہ تعالیٰ کی کبریائی ہے اور زمین پر اس کا نزول میری صورت میں ہوا۔ میں آسمان پر اٹھا گیا مجھے رویت حق کا مشاہدہ ہوا۔ حق تعالیٰ نے میرے سر پر تھنکی دے کر کبریائی زبان میں فرمایا کہ: اے میرے بیٹے زمین پر جا۔ آسمان سے میرا نزول زمین پر ہوا" کسف ساقط میں ہوں۔ جو میرا تابع ہے اس کے لئے تو بارانِ رحمت اور جو مخالف ہے اس کے لئے عذاب ہے۔ نبوت ہرگز منقطع نہیں ہوتی۔ یہ ابدی ہے اور جاری رہے گی جنت سے مراد وہ اشخاص ہیں کہ ان سے ہمارا رشتہ الفت ہے اور جہنم سے مراد وہ ہیں جن سے ہمیں دشمنی ہے اور یہ وہ ہیں جو امام برحق کے دشمن ہیں ان کا مال اور

اولاد ہم پر حلال ہے۔ تکالیف شرعیہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہیں جو امام برحق کی زیارت سے مشرف ہو چکے۔ وہ اہل جنت ہیں۔

اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت عیسیٰ کو خلق فرمایا۔ بعد ازاں نفس ثانی حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو، ابو منصور اور مغیرہ بحیثیت مولیٰ ایک ہی قبیلہ عجمی سے وابستہ ہیں۔ دونوں کو فی تھے مسیحی عقیدہ الوہیت دربارہ مسیحؑ اور آپ کی آمد ثانی اس فرقہ کے عقیدہ میں نظر آتا ہے۔ یوسف بن عمر ثقفی اس وقت والے عراق تھا۔ جب ابو منصور کے عقاید کا علم ہوا اور اس کی چیرہ دستی نے ہر لونگ مچارکھی تھی اس لئے پھانسی کی سزا دی۔

خطابیہ امام محمد الباقر کی وفات کے بعد شیعیان امامیہ دو فرقوں میں بٹ گئے ایک فرقہ تو محمد النفس الذکیہ کا طرفدار تھا اور دوسرا امام جعفر صادق کا۔ امام جعفر صادق، نفس ذکیہ کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے۔

امام صاحب کا پرچوش حامی الخطاب محمد بن ابی زینب اسدی اجدرع تھا۔ اکثر شیعہ فرقے اسی سے منسوب ہیں یا خطابیہ کی شاخیں ہیں۔

امام جعفر کے بعد شیعیان پھر دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو امام صاحب کے بڑے بیٹے اسماعیل کو امام تسلیم کرتا تھا اور اسماعیل کے بعد آپ کے بیٹے محمد کو خطاب اس فرقہ کا سرغنہ تھا۔ دوسرا فرقہ امام جعفر صادق کے دوسرے بیٹے موسیٰ کاظم کی امامت کا قائل تھا۔ یہ فرقہ بعد میں امامیہ اثنا عشری کہلایا۔ اور دوسرا فرقہ اسمعیلیہ سے موسوم ہے۔ اس فرقہ نے شمالی افریقہ میں خلافت بنو قاطمہ قائم کر دی۔ پایہ خلافت قاہرہ انہی کا بسایا ہوا ہے۔ اور شہر اسماعیلیہ بھی اسماعیل بن امام جعفر صادق کے نام پر آباد ہوا۔

اثنا عشریہ وہ تمام احادیث جو امام جعفر صادق سے ابوالخطاب کے ذریعہ مروی ہیں، صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ احادیث جو امام صاحب سے علیحدگی کے بعد مروی ہیں تسلیم نہیں کرتے۔ فرقہ اسماعیلیہ ان کو تسلیم کرتا ہے اور جن کو اثنا عشریہ

تسلیم کرتے ہیں، مسترد کرتا ہے۔ اس لئے اس کی روایات میں اختلاف اور تضاد بھی ہے۔

فرقہ خطابیہ کی شاخیں چار ہیں۔ ان میں سے "معمریہ" کا عقیدہ یہ ہے کہ امام جعفر صادق کے بعد ابو الخطاب امام ہے اور اس کے بعد معمریہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جنت سے مراد یہی نبوی نعمتیں اور خیر و برکت اور دوزخ سے مراد شر و مشقت و مصائب ہیں۔ تمام محرمات شرعیہ حلال ہیں۔ اور تمام تکالیف شرعیہ صوم و سلاوات عوام کا لالعام کے لئے ہیں۔ معمر کوفہ میں گندم فروش تھا۔ اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ ابو الخطاب کے بعد معمرا امام ہے۔

دوسرا فرقہ "بذیغیہ" ہے ان کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادق اللہ سے لوگ بشری صورت دیکھتے رہے۔ وہ صورت مثالی تھی جب شہد کی مکھی کو وحی ہوتی ہے تو ہمیں کیوں نہ ہو۔ تمام مومن سبطہ حی ہیں۔ اور آیات "وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ" کی تاویل وحی کرتے تھے۔ یہ بھی عقیدہ تھا کہ ہم میں سے جو فوت ہو عالم ملکوت کی طرف اس کا رفع ہوتا ہے۔ اور زندہ ہے اور ہم گذشتگان کو صبح و سنا دیکھتے ہیں۔

تیسرا فرقہ عمیر بن بنان عجمی سے منسوب ہے۔ ان کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ فرقہ صرف اتنا ہے کہ یہ موت کے قائل ہیں۔ یہ لوگ علانیہ امام جعفر صادق کی پرستش کے قائل تھے۔ اس فرقہ کو "عمیریہ" کہتے ہیں۔

چوتھا مفضل بن سیرفی سے منسوب ہے۔ یہ بھی امام جعفر صادق کی الوہیت کے قائل ہیں۔ اس فرقہ کو "مفضلیہ" کہتے ہیں۔ اس فرقہ کی روایات کے مطابق امام جعفر صادق نے ابو الخطاب سے بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ اس لئے یہ بھی دوبارہ ابو الخطاب تبرا کرتے ہیں۔

عبدالقناہ بغدادی لکھتا ہے کہ

"خطابیہ اور اس کی چار شاخیں، خلفاء راشدین ابو بکر و عمر و عثمان کو غاصب

قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی تو اسی گناہ کے مرتکب ہوتے کہ اولاد علیؑ سے امامت چھین کر ابو الخطاب وغیرہ کے حوالہ کی۔ بلکہ بعض کا عقیدہ ہے کہ ابو الخطاب امام جعفر صادق سے بھی اعلیٰ رتبہ کا مالک ہے۔

خطاب یہ فرقوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ایک زمانہ میں دو امام ہوتے ہیں ایک امامت اور دوسرا "ناطق" رسول کریمؐ امام ناطق تھے اور عثمانی امام "صامت" اسی طرح امام جعفر صادق ناطق تھے اور ابو الخطاب صامت۔ لیکن بعد وفات امام جعفر صادق ابو الخطاب ناطق ہو گیا۔ جیسے حضرت علیؑ بعد وفات آنحضرتؐ ناطق ہو گئے۔

ابو الخطاب سے دو باتیں خاص طور سے منسوب کی جاتی ہیں یعنی ان کی ابتدا اسی نے کی۔ ایک تو "تقیہ" ہے۔ اس کا مفہوم ہے کہ دشمنان دین سے اگر خوف جان و مال ہو اور جھوٹ بول کر بچایا جاسکے تو جائز ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ کسی حد تک اس کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ آیت حسب ذیل ہے۔

"انما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون بایت اللہ واولیاءہم الذین ہم الذین
من کفر باللہ من بعد ایمانہ ان من اکبرہ وقلبہ مطمئن بالایمان لکن
من شرح بالکفر صدراً فعلیہم عذاب من اللہ ولہم عذاب عظیم" (یونس)
حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے وہی جھوٹ پاندھے
ہیں اور یہی لوگ ہیں جھوٹے۔ ایمان لانے کے بعد جو بھی کفر کرے یا سوئے ایسے شخص کے
جو اس پر مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے۔ لیکن جس کا سینہ ہی
کفر کے لئے کشادہ ہے تو اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے لوگوں کے لئے بڑا
عذاب ہے۔

ان آیات میں ان اہل ایمان کا مذکور ہے جو کفار کے نرنے میں آگئے ہوں اور ان پر
بہر کیا جاتے کہ اسلام ترک کریں تو اجازت ہے کہ زبانی اپنی جان بچانے کے لئے بسا

کریں بشرطیکہ وہ دل سے موہن ہوں۔ انہی آیات کے بعد ارشاد ہے کہ
 "نشتم ان ربکم لعلکم تهاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاہدوا و صبروا
 ان ربکم من بعد ہا الخفور حیما (۱۳۱)"

"تحقیق ان کے لئے جنہوں نے ذی سبیل اللہ، ہجرت کی پیچھے اس کے کہ
 ایزادے گئے۔ پھر جہاد کیا اور صبر سے کام لیا۔ تحقیق اس کے بعد تیرا پروردگار بخشش
 والا مہربان ہے۔"

دیگر آیات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ جو شخص ان حالات میں کہ وہ کافروں کو دیکھتا
 ہے کہ زور پکڑ چکے ہیں اور وہ اور اس کا ایمان خطرے میں ہے تو اس کو ایسے محفوظ مقام
 کی طرف ہجرت کرنی چاہیے جہاں یہ خطرہ نہ ہو۔ لیکن جو بالکل ضعیف اور سچے اور ہجرت
 کے لائق نہیں وہ مجبور ہیں۔ اگر وہ بظاہر کافروں میں کافر بن کر رہیں بشرطیکہ دل سے موہن
 ہوں تو معذور ہیں اللہ بخشش والا مہربان ہے۔ لیکن ان میں سے جب بھی کسی کو موقع ملے
 اسے ہجرت ہی کرنی چاہیے زیردورغ مصلحت آمیز جس کے لئے وہ مجبور کئے گئے ہیں
 ایسا ہے کہ اللہ بخشش دے گا۔ بخشش گناہ کی ہے۔ اس کذب کو کذب ہی کہا گیا ہے مگر
 قابل بخشش قرار دیا گیا ہے۔

شیعہ حضرات پر جب یہ اعتراض ہوا کہ حضرت علیؑ جب وصی تھے تو آپ اپنے حق
 سے کیوں خاموشی سے دست بردار ہو گئے۔ اس آیت کی اڑھے کر تقیہ کا جواز ثابت کرتے
 ہوئے کہ جان بچانی لاکھوں پائے۔ لیکن ان آیات میں زیر بحث ایمان ہے اور ایمان
 باللہ۔ حضرت علیؑ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ اسے ترک کر دیں۔ اس کا تو سوال ہی پیدا
 نہیں ہوا۔ البتہ ابو الخطاب نے جو بات پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا عقیدہ تھا کہ
 امام وقت اللہ ہوتا ہے اور اس کے متبعین سب اس کے بندے ہوتے ہیں۔ یہ

ہمارے زمانہ میں بھی ایک مدعی نے "قل یعباد علیؑ" کی تفسیر ہی کی ہے
 کہ نبی وقت کے متبعین سب اس کے بندے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۳۳ کے نیچے)

عقیدہ الباطنیہ تھا۔ جس کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت اسے محسوس ہوئی۔ اس نے فرقہ
 ”باطنیہ“ کی طرح ڈالی اور آیات قرآن کی تاویل بھی اپنے عقیدہ کے مطابق کرتا تھا لیکن
 اس پر بھی کسی نے کچھ تعرض نہیں کیا۔ البتہ شیعہ اثناعشریہ کی روایات سے اٹنا پایا
 جاتا ہے کہ جب امام جعفر صادق کو اس کے عقاید کا علم ہوا تو اس سے یزیدی کا اظہار
 فرمایا اور اس کا مقاطع کیا اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی کہا کہ اس سے کوئی تعلق نہ
 رکھیں۔ محض عقیدہ تو قابل مواخذہ نہیں اور نہ اس پر مواخذہ ہوا۔ اس لئے اس آیت
 کا اطلاق ان حالات میں صحیح نہیں۔

البتہ ایک اور بات ہے۔ وہ یہ کہ ابو الخطاب اپنی حکومت قائم کرنی چاہتا تھا
 بنو امیہ کا تختہ الٹ چکا تھا۔ اب بنو ہاشم باہم دست و گریبان ہو رہے تھے۔ محمد
 نفس ذکیہ نے حجاز سے خروج کیا۔ اس کا مقابلہ منصور کے اپنے برادر زادہ عیسیٰ بن
 موسیٰ اور اس کے بیٹے محمد المہدی سے ہوا۔ نفس ذکیہ نے شکست کھائی اور مارا گیا
 امام جعفر صادق پہلے ہی نفس ذکیہ کے دعویٰ خلافت کے خلاف تھے۔ یہ وقت ایسا
 تھا کہ ہر طرف بد نظمی رونما ہو رہی تھی۔ ابو الخطاب نے بھی موقع غنیمت سمجھا۔ ممکن ہے
 کہ اس نے امام جعفر صادق کو اکسایا ہو۔ آپ کے انکار پر خود دعویٰ امامت بن گیا۔ کوفہ
 ہمیشہ شورش اور شورہ پشتوں کا مرکز رہا ہے۔ ممکن ہے اس نے لوگوں کو چمکے دیا ہو کہ
 امام جعفر صادق اور آپ کی اولاد کے لئے لڑ رہا ہوں۔ اس کے پاس کافی جمعیت تھی
 کوفہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ عیسیٰ بن موسیٰ مذکور نے اسے شکست دی۔ گرفتار ہوا
 اور مارا گیا۔ یہ وہ عقیدہ ہے۔ بارہ امامت اور ایادہ خروج تھا کہ اس نے تقیہ کی اڑ لے کر
 دیر تک پوشیدہ رکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ دین و ایمان سے اس کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱) ہوتے ہیں۔ لیکن یہ گمراہ کن تاویل ہے۔

”ماکان لبشر ان یوقیہ اللہ اللیب والحکم والنبوة ثم یقول للناس

كونوا عبادا لله دون الله ولكن كونوا ربانین“ (۳۴)

کچھ تعلق نہیں۔

”تو بختی“ نے ابوالخطاب کے حالات مفصل لکھے ہیں۔ تو بختی اور دیگر مورخین نے جو کچھ ابوالخطاب کے حالات بہ تعلق امام باقر اور آپ کے بیٹے امام جعفر صادق اور آپ کی اولاد لکھے ہیں ان میں اختلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی واقعات کی حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ اسمعیل بن امام جعفر صادق کی نسبت انا عشری روایات یہ ہیں کہ وہ امام صاحب کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا اور یہ کہ امام صاحب نے اسے عاق کر دیا تھا اس لئے کہ وہ شرابی تھا۔ اور اس کی صحبت اور باتش لوگوں سے تھی۔ اس کے خلاف فرقہ خطابیہ اور اسماعیلیہ یہ کہتے ہیں کہ اسماعیل روپوش ہو گیا تھا اور امام غائب ہے۔ اسماعیل ۱۲۵ھ میں فوت ہوا یا روپوش ہوا۔ امام جعفر صادق کی وفات ۱۲۸ھ میں واقع ہوئی۔ اسمعیلی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ امام صاحب نے اپنے بیٹے موسیٰ کاظم کے حق میں وصیت جانشینی کی تھی اور اسماعیل نے بھی روپوش رہتے ہوئے تسلیم کر لی تھی۔ ابوالخطاب ۱۳۸ھ مطابق ۱۵۵ھ میں مارا گیا۔ ظاہر ہے کہ تمام واقعات امام جعفر صادق کی زندگی ہی میں رونما ہوئے۔ ان واقعات کی حقیقت صرف اتنی ہے اور بالکل صاف اور سیدھی سادی ہے کہ حضرت عثمان اموی تھے اور حضرت علی ہاشمی۔ اور دونوں قبیلے حریفانہ جدوجہد میں سرگرم عمل تھے۔ اول دو خلافتوں کے دور میں دبے رہے مگر جب حضرت عثمان نے عنان خلافت سنبھال لی تو بنو ہاشم کو حریت قبیلہ کا اقتدار ناگوار گزارا۔ اس لئے دو سیاسی فریق پیدا ہو گئے۔ ایک طرف ران علی تھا جو بعد میں شیعیان علی کہلائے۔ جب تک اس فریق میں اکثریت عرب کی تھی یہ خالص سیاسی ہی رہا۔ اور کبھی کوئی مذہبی مباحثہ دربارہ اختلاف اعتقاد نہ ہوا۔ لیکن جب حضرت علی خلیفہ ہوئے اور کوفہ میں خلافت منتقل ہو گیا تو عجمی عنصر غالب آیا۔ عرب اور عجم کے حالات مختلف تھے۔ عرب حاکم اور عجمی محکوم تھے۔ ابتدا میں تو اس کا احساس شدید نہ تھا۔ لیکن بنو امیہ کے دور دورہ میں عرب نے اپنے لئے ایک خاص امتیازی شان حکومت پیدا کر لی تو عجمی اس

ذلت محکومی کو برداشت نہ کر سکے۔ "مواخاة" عرب میں تھی اور موالات "عجم میں۔
 عرب تو بھائی بھائی تھے اور عجمی مسلمان دوست، اسلام نے عرب و عجم کو ملادیا تو اگر
 عرب ہر ایک عجمی کو "مولیٰ" ہی کہتے۔ بعد میں جو بھی فرقہ پیدا ہوا وہ انہی عجمی موالی سے
 منسوب ہے۔ یہ کسی نہ کسی عربی قبیلہ سے وابستہ تھے۔ اس وقت خلافت امویہ تمام
 دنیا پر اسلام پر چھائی ہوئی تھی اور موالی اسی حکومت کے خلاف تھے۔ ان کو ایک
 شکایت یہ تھی کہ ان سے حکومت حسب ارشاد قرآن (انما المؤمنون اخوة) برادر
 سلوک نہیں کرتی۔ دوسرے عجمی ذہنیت میں شخصیت پرستی نمایاں ہے۔ حضرت
 علیؑ اور آپ کی اولاد سے وابستگی اسی شکایت اور عقیدت نے پیدا کر دی۔ ان کے
 علاوہ ایک اور ایرانی فرقہ بھی تھا۔ اس میں زیادہ تر ایرانی زرتشتی اور مانوی اور مزدکی وغیرہم
 کے پیشوا و دین شامل تھے۔ جیسے ہمارے ہندوستان میں برہمن ہیں۔ اسلام نے
 ان کے مذاہب کو مٹا دیا تھا۔ مگر اس آتشکدہ کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔
 یہ بظاہر مسلمان تو ہوتے مگر "زندوستا" ان کے دلوں میں رچا ہوا تھا۔ یہی لوگ مسلمان
 لباس میں زندگی تھے۔ انہی کے زیر اثر عجمی عقیدت جو "اہل بیت" سے تھی اسی عقیدہ
 میں ظاہر ہوئی جو ان کا اپنے اوتاروں اور دیوتاؤں سے تھا۔

مختار ثقفی نے کوشش کی کہ امام علیؑ اصغر زین العابدین کو اپنے ڈھب پر
 لائے جب اس طرف سے بایوس ہوا تو عبداللہ بن زبیر کی طرف رجوع کیا۔ جب
 آپ سے نہ بنی تو محمد حنفیہ کا داعی بنا۔ اسی طرح ابوالخطاب نے امام محمد باقرؑ کو آپ
 کے بعد امام جعفر صادقؑ کو اکسایا۔ مگر یہ اپنے اپنے جد حضرت زین العابدین کی سنت
 پر چلتے رہے۔ اور سیاسیات سے بالکل الگ تھلک رہے۔ چونکہ ان کی روش
 ابوالخطاب کے خلاف تھی۔ اس نے امام ممدوح کے بیٹے اسمعیل کو گانٹھا۔ امام
 اسمعیل "صامت" اور یہ "ناطق" تھا۔ یہ بالکل ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ جو
 اسمعیل اس کے چکے میں آگیا۔ امام جعفر صادقؑ ابھی طرح سمجھتے تھے کہ اس کا انجام
 کیا ہو گیا۔ اس لئے بیٹے کو عاق اور ابوالخطاب کے مردود قرار دیا۔

اس وقت خلافت عباسیہ قائم ہو چکی تھی۔ عبداللہ السفاح کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ بنا۔ یہ امر واقعہ کہ امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیاسیات سے بالکل الگ رہے اور اس کا علم عباسیوں کو بھی تھا اور چاہتے تھے کہ آپ کی اولاد بھی اس میں نہ اچھے۔ مگر ابوالخطاب نے اسمعیل کو پھانس ہی لیا۔ جب امام صاحب کو اس کا علم ہوا تو ابوالخطاب کو دھتکار دیا۔ اس کا جو کچھ انجام ہونا تھا وہ ہوا مگر اسمعیل کی نسبت معلوم نہ ہو سکا کہ ابوالخطاب کے بعد اس پر کیا گزری۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اس خیال سے کہ اس کی سیاسی سرگرمی کہیں تمام خاندان پر مصیبت نازل نہ کرے، گھر سے نکال دیا۔ اسماعیلی روایت کے مطابق آپ روپوش رہے اور اثناعشری روایات کے مطابق باپ کی زندگی میں فوت ہو گئے۔

ابوالخطاب کے شاگردوں میں سے ایک شخص میمون المعروف القلاح تھا۔ اور دوسرا مفضل دونوں ایک ایک فرقہ کے بانی ہوئے۔ مفضل بھی ابوالخطاب کے نقش قدم پر چلا۔ ابوالخطاب کے بعد فرقہ خطابیہ سررم عمل رہا۔ اس کی سرپرستی مفضل بن عمر کر رہا تھا۔ اور اسمعیل کے ساتھ گاڑھی چھن رہی تھی۔ امام صاحب کو معلوم ہوا۔ تو مفضل پر برس پڑے اور فرمایا کہ

او کافر، او مشرک، تجھ میں اور میرے بیٹے میں کیا امر مشترک ہے کیا

تو چاہتا ہے کہ میرے بیٹے کو گمراہ کرے اور ہلاک کرے؟

یہ واقعہ کشتی نے لکھا ہے۔ امام صاحب کا اشارہ ایک تو فرقہ خطابیہ کے عقائد اور دوسرے سیاسی سرگرمی کی طرف ہے۔

امام صاحب کی وفات کے بعد امام موسیٰ کاظم آپ کا جانشین ہوا۔ اور باپ کی طرح سیاسیات سے الگ رہا۔ منصور اور جہدی اور ہادی اور ہارون الرشید عباسی خلفاء کا عہد پایا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ دوازدہ امام سیاسیات سے الگ ہی رہے۔ مگر اسماعیلی شاخ سیاسیات میں ابھی رہی۔ امام جعفر صادق کی وفات کے بعد ابوالخطاب کے شاگرد رشید نے محمد بن اسمعیل کو گمانٹھ لیا۔ اور طبرستان کی طرف

دونوں چلے گئے یہ شخص میمون القدرح کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے حسب و نسب میں ایک نیا شاخسانہ نکالا۔ اور یہ پختہ عقیدہ فرقہ خطابیہ اور اس کی تمام شاخوں کا ہے کہ بیٹا حقیقی روحانی ہے نہ کہ جسمانی۔ جسمانی تو ایک مرد اور عورت کے نکاح کا نتیجہ ہے۔ لیکن ایک معلم جو ایک شاگرد کی تعلیم و تربیت کرتا ہے اس پرورش سے زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے جو ہاتھ بھی اپنے بچوں کی کرتے ہیں۔

خود حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ

”فمن تبعنی فانه منی ومن عصى فانك عفو رحيم“ (۱۳۷)

”جو میری ذریت سے (میرا اتباع کرے گا وہ مجھ سے ہے اور جو نافرمانی کرے گا

تو بخشنے والا مہربان ہے۔“

معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی بیٹا ہی ہے جو آپ کا اتباع کرے یعنی آپ کی تعلیم و تربیت کے تحت موجد ہو۔ اور حضرت نوحؑ نے کہا کہ

”رب ان ابني من اهلي وان وعدك الحق وانت احكم الحاكمين

قال ينجح انه ليس من اهلك، انه عمل غير صالح، فلا تسئلن ماليس

لك به علم، اني اعطتك ان تكون من الجاهلين“ (۱۳۸)

”نوحؑ نے فریاد کی کہ اے میرے پروردگار یہ میرا بیٹا میرے اہل سے ہے (جو

عرق ہو رہا ہے) اور تیرا وعدہ سچا ہے تو بہتر حکم کرنے والا ہے۔ جو اب دیا کہ اے نوحؑ

تحقیق یہ تیرے اہل ہی سے نہیں، تحقیق اس کا عمل غیر صالح ہے تو ایسی بات کی

نسبت مت پوچھ جس کا تجھے علم نہیں۔ تحقیق میں تجھے نصیحت کرتا ہے (کہ اس

بارہ میں زیادہ نہ پوچھ) ایسا نہ ہو کہ تو جاہل بنے۔“

نوحؑ کا بیٹا اگرچہ جسم کے لحاظ سے تھا مگر جب نوحؑ کا اتباع نہ کیا تو نوحؑ کے

اہل میں سے نہ رہا۔ اور قرآن میں ہے کہ ”ملۃ ابراہیم ابراہیم“ یہ ملت (اسلام) تمہارے

باپ ابراہیمؑ کا ہے یعنی تعلیمی باپ کا نہ کہ جسمانی باپ کا۔

نصیر الدین طوسی کا تعلق فرقہ اسماعیلیہ سے ہے وہ لکھتا ہے کہ

”امام کی اولاد چار قسم کی ہے۔ ایک روحانی یا ”ور معنی“ جیسے سلمان فارسی کہ آنحضرت نے اس کے پارہ میں فرمایا کہ ”سليمان من اهل بيتي“ دوسرے جسمانی یا ”شکل“ تیسرے روحانی اور جسمانی جیسے حسنؑ۔ چوتھے جسمانی اور روحانی اور ”در حقیقت“ جیسے امام حسینؑ۔

رشید الدین ایرانی مورخ کہتا ہے کہ

”جعفر صادق نے اسمعیل کے بیٹے محمد یعنی اپنے پوتے کو میمون القدرح کے پاس طبرستان میں بھیجا۔ میمون کا ایک بیٹا عبد اللہ تھا اس نے محمد کی تربیت میں دیا۔ اور عبد اللہ کو محمد بن اسماعیل کا بیٹا مشہور کیا کہ وہ محمد بن اسماعیل کا ولی عہد ہے۔ جب عبد اللہ سترہ برس کا ہوا تو میمون نے اس کی امامت کا اعلان کر دیا اور کسی شیعہ نے اعتراض نہ کیا۔ اس طرح خلفاء بنو فاطمہ اگرچہ من ولد القدرح تھے مگر بنو فاطمہ ہی کہلاتے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ اثنا عشریہ اور سنیوں نے ان کو بنو فاطمہ تسلیم نہیں کیا۔ عند الدولہ ولیمی جب بغداد میں خلافت عباسیہ پر چھا گیا تو اس نے فاطمی خلیفہ العزیز کو لکھا تھا کہ اپنا حسب نسب ثابت کرو۔ عند الدولہ شیعہ امامیہ تھا۔ اسی نے سب سے پہلے مجالس عزرا اور علانیہ ماتمی جلوس اور تبر اور سب کو رولج دیا جس کو بعد ازاں صفوی خاندان نے راج دھرم قرار دیا۔

اسماعیلی عقاید کے مطابق امامت دو قسم کی ہے۔ ایک امام ”مستودع“ اور دوسرا امام ”مستقر“ دونوں کو امامت کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مگر امام ”مستودع“ ان اختیارات کو اپنی اولاد میں ورثاً منتقل کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ لیکن امام ”مستقر“ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہے امامت کے اختیارات بدریغ وصیت سونپ دے۔ امام ”مستودع“ کے پاس امامت بطور ”وہبیت“ یا امامت ہوتی ہے۔ اصل مستقر امامت امام مستقر ہی ہوتا ہے۔ امام مستقر ہی امامت

کسی امام مستودع کو "تفویض" کر سکتا ہے۔ تفویض کا اختیار امام مستودع کو حاصل نہیں۔ اس عقیدہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تمام خلفاء بنو فاطمہ "من ولد القدرح" ہی تھے یہ ممکن ہے کہ ابتدائی خلفاء قدرح کی نسل سے ہوں جو صرف امام مستودع تھے۔ چونکہ یہ لوگ نہایت راہزوری سے کام لیتے تھے اور آج تک لے رہے ہیں۔ اس لئے بیرونی دنیا کو ان کے راہزورن پر وہ کا علم نہ ہو سکا مگر ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کون صحیح النسب فاطمی ہے اور کون قدرحی یا کسی دوسرے امام مستودع کی نسل سے۔ ان لوگوں کو ضرور "انام ناطق" اور امام صامت، امام غائب اور امام ظاہر اور امام مستودع و مستقر کی اصطلاحات اختراع کرنی پڑیں۔ اس لئے ان تمام مذہبی تحریکات کی تہ میں سیاسی اعتراض کارفرمائیں۔ اس وقت بنو عباس کے ہاتھ میں تنان حکومت تھی۔ ان کی کڑی نگرانی بنو فاطمہ اور علویوں پر تھی۔ یہ بھی دعویٰ دار خلافت ایسے ہی تھے، جیسے بنو عباس۔ بلکہ بنو فاطمہ اپنا حق فائق سمجھتے تھے۔ نفس فکیہ اور منصور عباسی میں جو خط و کتابت دربارہ حق خلافت ہوئی اس کا تعلق تاریخ خلافت اسلامیہ سے ہے اور ہم نے اس کا مذکور علیحدہ کیا ہے۔

طرف دار بلکہ جاں نثار بن بنو فاطمہ نے یہ مناسب سمجھا کہ اولاد علیؑ بالخصوص بنو فاطمہ کی جانوں کی حفاظت کی جائے۔ اس لئے جب تک عباسیوں کا زور رہا ان کو پھپھپائے رکھا۔ اور یہ "غائب" کہلائے اور علانیہ خود امامت کے فرائض امام غائب کی زیر ہدایت انجام دیتے رہے۔ یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ فاطمی ہیں یا خطابی یا قدرحی۔ وہ بھی اپنے آپ کو بنو فاطمہ کہتے اور لوگ بھی یہی سمجھتے رہے۔ اس طرح وہ اپنی جان بنو فاطمہ پر قربان کرتے رہے۔ ان کے لئے یہ بڑی فخر کی بات تھی کہ وہ کسی امام مستقر کے "ابن" یا "ابو" ہیں۔

تہنیت | رسم تہنیت بہت پرانی ہے اور اہم آریہ و سامیہ میں تسلیم کی گئی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں اب بھی یہ رسم شاستری رُو سے نہ صرف جائز ہے بلکہ ہر ایک شخص کے لئے جس کی اولاد نہ ہو واجب ہے کہ کسی شخص کو

اپنا "متبنی" بنائے۔ جو اس کے وفات کے بعد اس کی "کریا کرم" کرنے۔ ورنہ وہ "سورگ" میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک درخت میں کسی دوسرے درخت کی شاخ پیوند کی جائے۔ اصل درخت اس شاخ کی پرورش کرتا ہے۔ اس اصل درخت کی تمام اپنی شاخیں کاٹ دی جاتی ہیں اور یہی پیوند ہی شاخ ہاتی رہ جاتی ہے۔ پرورش پاتی اور چل لاتی ہے۔

ایام باہلیت یا ازمنہ تاریک میں ہر ایک خاندان اور ہر ایک قبیلہ اور قوم کی فوت کا اندازہ اس کی کثرت نفوس پر کیا جاتا۔ اس لئے یہ تقاضائے حالات تھا کہ "تبنیت" ایک مذہبی فریضہ قرار دیا گیا۔ بلکہ اس ضرورت کا احساس اس شدت کا تھا کہ "نیوگ" بھی کارِ ثواب سمجھا گیا۔ غرض یہ تھی کہ اگر کوئی شخص خود اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو۔ تو دوسروں سے یہ "دان" لے۔ یہ اولاد جو بذریعہ تبنیت یا نیوگ حاصل کی جاتی اس شخص کی اولاد کہلاتی جس نے حاصل کی ہے اور اسی کی نسل کہلاتی۔ اور اب بھی کہلاتی ہے۔ یہ جائز نہیں کہ اس اولاد کو اس کے اصل باپ کے نام سے پکارا جائے۔ وہ اصل باپ سے بالکل قطع تعلق کر چکا ہے۔ اور اس کا وارث بھی نہیں۔ وارث ایسی کا ہے جس کا وہ متبنی ہے۔

اس رسم "تبنیت" کا مذکورہ توراہ (کتاب پیدائش) میں بھی ہے۔ رسم یہ تھی کہ اگر ایک بھائی بے اولاد فوت ہو جائے تو دوسرے بھائی کا فرض ہے کہ اپنے بھائی کی نوج سے اپنے متوفی بھائی کے لئے اولاد پیدا کرے تاکہ متوفی کا نام زندہ رہے۔ یہ اولاد جو اس کی بھادجہ کے بطن سے ہوگی متوفی بھائی کی کہلائے گی۔ لیکن اس طرح صحیح حسب و نسب قائم نہیں رہتا۔

دیران میں بھی یہ رسم قدیم الایام سے جاری تھی۔ ہندوستانی نیوگ کی مثل وہ رسم بھی تھی جس کو "متہ" کہتے ہیں۔ ہمسایہ ملک عرب میں بھی متہ کا رواج ہو چکا تھا۔ ہم آریہ میں نہ صرف ہر ایک شخص کا صاحب اولاد ہونا واجب ہے بلکہ یہ بھی پسندیدہ امر تھا کہ اولاد تو منداور خوب صورت ہو۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اچھی نسل کے سانپ سے اولاد

حاصل کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس غرض کے لئے ایک جماعت نے اپنی زندگی وقت کر رکھی تھی۔ یہ مجرد سادہ و سادہ تھی۔ اور اب بھی ہیں۔ حکیم مزوک نے ایران میں اس رسم کو نمایاں کیا۔ شہنشاہ قباد نے اسے راج دھرم قرار دیا لیکن اس کے بیٹے نوشیرواں نے حکیم بوزرجمہر کے مشورے سے مزوک کو قتل کیا اور یہ رسم قانوناً ممنوع قرار دی۔

تینیت کی رسم عرب میں بھی جاری تھی۔ چنانچہ بعثت سے پیشتر آنحضرتؐ نے زید کو اپنا متبنی بنا لیا تھا۔ اور سب لوگ زید کو ابن محمدؐ کہتے۔ دستور یہ تھا کہ بیٹا خواہ حقیقی یا صلیبی ہو یا متبنی اس کی زوجہ مطلقہ ہو یا بیوہ کا عقد نکاح اس شخص سے ناجائز تھا جو باپ حقیقی یا مصنوعی ہو۔ بعثت کے بعد قرآن حکیم نے اس رسم تینیت کو ناجائز قرار دیا۔ سورہ نساء میں واضح الفاظ میں بتایا گیا کہ وہی عورت حرام ہے جو صلیبی بیٹے کی ہو

سورہ احزاب میں زید ہی کی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا گیا کہ تمہارے بیٹے وہی ہیں جو تمہارے صلب سے ہیں۔ تینیت بالکل غیر فطری رسم ہے۔ سینے میں کسی شخص کے دودل نہیں ہوتے۔ جو تعلق فطرۃ اپنے حقیقی بیٹے سے ممکن ہے وہ غیر شخص کی اولاد سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے خواہ بغرض پرورش یا تعلیم و تربیت تم ان کی سرپرستی قبول کرو۔ تو ان کو ان کے حقیقی باپوں کے نام سے پکارو اور اگر معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے "انوان فی الدین" ہیں۔

"احسان" بلاشبہ مذہبی فریضہ ہے لیکن اصلی وارث اصلی اولاد ہی ہے۔

"ما کان محمدؐ اباً لاحد من رجالکم و رکن رسول اللہ

وخاتم النبیین" (۳۲)

"محمدؐ تم میں سے کسی شخص کا باپ نہیں لیکن وہ اللہ کا رسول اور

خاتم النبیین ہے۔"

اگر کوئی شخص بلحاظ تعلیم و تربیت کسی کا باپ ہوتا تو آنحضرتؐ کا زیادہ حق تھا کہ وہ

امت مسلمہ کے باپ کہلاتے ہیں جبکہ واضح الفاظ میں ارشاد قرآن ہے کہ

”رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْعِلْمَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ“ (۲۳)

یہ معزز رسول جو تم میں سے مبعوث کیا گیا ہے تم پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے اور تم کو پاک بناتا ہے اور کتاب کی تعلیم اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے :

ان نصوص قرآنی کے ہوتے کسی معلم کو باپ کہنا اور اپنی نسل کو اس سے منسوب کرنا گمراہی ہے۔ نسل تو حقیقی باپ سے ہی جاری رہتی ہے۔ اور یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ تبینیت بلاشبہ خلاف فطرت رسم ہے۔ اب ہم ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو فرقہ خطیبیہ و میمونہ و اسماعیلیہ نے آیات قرآن سے اخذ کی ہیں

آیت: ”ملتنا ایبیکم اباہم“ کا خطاب ذریت ابراہیم ہی سے ہے قرآن کے اسلوب بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جب وہ اہل کتاب کو مخاطب کرتا ہے تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس کوئی صحیفہ آسمانی ہے۔ بالخصوص یہود و نصاریٰ جب ”یا ایہا الذین آمنوا“ سے خطاب فرماتا ہے تو مخاطب صرف مسلمان ہیں جو آنحضرت کی رسالت پر ایمان لائے ہیں۔ بنی اسرائیل اور بنی اسمعیل دونوں ذریت ابراہیم ہیں۔ آیت زیر بحث کا خطاب انہی سے ہے جن کے دل میں اپنے مورث اعلیٰ کا احترام ہے۔ اور وہی اس آیت سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ جن اقوام کو حضرت ابراہیم سے کوئی نسلی تعلق نہیں ان کو یہ کہنا کہ اسلام تمہارے باپ ابراہیم کی اولاد ہے بے فائدہ اور بے معنی ہے۔

حضرت نوحؑ کا یہ کہنا کہ یہ میرا بیٹا اور اہل ہے حقیقت کے خلاف تھا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

”ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَاتِ نُوْحٍ وَّامْرَأَاتِ لُوطٍ کَانَتَا تَحْتَ عِبْدٍ مِّنْ عِبَادِنَا مَالِحِينَ فَعَاسَتْهُمَا فَلَمْ يَغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ

شیئا ذریعہ اذ خلا النار مع الداخلین (۲۸)

ان لوگوں کے لئے جو کافر ہوئے اللہ مثال بیان فرماتا ہے نوح کی عورت کی اور لوط کی عورت کی کہ دونوں ہم اسے دونیک بندوں کے تحت تھیں۔ تو دونوں نے حیانت کی تو وہ اللہ کے عذاب کو اپنے آپ سے کچھ بھی دفع نہ کر سکیں ان کو کہا کہ آگ میں اوروں کے ساتھ جو داخل ہو رہے ہیں تم بھی داخل ہو جاؤ۔

قرآن میں بہ تعلق زن و شوئی مرد اور عورت کو اپنی فروج کی حفاظت کا حکم دیا گیا۔ اور عورت پر تو مرد کا اتنا ہی حق ہے کہ وہ کسی غیر مرد کے پاس نہ جائے۔ مرد پر بہت کچھ ذمہ داری اس کے علاوہ بھی ہے۔ اس تعلق کے ہوتے ہوئے عورت خائفہ اسی صورت میں ہوگی اگر اس کا چلن اچھا نہ ہو۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جسے حضرت نوح علیہ السلام نے بنایا اس کا بیٹا نہ تھا۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ تجھے اس حقیقت کا علم نہیں۔

رہا یہ سوال کہ وہ حضرت نوح کا اہل تھا کہ نہیں؟ اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو بحیثیت بیٹا ہونے کے اور دوسرے بلحاظ اتباع۔

بیٹا تو وہ تھا ہی نہیں اس لئے اس لحاظ سے وہ اہل نہ تھا۔ آیت قرآنی کا یہ مفہوم ہے کہ اگر اس کا عمل صالح ہوتا تو وہ بلا لحاظ اس امر کے وہ تیرا بیٹا نہ تھا پھر بھی بچ جاتا۔ چونکہ اس کا عمل غیر صالح تھا اس لئے بچ نہ سکا۔

اس تہذیب نے ایک اور سنت الجھن پیدا کر دی۔ امام "مستودع" خود تو اسماعیلی عقاید کے مطابق امام اس وقت تک ہے جب تک اپنے فراتض و ولایت "ادا کرتا ہے لیکن اس کی اولاد امام نہیں کہلائے گی۔ اسکی اولاد کے لئے ایک اصطلاح "سید" وضع کی گئی۔ یعنی اس کی اولاد سید کہلائے گی نہ کہ امام۔

ہمدانی نے چند اسماعیلی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جس میں ایک کلام پیر" بھی ہے۔ اس

میں اس اصطلاح کی تشریح کی گئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دنیا نے اسلام میں اکثر خاندان اپنے آپ کو سید کہتے ہیں کیا وہ دراصل بنو فاطمہ ہیں؟

ناصر خسرو اپنے سفر نامہ میں بحرین کے قرامطہ کا ذکر کرتا ہے۔ ناصر خسرو خود بھی علوی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں برسراقتدار اپنے آپ کو سید کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اصطلاح کو ان ایام میں وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو اب سمجھی جاتی ہے یہ لوگ نہ بنو فاطمہ تھے اور نہ اپنے آپ کو کہتے اور نہ سمجھتے جاتے۔ یہ تمام تحریری اسی تہنیت اور ان اصطلاحات موضوعہ کی ہے کہ آج کسی کا صحیح نسب دریافت کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ بنو فاطمہ اپنے آپ کو امام ہی کہتے رہے۔ سید غیر بنو فاطمہ ان کے نائب یا داعی تھے۔

قرامطہ فرقوں کا نام بنام شملہ کرنا بے فائدہ طوالت ہے۔ ان کے حالات اب صرف تاریخ کے صفحات پر رہ گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر ختم ہو چکے ہیں اور زمانہ ان کو فراموش کر چکا ہے۔ ہم صرف چند مشہور فرقوں کے حالات لکھتے ہیں جنہوں نے کچھ عرصہ خوب بڑبڑا کر مچائی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام جعفر صادق کی وفات کے بعد شیعیان دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو اسمعیل اور محمد بن اسمعیل کو امام تسلیم کرتا ہے۔ اور دوسرا امام جعفر کے بیٹے موسیٰ کاظم کو۔

اسماعیلی یہ کہتے ہیں کہ اسماعیل امام صاحب کی زندگی میں فوت نہیں ہوا۔ بلکہ دشمنوں کے خوف سے امام صاحب نے اسے چھپائے رکھا۔ اور اس کی وفات مشترک ہے۔

امامیہ اثنا عشریہ یہ کہتے ہیں کہ اسمعیل فوت ہو چکا تھا اور امام صاحب نے اپنا بیانشین موسیٰ کاظم کو نامزد فرمایا۔

یہ اسماعیلی بھی بعد ازاں دو فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک تو خالص اسماعیلیہ

کہلایا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اسمعیل فوت نہیں ہوا لیکن "غائب" ہے۔ اور وہ "قائم معطر" ہے۔ اور کسی وقت اس کا ظہور ہوگا۔

دوسرا فرقہ محمد بن اسمعیل کو امام تسلیم کرتا ہے اور اسمعیل کی وفات کا قائل ہے اس فرقہ کو "مبارک" کہتے ہیں۔ مبارک ایک شخص اسمعیل کا "مولیٰ" تھا۔ فرقہ خطابیہ بھی اس سے ملحق ہو گیا۔ پھر یہ فرقہ بھی کئی فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان میں سے ایک "قرمطہ" ہے جو اسی نام کے ایک شخص سے منسوب ہے۔ قرمطیہ کا زور عباسی خلفاء المکتفی اور المقتدر کے عہد میں رہا۔

الاجناد سے ایک شخص قرمطی سلیمان ابن الحسن نے خروج کیا۔ اس نے حجاج تک پر حملہ کیا اور عین اس وقت جب وہ طواف کعبہ میں مشغول تھے۔ لاشیں چاہ زمزم میں پھینک دیں۔ اس کا مقابلہ کئی دفعہ عباسی سپاہ سے ہوا اور اکثر کامیاب رہا۔ آخر ایک لڑائی میں شکست کھا کر بحرین کی طرف بھاگا۔ یہاں ایک عورت نے اسے پھر مار کر ہلاک کر دیا۔

قرمطی شمالی افریقہ اور عرب اور عراق کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے چونکہ قرمطی حجر اسود بھی اکھاڑ کر لے گئے تھے اور حجاج کا راستہ بھی بند کر رکھا تھا اس لئے دنیائے اسلام میں مہمان پیدا ہو گیا۔ اسمعیلی عبید اللہ المہدی شمالی افریقہ میں اپنی سلطنت قائم کر چکا تھا۔ جب اسے اطلاع ہوئی تو بہت برا فروختہ ہوا۔ قرمطی اس کے داعی تھے اور بنو فاطمہ کے نام پر شمالی افریقہ میں سلطنت مستحکم کر چکے تھے عبید اللہ کے حکم کے مطابق قرمطیوں نے حجر اسود قاضی نیشاپور کے حوالے کر دیا جس نے پھر سے کعبہ میں نصب کر دیا۔ یہ واقعہ ۳۲۹ھ کا ہے۔

بحرین میں قرمطہ کا بہت زور رہا۔ یمن پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ اور عراق میں عرصہ تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ خوارزم اور غزنی میں بھی قرمطیہ یا باطنیہ کا طوطی کچھ عرصہ بولتا رہا۔ ملتان واقع پنجاب تو ان کا گڑھ تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے ان کا قلع قمع کرنے کے لئے خاص اہتمام کیا۔ ہزاروں قرمطی مارے گئے۔ اگرچہ اس فرقہ

کا نام بیوا اب کوئی نہیں مگر عقاید اہل ایران کے دل پر چھوٹے ہوئے کہ ہاں کے نام
میں بھی باقی اور بہانی تحریک کے انہیں چہرے زور کر دیا۔
شہریت فی ہاں ہے کہ

فرقہ باطنیہ کے بہت سے عقب ہیں عراق میں ان کو باطنیہ اور فرام
اور مزدکیہ کہتے ہیں۔ خراسان میں تعلیمیہ اور مجددہ۔ لیکن وہ اپنے آپ کو
اسماعیلیہ ہی کہتے۔

امروا قعہ بھی یہی ہے کہ قرمطی اور صباحی جو حسن بن صباح سے منسوب ہے۔ اسماعیلیہ وہ
ہی تھے۔ اور تمام دنیا سے اسلام میں ان کے داعی اور مبلغ پھیلے ہوئے تھے اور ہر ایک ملک
اسی بہرہ میں ظاہر ہوتے جو اس جگہ کے ذہنی حالات کے مناسبت سمجھتے تھے۔ ہمارے
زمانہ میں ہزارہی نس محمد المعروف آنماخان بالقابہ اب اس فرقہ کی قیادت کر رہے
ہیں۔ ہندوستان میں تو آپ کو خدا سمجھ کر آپ کے معتقدین پوجتے ہیں یہ سب سنیوں
میں۔ سلطان ابھی تک ان کا خاص سرکاری شہر ہے یہ شہر کہلاتے ہیں۔ ایران ایک
عالیشان روضہ شمس سبز وطنی کہے جو اسماعیلی تھے۔

اسماعیلیہ

فرقہ اثنا عشریہ بارہ اماموں کو تسلیم کرتے ہیں۔ جن کا شمار اہل سنت
و الجماعة بھی ملوگا۔ لکھتے ہیں ہم نے شہرہ امام حسین کے نام
یقیناً لکھوئے ہیں۔

یہ امر خاص قابل ذکر ہے کہ ان میں سے کبھی کسی نے سیاسیات سے تعلق نہیں لیا
سوائے امام حسن و اودامام حسین کے۔

امام حسن رضی اللہ تعالیٰ تو دعویٰ خلافت سے دست بردار ہو گئے تھے۔ امام
حسین کی نسبت کہا جاتا ہے کہ آپ نے خروج کیا اور کربلا میں شہید ہوئے۔ تعجب
ہے کہ ابن خلدون سامورخ اس واقعہ کو اشارہ بھی بیان نہیں کرتا یا تو وہ اسے
قابل ذکر اس لئے نہیں سمجھتا تھا کہ یہ واقعہ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے رونما نہیں ہوا اور
اگر ہوا تو اس کی صورت اور اصلیت کچھ اور ہی تھی اور یہ بھی قابل ذکر نہیں۔

خود یہ امام سیاسیات سے الگ رہے۔ مگر ان کے متبعین نے ان کے حق
 خلافت ہی کو اپنے مذہب کا سنگ بنیاد بنایا۔ اگرچہ ہم نے تمام فرقوں کے حالات
 قلم بند نہیں کئے۔ چند مشہور فرقوں کے حالات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ان کے
 عقائد کی تہ میں سیاسی اغراض ہی کار فرما تھیں۔ "بغدادی" تو ان فرقوں کو یہ ملحق کرتا ہے
 کہ تم کہتے ہو کہ ابو بکر و عمر و عثمان نے حضرت علی کا حق خلافت غصب
 کیا۔ تمہارے بڑوں نے کیا کیا۔ اولاد علی کا حق امامت غصب کر کے
 خود امام بن بیٹھے اور اس پر دعویٰ محبت اہل بیت ہے۔ اسی طرح
 ایرانیوں نے کیا کیا۔ مانا کہ اول تین خلفائے حضرت علی کا حق غصب
 کیا۔ تم نے بھی تو وہی کچھ کیا۔ ایران کے عادل و عرض میں مذہب اتنا
 عشری راج دھرم ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ کسی صحیح نسب سید کو یہ
 غصب شدہ حق واپس دیتے۔ علی محمد باب سید تھا۔ اس کو ناصر الدین
 قاچار شاہ ایران کے عہد میں قتل کیا گیا۔ اس نے دعویٰ خلافت یا حق
 بھی نہیں کیا تھا۔ جن عقائد کا اظہار اس نے کیا تھا اس سے پیشتر اکثر
 شیعہ فرقوں کا یہی عقیدہ تھا کہ امام وقت منظر اہل بیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب فرقے سیاسی تھے البتہ اپنا رنگ جمانے کے لئے مذہب
 کی اڑلی۔ نادر شاہ اور ہمارے زمانہ میں رضا شاہ پہلوی نے اس حقیقت کو اچھی طرح
 سمجھ لیا تھا اور جو کچھ نقصان تمام دنیائے اسلام کو اس فرقہ بندی اور شاہ انگیز تفرقہ سے
 پہنچ رہا ہے ان پر منکشف تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سنی اور شیعہ کا تنازعہ ختم ہو جائے
 مگر اہل عرض نے ختم نہ ہونے دیا۔ جبکہ اصولاً کوئی اختلاف نہیں تو فرقہ کو اتنی
 اہمیت کیوں دی جاتی کہ اسلام کے لئے خطرہ ہو۔

شیعہ فرقے اور بھی بہت ہیں مگر ہم نے صرف انہی کا ذکر کیا ہے جنہوں نے تاریخ
 میں کچھ نام پیدا کیا۔ مناسب ہے کہ چند اور فرقوں کے مختصر حالات عام واقفیت
 کے لئے قلمبند کئے جائیں جن کا تعلق شیعہ سے ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ کوفہ ہمیشہ شورش کا مرکز رہا ہے۔ اور یہاں شیعیان علی کی اکثریت تھی۔ ان میں غالب اکثریت نہ نو مسلم مجوسیوں کی تھی۔ دیوتا اور بلوک پرستی امام آریہ کا امتیازی نشان رہا ہے اور یہ عقیدہ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ آج تک مجوسیوں نے اس عقیدہ کو ترک نہیں کیا۔

ذامہ شیعہ یہ ایک غالی فرقہ شیعہ ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ دراصل اللہ تعالیٰ اور آپ نے محمدؐ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا۔ لیکن محمدؐ نے رسالت کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اور لوگوں کو اپنی رسالت کی دعوت دی۔ اسی فرقہ کی ایک شاخ کا یہ عقیدہ ہے کہ جبرئیل نے غلطی کی، علیؑ کو چھوڑ کر محمدؐ پر وحی نازل کی۔

راوندیہ یہ فرقہ شیعیان آل عباس ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد امامت اولاد عباس کا حق ہے۔ یہ فرقہ عبداللہؑ راوندی سے منسوب ہے۔ اس فرقہ کی ایک شاخ عباسی اور آپ کی اولاد کی الوہیت کی قائل ہے۔ ابو جعفر منصور خلیفہ عباسی کو ان سے جان بچانی مشکل ہو گئی تھی۔ ان کا ایک ہجوم کوفہ میں منصور کی زیارت اور پرستش کے لئے آیا۔ جب محافظ سپاہیوں نے مزاحمت کی تو حملہ کر دیا۔ وقت پر مدد پہنچ گئی ورنہ خدائے راوندیاں کی خیر نہ تھی۔

رجحیہ یہ فرقہ حضرت علیؑ کی رجعت کا قائل ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ آپؑ دوبارہ تشریف لائیں گے اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے قاتلوں سے انتقام لیں گے۔

زیدیہ زیدیہ ان تمام فرقوں کا نام ہے۔ جن کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت امام علیؑ زین العابدین ابن حسینؑ کے بعد امام محمد باقرؑ کی جگہ زید بن علیؑ امام ہیں۔

زیدیہ فرقوں کا یہ عقیدہ ہے کہ امامت بنوفاطمہ کے لئے مخصوص ہے لیکن امام عالم اور زاہد اور شجاع اور سخی اور بعض کے نزدیک خوب صورت ہونا چاہیے۔ یعنی بنوفاطمہ میں سے یہ اوصاف امام میں ہونے واجب ہیں یعنی نسیا اور وصفا

امام ہوئے اور یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ بیعت وقت اور امام ہوں مگر مکان وہ
 ہوں۔ حضرت زید اور آپ کے بھائی امام محمد باقر میں اکثر مناظرات روایت ہو
 ہیں۔ جن کی صحت مشتبہ ہے۔ حضرت زید خلافت ابو بکر و عمر کو تسلیم کرتے تھے
 شیعیان علی آپ کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ آپ کناستہ کو قہ میں لائے گئے
 آپ کے بعد آپ کے بیٹا یحییٰ نے دعویٰ امامت کیا اور خراسان کی
 طرف چلا گیا وہاں اکثر لوگ آپ معتقد ہو گئے۔ آپ کی وفات کے بعد امامت محمد اور
 ابراہیم میں منتقل ہو گئی۔ ان دونوں نے مدینہ سے خروج کیا مگر ناسے گئے۔ کچھ
 عرصہ کے بعد زید یہ فرقے امامیہ میں مدغم ہو گئے۔ اور شیعہ امامیہ کی طرح خلفائے ثلاثہ
 پر طعن کرنے لگے۔ چونکہ ابتدا میں زید یہ خلافت ابو بکر و عمر تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے
 شیعہ امامیہ ان کو "رافضہ" کہنے لگے۔ مگر بعد میں یہ نام اہل سنت والجماعت نے
 تمام شیعوں کے لئے تجویز کیا۔ شیعہ سنیوں کو "ناصبی" کہنے لگے۔

فرقہ زید یہ اب یمن میں حکم ران ہے۔ اور یہاں امام حضرت زید کی اولاد سے
 ہے۔ اور امام یمن کہلاتا ہے۔

فرقہ زید یہ کے بھی بہت فرقے ہیں۔ خصوصاً ملک امام یمن کا انتخاب ہوتا رہا
 اگرچہ انتخاب اولاد زید ہی میں محدود تھا۔ مگر امام یمن وہ تمام اوصاف
 ہوتے جن کا مذکور ہو چکا ہے۔ امام اور اس کی رعایا ہمیشہ انگریزوں کے مخالف
 رہی ہے۔ اور انگریزوں نے بھی اس کو ممکن نقصان پہنچایا۔ یمن کی سلطنت کا کچھ حصہ
 اس کے حریف حکمرانوں کو دے دیا۔ اب امام کا انتخاب نہیں ہوتا۔ بلکہ امامت موروثی
 شخص ہی ہو گئی ہے۔ ایک فرقہ زید یہ جو حال ہی کی پیداوار ہے یہ کہتا کہ حضرت علی نسبتاً
 امام یا خلیفہ نہ تھے بلکہ وصفا تھے۔ نسبتاً تو اور بھی مستحق تھے اور عباسی دعوت بردار ہی
 تھے۔ ان لوگوں کی فقہ شافعی سے ملتی جلتی ہے۔ یہ فرقہ اہل سنت والجماعت کے
 اقرب ہے۔

ان تمام فرقوں کے عقاید سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ان میں کم و بیش اہل تشیعہ

اور اہل بدعت اور قسا مگان رجعت اور تناسخ ہیں اور یہ عقائد بالکل غیر اسلامی ہیں مگر ایران اور ہندوستان بلکہ تمام اہم آریا میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ مسئلہ امامت اہم ہے۔ لیکن اس میں بھی شیعہ حضرات نے غلو سے کام لیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ تمام اسلامی فرقوں کا اس پر اتفاق ہے کہ امام صاحب کا وجود ہر ایک زمانہ میں ضرور ہونا چاہیے۔ خواہ وہ ایک ہو یا ایک سے زیادہ مختلف مقامات میں ہوں مگر خوارج اور معتزلہ کے بعض فرقے امامت کے وجود کے قائل نہیں۔ شیعہ امامت بہ نص کہتے ہیں۔ سنی اور معتزلہ اور خوارج امامت کا اختیار کے قائل ہیں۔ یہ سب بحث ہی فضول اور محض دماغی تعیش ہے۔

ہم اس موضوع پر مناسب بحث کر چکے ہیں۔

جہاں تک عقائد کا تعلق ہے اگر ہم سیاسیات سے الگ ہو کر جائزہ لیں تو معتزلہ اور فرقہ باطنیہ کی کچھ باتیں و تخیل معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ اصولاً یہ صحیح ہے کہ آیات متشابہات جو قرآن میں مذکور ہیں تاویل کی محتاج ہیں مگر ان کے ذہن میں اس اصل اصول کا تصور صاف صاف میر نہ تھا۔ باطنیہ تو سیاسیات میں الجھے ہوئے تھے اور معتزلہ پر فلسفہ یونانی اثر انداز ہو رہا تھا۔ فلسفیوں کے اپنے نظریوں میں اختلاف ہے ہمیشہ سے رہا اور اب بھی ہے۔

اس موضوع پر ہم مناسب مقام پر بحث کریں گے۔

کرمیہ | ایک اور فرقہ جو "کرمیہ" کے نام سے مشہور ہے قابل ذکر ہے۔ چونکہ مورخین نے ان کو "غلات" میں جگہ دی ہے اس لئے ہم اس کا ذکر ہی مقام پر کرتے ہیں لیکن یہ سیاسی فرقہ نہ تھا، فلسفی تھا۔ اور مورخین نے اس کو "مرجیہ" کے تحت لکھا ہے جو شیعہ بھی تھے اور خوارج بھی اور معتزلہ بھی۔

کرمیہ شیعہ تو نہ تھے مگر فلسفی کے جاسکتے ہیں۔ یہ فرقہ محمد بن عبداللہ کرام سے منسوب ہے۔ ابن اثیر اپنی تاریخ "الکامل" میں واقعات ۲۵۵ھ کے تحت لکھتا ہے کہ:-

اس سال محمد بن کرام بن مراف بن خزائنہ بن الاسیر کا انتقال ہو گیا۔ اصل اس کی سببستان ہے۔ وہاں سے نکالیا گیا تو غر جستان میں گیا۔ پانچ سال مکہ معظمہ میں مقبور رہا۔ اس کے بعد نیشاپور میں آیا۔ یہاں طاہر بن عبد اللہ والے نراسان نے قید و بند میں رکھا۔ رہائی کے بعد ۲۵۱ھ میں یر و تسلیم میں چلا گیا۔ وہاں ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔ زکریا بن ہروی اور علی بن خیر سے اس کا روایت کرتا تھا۔ دیگر اکابر سے بھی روایت کرتا ہے۔ خود زاید اور عابد تھا۔ اس نے ایک کتاب "عذاب قبر" نامی کہی۔ تصنیفات اور بھی ہیں لیکن مشہور یہی ہے اور یہ ممکن ہے کہ زندیقوں نے کچھ آپ لکھ کر اس کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

ابوالعباس سراج کہتا ہے کہ

"میں امام بخاری کے پاس بیٹھا تھا کہ قاصد ابن کرام کا نامہ لایا۔ اس میں ایک حدیث کی صحت کے متعلق تصدیق تھا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اور یہ حدیث زہری سالم سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتا۔

بخاری نے اس کی پشت پر لکھا کہ جو شخص یہ کہتا ہے سخت سزا اور جس طویل کا سزاوار ہے۔"

اس علامہ نسفی "حقایق" میں کرامی کے عقیدہ کی تائید کرتا ہے۔ کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اور امام شافعی کا نام ہے، بھلا یہی ہے۔ تقاضا زانی شرح میں لکھتا ہے کہ نوعیت ایمان کم و بیش نہیں ہوتی۔ ایک شخص صاحب ایمان بھی باعمال ہو سکتا اور اجنبی ہو سکتا ہے۔ اگر ان کا قلب ایمان سے مطمئن ہے تو اللہ عز و جل رحم سے ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۵۲ کے نیچے)

ابن کرام کے عقیدہ کی نسبت ابن جہان لکھتا ہے کہ
 "ایمان کے لئے ضرور نہیں کہ معرفت بھی ہو زبانی اقرار کافی ہے۔"
 ابن حزم لکھتا ہے کہ

"ابن کرام کہتا ہے کہ اقرار باللسان کے لئے ایمان کی شہادت کافی ہے
 اگر دل میں کفر ہو تو وہ مومن ہی ہے۔ اور اللہ کی نسبت اس کا عقیدہ
 یہ ہے کہ جو ہر ہے جسمانی مگر ہمارے اجسام کی مثل نہیں۔"
 ابن حجر عسقلانی کہتا ہے کہ

"ابن کرام سجستانی عابد متکلم پیشوائے فرقة کرامیہ ہے مگر بدعت کی وجہ
 سے اس کی حدیث متروک ہے اور حمید و جوئیاری اور محمد بن تمیم سعوی
 سے اکثر روایت کرتا ہے جو دروغ گوئے۔"

امام محمد بن اسلم طوسی کہتا ہے کہ
 "تین باتوں سے بزرگ ترا و زبشت ترا آسمان پر کوئی بات نہیں پہنچتی
 ایک فرعون کا دعویٰ کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔ دوسرے شہر لسی
 کا قول کہ قرآن مخلوق ہے۔ تیسرے ابن کرام کا عقیدہ کہ معرفت ایمان
 سے نہیں۔"

بغدادی اپنی کتاب "فرق بین الفرق" میں فرقة کرامیہ کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۱) وہ آیات جن میں ایمان کی زیادتی مذکور ہے۔ امام بو حنیفہ
 نے ان کی تفسیر یہ کی ہے کہ جب کوئی شخص محل ایمان رکھتا ہو تو ایک فرض کے
 بعد دوسرے فرض کی ادائیگی سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے۔ لیکن زیادتی
 آنحضرت ص کے زمانہ کے لئے خاص تھی جب فرائض کلمہ بیک وقت منکشف
 نہ ہوئے تھے اب جبکہ فرائض تمام و کمال واضح ہو چکے ہیں۔ ان پر ایمان کم و
 بیش نہیں ہو سکتا کیونکہ دین کلمہ ہم پر واضح ہو چکا ہے (باقی صفحہ ۱۵۱ کے نیچے)

لکھتا ہے کہ

ان کا عقیدہ معتزلہ سے بھی عجیب تر ہے کہ خدا تمام اجسام کو بیک وقت

فنا کر سکتا ہے لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ کچھ فنا ہوں جبکہ کچھ باقی رہیں۔

کرامیہ کا عقیدہ ہے کہ خدا کسی جسم کو فنا ہی نہیں کر سکتا اور اس سے بھی عجیب تر

عقیدہ ابن کرام کا یہ ہے کہ اللہ کا چونکہ جسم ہے اس لئے وزن بھی ہے۔ آیہ اذا السماء

التشقت (نہ) کی تفسیر یہ کی کہ خدا کے بوجھ کے دباؤ سے پھٹ جائے گا۔ ابن

کرام کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ قدیم سے خالق اور رب، رحمن الرحیم ہے۔ بلا مخلوق وغیرہ

چوں کہ اس کی صفت خلقیہ ہے وہ ہمیشہ سے خالق ہے اسی طرح دیگر اسماء و صفات

ہیں۔ اللہ کا کلمہ تو قدیم ہے مگر "قول" یعنی کلمہ کا کہنا مخلوق ہے۔

خبر القابری بغدادی لکھتا ہے کہ

"ایک کرامیہ سے میرا مناظرہ اسی موضوع پر ہوا۔ میں نے کہا کہ تم کہتے

ہو "کلمہ" تو قوت گفتار ہے اور خاموش شخص خاموشی کی حالت میں

بھی اس قابل ہے کہ گفتگو کرے اس لئے خاموشی بھی گفتار ہے۔

اس سے کوئی جواب نہ آیا۔"

دونوں فلسفی اور منطقی تھے۔ بات بالکل سیدھی سادی ہے۔ انسان حیوان ناطق

ہے۔ قوت نطق اس میں موجود ہے خواہ وہ غرضہ دراز تک خاموش رہے۔ جب چاہے

نطق کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔ اسی طرح خالق ہے۔ وہ مجبور تو نہیں کہ خلق فرمائے

جب چاہے خلق فرما سکتا ہے۔ ابن حزم نے اس موضوع پر بحث کی ہے جو ہم

لکھ چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن کرام اپنا مفہوم مناسب لفظوں میں واضح

نہ کر سکا اس لئے غلط فہمی پیدا ہوئی یا مخالفین نے پیدا کی۔ لیکن جب اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۲) اگر یہ ترویجی تسلیم بھی کی جائے جو یہ ایمان کا شر ہے نہ کہ خود

ایمان۔ مزید بحث مناسب مقام پہنکی جائے گی۔

بطور عقیدہ تسلیم کر لیا کہ ذات باری تعالیٰ جسم ہے تو جسم کے ساتھ طول و عرض وغیرہ
 بھی مانتا پڑا۔ اس لئے "علی العرش استوی" سے یہ عقیدہ اخذ کیا کہ شش بہمت
 بھی ہیں۔ ایک بہمت تو عرش سے ملی ہوئی ہے باقی پانچ غیر متحدہ ہیں۔

"امامت" کے بارے میں کرامیہ کا عقیدہ ہے کہ بیک وقت دو امام بھی ہو سکتے
 ہیں خواہ ان میں جنگ و جدال بھی ہو۔ امیر معاویہ اور حضرت علیؑ دونوں امام برحق
 تھے۔ اور ان کے متبعین دونوں کی اطاعت پر مجبور تھے خواہ ان میں سے ایک کو سب
 اور دوسرا عادل تھا۔

کرامیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ سنت رسولؐ کے مطابق امام تھے مگر امیر
 معاویہ خلاف سنت تھے۔ بغدادی کہتا ہے کہ یہ عقیدہ بھی عجیب ہے کہ سنت کے
 خلاف اطاعت جائز ہے۔

قاضی ابو جعفر زوزنی کہتا ہے کہ

کرامی عالم میرا مہمان تھا۔ نماز پیشین کے وقت وضو کیا اور رفع حاکم
 کے لئے بیت الخلاء میں گیا۔ ننگے پاؤں باہر آیا۔ میں نے کہا کہ وضو دوناہ
 کرو۔ کہنے لگا کہ اسے جاہل با علم سیکھ تاکہ لوگ تجھے جاہل نہ کہیں اور
 تیرا مضحکہ نہ اڑائیں۔ تو نہیں جانتا کہ خشک نجاست پر اگر پاؤں پڑے
 تو پلید نہیں ہوتا۔ اس کے بعد نماز میں مشغول ہوا اور ان نمازیں پڑھتے
 کہا کہ کسی کو بازار میں بھیجو تاکہ روٹی خرید لائے وہ روٹی کی خرید کے لئے
 آیا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا نماز ہے جو تو ادا کر رہا ہے؟ پھر کوخ میں گیا
 اور کہا "سبعون ربی العظیم" جب پھر امامت کی میں نے کہا کہ
 یہ کس مذہب میں جو ائمہ سے ہے کہ تو نماز میں بھی باتیں کرتا ہے۔ کہتے لگا
 کہ اسے جاہل تجھے اتنا معلوم نہیں کہ یہ کوئی گناہ نہیں اور اگر ہو بھی
 تو کرامی کے نامہ اعمال میں نیکی ہی لکھی جاتی ہے اور جو کرامی نہیں اس
 کی ہر ایک بات گناہ ہے۔

سید ابوالبرکات علوی کا مناظرہ ابوبکر بن اسحاق کرامی سے دربارہ امامت ابوبکر
ہوا۔ اس نے کہا کہ

”ابوبکر کی امامت پر تو بے شمار برہان اور نصوص قرآنی ہیں۔ میں یزید
بن معاویہ کی امامت نص قرآنی سے ثابت کر سکتا ہوں۔ اور تو حضرت
علیؑ کا ایمان بھی ثابت نہیں کر سکے گا۔ میں نے کہا کہ تو کیسے یزید کی
امامت ثابت کر سکتا ہے کہ اس نے فرزند رسولؐ کا خون ناحق کیا ہے
کرامی نے کہا کہ غایت مافی الباب یہی ہے کہ اس نے خون ناحق کیا
لیکن یہ مانع امامت نہیں۔ پڑھ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قرآن میں ہے کہ میں
آدم کو ارض میں خلیفہ بناتا ہوں۔ ملائکہ نے تیری نمائندگی وہاں بھی
کی اور کہا کہ:-

اتجعل فیہا من یفسد فیہا کیا تو ایسے کو خلیفہ بناتا ہے جو
ویسفک الدمار۔ زمین پر فساد برپا کریگا اور خونریزی
کرے گا۔

و نحن نسبح بحمدک و نقدرک ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور
لک۔ تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔

اللہ نے فرمایا ”انی اعلم ما لا تعلمون“ کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں
جانتے۔ اب بتا کہ یزید کی امامت بروئے نص صحیح ہے کہ نہیں؟
سید ابوالبرکات نے کہا ”کم بخت خوارج کا بھی یہ عقیدہ نہیں جو
حضرت علیؑ کو کافر کہتے ہیں“

۔۔۔ ان اوراق کے مؤلف کو بھی ایسا ہی اتفاق ناملائم مناظرہ کا ہوا۔ فریق
مخالف نے کہا کہ یزید کی خلافت نص قرآن سے ثابت شدہ ہے۔ اور یہ آیت
پڑھی:-

”الحمد لله فاطمہ السملوت والارض جاعل الملائکة رسلا، اعلیٰ

مثنیٰ وثلاث وربیع ، یزید فی الخلق ما یشاء ، ان اللہ علی کل
شیء قدير (۱۱۳)

”اللہ ہی کے لئے تمام حمد جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ بلائیکہ
کو رسول بنایا جو دو تین ، چار دست و بازو والے ہیں اور پیدائش
میں اس سے زیادہ بھی چاہے تو کرتا ہے۔ تحقیق اللہ ہر ایک شے پر
قادر ہے۔“

اس نے کہا کہ اللہ جب کسی شخص کو کامیاب بنانا چاہتا ہے تو اس
کے دست و بازو کو قوت آدمی بنا دیتا ہے پہلے دو کا ذکر یہ
ظاہر کرتا ہے کہ ابو بکر و عمر کا درجہ بہت بلند ہے۔ ثلاث سے مراد عثمان
ہے۔ اور ربیع سے علی۔ انہی پر بس نہیں ”یزید“ بھی، دیکھو یزید کا

خصوصیت سے نام لیا گیا ہے۔“

میری اس وقت نو عمری کا عالم تھا۔ مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

کرامیہ کے تین فرقے مشہور ہیں۔ ”حقانیہ“ اور ”طرائقیہ“ اور ”اسحاقیہ“۔

ان کا باہمی مسائل پر اختلاف ہے۔ مگر ایک دوسرے کا رد نہیں کرتا۔ اور تمام دیگر

مذہب کا رد کرتے ہیں۔ فرقہ کرامیہ کا تذکرہ ہر ایک مورخ نے کیا ہے۔ اور بالخصوص

انتا تسلیم کیا ہے کہ اس فرقہ میں بلند پایہ عالم اور زاہد اور عابد گزرے ہیں سلطان

سکتگین والد سلطان محمود غزنوی کی نسبت کہتے ہیں کہ کرامی تھا۔ سمعانی اپنی کتاب

”الانساب“ میں ابو یعقوب اسحاق بن ممشاد کی نسبت لکھتا ہے کہ

”واعظ اور زاہد پیشوائے کرامیان تھا۔ اور وہ بہت بڑا پارسا اور پیر گار

آدمی تھا۔ اس کے دست حق پرست پر پنج ہزار دن۔ مرد مسلمان جو

شب پنج شنبہ وفات پائی اور شب جمعہ ۲۵ رجب ۳۸۳ھ میں فوت ہوا۔

میں مدفون ہوا۔“

”کلم“ تاریخ نیت پور میں لکھتا ہے کہ یہ

ننا کہ جنازہ کے وقت میدان لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ اور ہر ایک مذہب کے آدمی شریک جنازہ تھے۔

سلطان غیاث الدین غوری اور تمام غوریوں کی نسبت ابن الاثیر نے تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ نسب کرامی تھے۔ اور سلطان غیاث الدین کے دربار میں امام فخر الدین رازی کا مباحثہ قاضی مجد الدین ابن عبد المجید بن عمر معروف بہ ابن القدوة کیساتھ ہوا۔ دوران مباحثہ میں امام فخر الدین نے کچھ کلمات ناشائستہ نا ملائم کہے۔ اور فریق مخالف کو زندقہ اور مذہب فلاسفہ سے متہم کیا۔ دوسرے روز ابن قدودہ نے جامع مسجد میں دوران وعظ میں امام فخر الدین کی بد کلامی کا ذکر کرتے ہوئے زاری کی اور تمام کرامی جو مسجد میں حاضر تھے رونے لگے اور فیصلہ کیا کہ غور کو چھوڑ کر کہیں ہجرت کریں۔

سلطان کو معلوم ہوا تو منت و سماجت کی اور امام فخر الدین کو ہرات کی طرف نکال دیا۔ کرامیہ فرقہ کا خرد و خراسان اور باوراء المنہر میں انتہا پر تھا اس کے

ماتریدیہ

مخالف ان مقامات پر فرقہ "ماتریدیہ" تھا۔ یہ فرقہ ابو منصور محمد بن

محمود الحنفی المتکلم الماتریدی السمرقندی سے منسوب ہے جو سمرقند میں ۳۳۳ھ میں فوت ہوا۔ یہ شخص ابوالحسن الاشعری کا ہم عصر تھا۔ اسی کا ہم عصر لٹھاوی مصر میں ۳۳۳ھ میں فوت ہوا۔

"ماتریدیہ" سمرقند کے ایک گاؤں کا نام ہے۔ ماتریدیہ اہل سنت والجماعت ہیں اس لئے اس مقام پر اس کا تذکرہ مناسب نہیں۔

اب ہم اپنے زمانہ کے شیعہ فرقوں کے حالات لکھتے ہیں:

شیخ احمد احسانی ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام جعفر صادق کی وفات کے بعد شیعہ دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقہ کا یہ عقیدہ تھا

کہ امامت کا حق آپ کے بڑے بیٹے اسمعیل کا حق ہے اور اسمعیل کے بعد آپ کے بیٹے محمد کا۔ یہ فرقہ اسماعیلیہ کہلا یا جس کے حالات ہم بیان کر چکے ہیں۔ دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے کہ اسمعیل اپنے باپ امام جعفر صادق کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا۔

اس لئے امام نے اپنے دوسرے علیہ مؤمنی کا نظم کے حق میں امامت کی وصیت کی۔ یہ امامیہ اثنا عشریہ کہلانے۔ اس فرقے کے حالات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ فرقہ اسماعیلیہ کے نزدیک سات امام "غائب" ہیں۔

(۱) اسمعیل۔ (۲) محمد۔ (۳) احمد۔ (۴) عبد اللہ۔ (۵) احمد۔ (۶) حسین

(۷) عبد اللہ۔

فقہ اثنا عشریہ کا یہ عقیدہ ہے کہ بارہواں امام مہدی آخری امام تھا۔ جو روپوش ہو گیا۔ اور مناسب وقت پر اس کا ظہور ہوگا۔ لیکن چونکہ بغیر امام کے زمانہ کبھی خالی نہیں رہتا۔ اس لئے ۲۶۰ھ سے لے کر اس کے ظہور تک ایک ایسا کامل شخص ہونا چاہیے اور ضرور موجود ہوتا ہے۔ جو شیعیان علی اور امام غائب کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے۔ اس واسطہ یا توسل یا توسط کو وہ باب سے موسوم کرتے ہیں۔ اس اصطلاح کی سند میں ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ آن حضرت نے فرمایا کہ:

"انامد بیننا العلیٰ وعلیٰ" میں شہر علم ہوں اور علی اس کا

باب ہا۔ دروازہ ہے۔

مفہوم واضح ہے کہ جو شخص اس شہر علم میں داخل ہونا چاہے وہ صرف دروازے کے راستے سے داخل ہو سکتا ہے اور وہ علی ہے۔

شیعی مذاہب کے تحت ڈونلڈ سن (DONALDSON) لکھتا ہے کہ

"شیعہ اثنا عشریہ امام غائب المہدی کو کئی القاب سے یاد کرتے ہیں۔

"حجۃ اللہ" اور "بقیۃ اللہ" اور "صاحب الزمان" وغیرہ اور یہ جملہ

"عجل اللہ فرجه" (اللہ جلد اس کا پسندیدہ ظہور لائے) ۲۲۹ھ تک

فرقہ بابی کے عقاید کے مطابق بہتر سال کا عرصہ "غیبت صغریٰ" ہے

اور اس عرصہ میں چار باب کے بعد دیگرے ظہور میں آئے۔ ۲۲۹ھ سے

۲۶۰ھ تک کا عرصہ "غیبت کبریٰ" سے موسوم ہے۔ ممکن ہے کہ غیبت

کبریٰ میں بھی "باب" پیدا ہوتے ہوں۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ امام

غائب کے حضور کا انتظار شیطان ہر ایک زمانہ میں اپنے صبر سے کرتے رہتا ہے۔ جب خلافت عباسیہ زوال میں آگئی۔ اور ویلی جو آل بابویہ سے موسوم ہیں یخلیفہ اور خلافت کے سرپرست ہو گئے۔ شیعی مذہب زور پکڑ گیا۔ آل بابویہ منتہی شیعہ تھے۔ ان کے دور دورہ میں مجالس عزا اور علانیہ ماتمی جلوس اور بنو امیہ پر تبر اور وہ تمام رسمیں جو آج بھی ادا ہوتی ہیں اختراع ہوئیں۔ انہوں نے اماموں کے مقبروں کی تعمیر از سر نو کی۔ اور احادیث کی تدوین بھی کی اور شیعہ علماء کی بدعتوں کو مٹانے کی۔ امید یہ تھی کہ اس دور دورہ میں امام کا ظہور ہوگا۔ اس لئے کہ اب دشمنوں کا خوف جاتا رہا اور شیعی مذہب پھیل رہا تھا مگر امام غیبت کبریٰ سے باہر نہ آئے۔ اب وہ زمانہ شروع ہوا جب "حروب الصلیبیہ" نے دنیا سے اسلام کی توجہ کو جذب کر لیا۔ اہل صلیب نے ارض شام اور شمالی افریقہ میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا۔ حریت اسمعیلی اپنی سلطنت مصر میں قائم کر چکے تھے۔ وہ کچھ مدافعت کرتے رہے۔ اثنا عشریہ امام کے منتظر رہے مگر ظہور نہ ہوا۔ چوتھی صدی میں دنیا پر اسلام پر قیامت سفری لڑ گئی۔ تاتاریوں کا نڈی دل وسط ایشیا سے اٹھا اور ایران اور عراق اور شام پر چھا گیا۔ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی لیکن "صاحب الزمان" ظہور نہ ہوئے۔

سولہویں صدی کے آغاز میں صفوی خاندان ایران پر قابض ہو گیا۔ اس کے حکمرانوں کا یہ دعویٰ تھا کہ امام غائب خواب پا رہے ہیں ان پر ظہور ہوتے ہیں۔ مگر عوام کو بچر بھی زیارت نصیب نہ ہوئی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام پر ایران میں ایک اور شیعہ فرقہ پیدا ہوا جس کو شیعی کہتے ہیں۔ اس کا بانی شیخ احمد احسا "واقع بحرین" کا باشندہ تھا۔ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۲۷ء تک وہ کربلا اور نجف اور کرمان اور طبرستان اور

۱۵۹

مکہ معظمہ میں پھر تاجدار اور آخری مرتد میں رہائش اختیار کی۔ اس کے بہت مرید تھے اور اس کی بظاہر حالت اور ویشتانہ تھی اور زہد و تقویٰ میں بھی مشہور تھا۔ وہ حاجی ملا محمد تقی قزوینی کی خدمت میں بھی گیا۔ اس وقت اس کی عمر پچتر سال تھی۔ اگرچہ کچھ عرصہ قزوینی کی صحبت میں رہا۔ جو ان ایام میں علم و فضل کے اعجاز سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب اس کے عقائد کا علم قزوینی اور دیگر علماء کو ہوا تو اسے "مرتد" قرار دیا۔ قزوین سے نکلا اور حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ کی راہ لی۔ ابھی مدینہ منورہ سے دو تین منزل دور تھا کہ اجل سے آگیا۔ اور ۲۸ جون ۱۸۲۶ء میں فوت ہو گیا۔

پروفیسر براؤن (BROWNE) نے اپنی کتاب (EPISODE OF THE BAB)

میں شیخی فرقہ کے حالات اور عقائد قلمبند کرتے ہوئے لکھا کہ

"بانی ملت شیخی کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانی جسم و جسد نہ فلک اور چہار عنصر سے ترکیب دیا گیا ہے۔ اور بوقت موت کثیف عناصر فنا ہو جاتے ہیں

اور بروز قیامت صرف لطیف جسم کا حشر ہوگا۔ اس لطیف جسم کو وہ

"ہور قلبیہ" سے موسوم کرتا ہے جو یونانی لفظ معلوم ہوتا ہے جو ہیئت میں

عالم مثال کی طرح ہے۔ اسی مفروضہ پر معراج کے متعلق اس کا عقیدہ

یہ تھا کہ آنحضرت کا جسد مبارک تو بستر پر ہی رہا لیکن جو لطیف حصہ جسم

تھا وہ آسمانوں پر گیا۔ شیخ احمد بانی ملت مجاہدہ شاعر اور ریاضت خانہ

میں اکثر مشغول رہتا۔ اور اسے یقین تھا کہ دوازوہ امام بالخصوص امام جعفر

صادق کا خاص منظور نظر ہے۔ اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ دوازوہ امام قوت

خلق ہے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ "احسن الخالقین ہے۔"

احسن صبیغہ مبالغہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے سوا اور بھی خالق ہیں۔ اور

اللہ بہترین خالق ہے۔ اور اللہ کے سوا خالق دوازوہ امام ہیں۔ وہ

ایک حدیث جو حضرت علیؑ سے مروی ہے بیان کرتا کہ میں سابق ارض و
سموات ہوں۔ وہ اس حدیث تک غلو کرتا کہ کہتا کہ سورہ فاتحہ تلاوت
کرتے وقت نمازی کو چاہیے کہ علیؑ کا تصور کرے۔ بالخصوص جب یہ
الفاظ کہے کہ "ایات زحید" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔
قص العلماء میں شیخ احمد کی تصانیف "زیارات الحامیہ" (چار مجلدات) اور
"شرح ملاحظہ" اور شرح "فوائد" و "تبصہ علامہ" وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔
شیخ احمد کی وفات کے بعد حاجی سید کاظم ساکن رشت، جانشین شیخ سلیم
گیا۔ اس کی جائے پیدائش اردبیل میں حضرت شیخ صفی الدین اسحاق کے مدرسہ
کے قریب تھی۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے اور صفوی
خاندان شاہان ایران کے مورثان علیؑ آپ ہی ہیں (امیر تیمور گوگان کے ہم عصر تھے۔
اور امیر تیمور کو اس درجہ تک عقیدت تھی کہ جیسا بایزید ایلدزم کو شکست دے کر
بے شمار اسیران جنگ کے ساتھ اردبیل میں حاضر خدمت ہوا۔ زرد جو اہرات بطور
نذرانہ پیش کرتے مگر آپ نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اگر دیتے ہو تو جنگی قیدی
میرے ہوائے کر دو۔ امیر نے قیدی دے دئے تو آپ نے سب کو آزاد کر دیا اور اپنے
اپنے گھروں کو جانے کی اجازت دے دی مگر وہ آپ ہی کے ہورہے اور یہاں وہ
لوگ تھے جو بعد میں قزلباش کہلائے اور صفوی فوج میں انہی کی کثرت تھی اور
انہی کے بل بوتے پر صفوی خاندان ایران پر قابض ہو گیا، سید کاظم بارہ برس کا
لڑکا تھا۔ ایک رات خواب میں ایک امام نے ارشاد فرمایا کہ
"جاؤ شیخ احمد احسانی سے تحصیل علم کرو۔"

شیخ احمد اس وقت یزد میں تھا۔ لڑکا خدمت میں حاضر ہوا اور حلقہ ارادت میں شامل ہو
گیا اور شیخ کی وفات کے بعد خلعت خلافت اسی کو ملی۔ سترہ سال تک وہ عقیدہ
شیخی نشر کرتا رہا۔ اس کی تصانیف ایک سو تیس بیان کی جاتی ہیں۔ ان کی نہرست
دائرة المعارف اسلام جلد چہارم صفحہ دو سو اسی میں دی گئی ہے۔ پچاس سال

کے قریب عمر تھی۔ سفر بغداد پیش آیا۔ اور بغداد ہی میں یکایک فوت ہو گئے۔ کسی شخص کو اپنا جانشین نامزد نہ کیا۔

خاص خاص عقائد مذہب شیخی یہ ہیں :-

۱۔ اکثر احادیث محض موضوعات کا طومار ہیں۔ جن کی کوئی سند نہیں انہیں مسترد کرنا چاہیئے۔

۲۔ دوازوہ امام تخلیق عالم کا سبب ہیں۔ اور انہی کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا علم ممکن ہے۔ اور انہی کی شخصیت میں اللہ کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔

۳۔ انسان کے دو جسم ہیں۔ ایک جسم تو یہ عکسری ہے۔ اور بمثلہ لباس ہے اور قبر میں فنا ہو جاتا ہے۔ دوسرا لطیف ہے اور عالم لطیف سے تعلق رکھتا ہے یہی جسم لطیف ہے جو دوبارہ اسی ارض پر زندہ ہوگا اور اپنے عمل کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل ہوگا۔

۴۔ علم دو قسم کا ہے۔ ایک غیر متبدل اصلی۔ دوسرا تغیر پذیر۔ اور امام اس دوسری قسم کے علم کے باب ہیں۔

۵۔ ناممکن ہے کہ امور معلومہ دائمی ہوں۔ "علم امکانی" ممکنات کا علم ہے۔ اور اشیا محسوسہ کے ظہور سے پیشتر اس کا اطلاق ان پر ہوتا ہے "علم اقوال" علم موجودات ہے۔ لیکن "امر" کا خلق پر تقدم لازم ہے۔

سید علی محمد باب

سید کاظم کی وفات ۱۸۴۸ء میں ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد فرقہ شیخی کو کسی اولی الامر کی تلاش رہی جو ان کی قیادت

کرنے پر چند سربراہ اور وہ اشخاص مسجد کوفہ میں گئے (روایات کے مطابق امام ہور کا ظہور اسی مسجد سے ہوگا) مسجد میں یہ اشخاص معکف رہے۔ صوم و صلواہ و ذکر اذکار میں دن رات مشغول رہتے۔ آخر ان میں سے ایک پر یہ منکشف ہوا کہ شیراز میں حجاز اور مرزا علی محمد سے مشورہ کرو۔ یہ شخص پہلے مرزا علی محمد سے کربلا میں ملاقات کر

تھا۔ اس کے دل پر اتنا اثر ہو چکا تھا کہ ممکن ہے کہ مرزا ہی منتخب شدہ باب ہو مرزا سے شیراز میں ملا۔ اس نے اپنی تفسیر سوزہ یوسف مطالعہ کے لئے دی۔ چند روز استخارہ کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ میری ذاتی رائے ہے کہ میرزا علی محمد ہی وہ باب ہے۔ جس کی تلاش تھی۔

فرقہ شیخی کے اثر لوگ مرزا کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ مگر ایسے بھی تھے جو مرزا علی محمد کے دعوے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے حاجی محمد کریم خاں کرمانی کا حلقہ ارادت وسیع تھا۔ وہ سب شیخی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مرزا علی محمد کے دعوے کا انکار کر دیا۔ اس لئے اب فرقہ شیخی دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ دوسرا فرقہ اب "بابی" کہلانے لگا۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ یہ اصطلاح "باب" مرزا علی محمد کی اختراع نہ تھی اس سے پیشتر بھی کہی "باب" گزر چکے تھے۔ البتہ غیبت کبریٰ میں جو مرزا علی محمد تک ایک ہزار سال رہی عموماً "وکیل" ہی نمودار ہوتے جو امام غائب اور عوام کے درمیان واسطہ و رابطہ تھے۔ شیخ احمد حسانی نے شیعہ کامل کی ایک اصطلاح ضرورتاً نکالی اس کا مفہوم یہ تھا فرقہ اثنا عشریہ میں بارہویں امام غائب سے براہ راست فیض حاصل کرنے کیلئے ایک شخص ایسا ہونا چاہیے جو کامل ہو اور جس کا روحانی تعلق امام سے ہو۔ اگرچہ نہ شیخ احمد اور نہ اس کے خلیفہ سید کاظم رشتی نے دعویٰ "باب" کیا مگر مفہوم "شیعہ کامل" اور "باب" ایک ہی ہے۔

ابتداء میں خود مرزا علی محمد اور ملا حسین بشردیہ اور قرة العین اور اکثر اشخاص مرد و زن کا بھی یہ عقیدہ تھا۔ جب مرزا علی محمد نے دعویٰ "باب" کیا تو حاجی محمد کریم خاں جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے اور اس کے مرید علیحدہ ہو گئے۔ حاجی حکمران خاندان تاجار کا ایک رکن تھا۔ یہ فرقہ بھی اب تک موجود ہے۔

مرزا علی محمد باب کا ظہور ۲۳ مئی ۱۸۴۸ء میں ہوا اور اس کی زندگی کے ساتھ جولائی ۱۸۵۰ء میں تبریز میں ختم کی گئی اس کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ ۱۸۵۱ء میں حاجی مرزا جانی کاشانی نے "باب" کی پراشوب زندگی کے حالات، متصل لکھے ہیں جو خود بھی "بابی" تھا۔ ۱۸۵۱ء کو مرزا جانی معہ اٹھائیس سربراہ آوردہ بابی اشخاص

ظہران میں قتل کیا گیا۔ تاریخ جدید ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان مرزا ہمایوں
 ہمدانی نے لکھی۔ "سبحان نامہ" میں بھی باب اور بابوں کا ذکر کوئی ہے مگر وہ زیادہ تر
 حالات بہار اللہ کے ہیں اور اس کے جانشین اور خلف عباس آفندی المعروف
 تہذیبیہا سے منسوب ہے۔

مرزا علی محمد باب ظہور کے وقت چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ مرزا حسین علی جوہر
 ازاں بہار اللہ کے لقب سے ظاہر ہوا۔ ابتدا میں اس کے حلقہ ارادت میں داخل تھا
 اور باب سے عمر میں دو سال بڑا تھا۔ تیس سال کی عمر میں "باب" مارا گیا۔ چھ سال کا
 درمیانی عرصہ میں وہ شیراز میں ۱۸۴۸ء میں پیرا صفحان میں ۱۸۴۹ء میں پیرا حویلی
 کے قریب باکو میں قید و بند کی سختیاں جھیلتا رہا۔ صفحان میں وہ برائے نام ہی قید
 رہا کیونکہ گورنر منوچہر خاں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور باب کو دوستوں سے ملنے میں کوئی
 رکاوٹ نہ تھی۔ وہ قید و بند میں بھی اپنے دعوے کی تائید میں لکھتا رہا۔ باہر اس کے اور
 مخالف فریق میں جنگ و جدل جاری تھا۔ ۱۸۴۸-۵۰ء میں ماژندران میں ملا حسین
 بیکر اور ملا محمد علی زنجانی کی قیادت میں بابیوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ یزد میں
 آغا سیاحی نے ۱۸۵۰ء میں ہڑبونگ مجاوی۔

۱۸۵۰ء میں مرزا علی محمد نے "باب" کا لقب ترک کر دیا اور اپنے ایک عقیدت مند
 کو اس سے سرفراز فرمایا۔ اب اس کا یہ دعویٰ تھا کہ میں امام قائم ہوں اور وہی امام منتظر
 ہوں جس کی آمد کا انتظار تھا۔ ایک ہزار سال غیبت رہی۔ اب ظہور امام کا وقت آ
 گیا۔ میرا نام علی محمد باب اور "مدینۃ العلم" کا جامع ہے۔ "باب" سے بڑھ کر میں
 "نقطا ہوں۔ بابی اب آپ کو حضرت" نقطہ اولیٰ کہتے تھے۔ بلکہ "ربی الاطوار سے
 پاؤں گتے ہیں۔" باب کی مشہور کتاب "بیان" میں دعویٰ الوہیت یا منظر الوہیت واضح
 ہوتا ہے جو بعد ازاں دعویٰ بہار اللہ اور اس کے پیروں کا عقیدہ رہا۔ بہار اللہ
 اور اس کے متبعین کا یہ عقیدہ ہے کہ
 "باب" یا "حضرت نقطہ اولیٰ" مثیل کئی نبی کا کلمہ کا تھا جو

مسیح میں اور بہار اشد مثیل مسیح ہیں :

قتل کے بعد مرزا علی محمد "ربی الاعلیٰ کی لاش کئی دن بے گور و کفن رہی آخر آپ کے مریدوں نے آپ کو سفید لیشی کفن میں امام زادہ معصوم کے روندہ میں جو طہران اور ریاط کریم میں واقع ہے۔ سترہ سال پوشیدہ رکھا۔ اس کے بعد ہائیوں نے بہار اشد کے ارشاد کے مطابق "تالوت" کے "میں منتقل کر دیا۔ اور یہاں سپرد خاک ہوا۔

قتل سے پیشتر "باب" نے اپنا جائنشین مرزا بیچیا پس مرزا بزرگ نور علی کو نامزد کیا جو مرزا حسین علی المقلب بہار اشد کا ہی سوتیل بھائی ہے۔ اس وقت مرزا بھائی کی عمر چودہ سال تھی۔ اس کی والدہ کا اس کے بچپن میں انتقال ہو چکا تھا۔ مرزا حسین علی کی والدہ نے اس کی پرورش کی۔ مرزا حسین علی اس سے تیرہ سال عمر میں بڑا تھا۔ خود بڑا بھائی مرزا حسین علی کہتا رہا کہ اسے معلوم نہ تھا کہ بھائی بھائی ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچے گا۔ "باب" نے مرزا بھائی کو "صبح ازل" کے لقب سے نوازا۔ اور اپنی انگشتری اور دیگر اشیاء جن کو تبرکات ہی کہتا پائے۔ "صبح ازل" کے حوالہ میں : اور ارشاد فرمایا کہ کتاب بیان پر آٹھ "واحد" یعنی فصلیں اور اضافہ خود ہی کرو۔ چونکہ خود "باب" نے اسے اپنا جائنشین نامزد کیا تھا۔ اس لئے تمام بابیوں نے بالاتفاق "صبح ازل" کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ مگر وہ ابھی نو عمر ہی تھا۔ اور وہ زیادہ تر گوشہ خلوت ہی میں رہتا۔

اس لئے انصرا م امور بانیہ بڑے بھائی بہار اشد کے ہاتھ میں رہا۔ ایک اور شخص سے دار خلافت مرزا اسد اشد بھی کھرا ہو گیا مگر وہ شرط العربیہ میں غرق ہو گیا۔ شہیر کیا گیا کہ بابیوں نے اس کا خاتمہ اس طرح کیے کہ وہ بڑا بڑا بڑا ہے۔

میری کام ہندوستانی بابیوں نے کیا جن کا سرخونہ سید بسیر انوار المقلب بزد مسیح

نقاد ارتقا۔

۱۵۔ اگست ۱۸۵۱ء میں چند بابیوں نے شاہراہ امین شاہ قانچہ پر حملہ کیا۔ شاہراہ کے رکنوں نے شاہراہ کو بے گناہ کیا۔ بابیوں کی شامرتت اکثر جن بہانہ تھے جن میں شامل تھا۔ یہ جو ان سے پہلے وہاں کی شاہراہ میں

والہانہ سرگرمی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی نظمیں ملک کے طول و عرض میں زبان زد
 تھیں۔ یہ سب قتل کئے گئے۔ مگر جن بہادری سے انہوں نے جان دی۔ اس کا اثر
 ان تمام نشریات سے بہت بڑھ کر ہوا۔ جو اب تک باقی کر رہے تھے۔ اور لوگ
 جوق در جوق اس نئے فرقے میں داخل ہوتے گئے۔ صبح ازل اور اس کا بھائی
 بہار اللہ دونوں بچ رہے۔ دونوں بغداد میں روپوش ہو گئے۔ صبح ازل کی گرفتاری
 پر پیش قرار انعام کا بھی حکومت ایران نے اعلان کیا۔ اب بغداد باہمیوں کا مرکزی
 مقام بن گیا۔ جہاں بارہ سال تک یہ لوگ سرگرم عمل رہے۔ اس عرصہ تک بہار اللہ
 بھی اپنی کتاب "ایقان" میں صبح ازل کو اپنا قائد ہی تسلیم کرتا رہا۔ یہ کتاب ۱۸۶۱-۶۲ء
 میں لکھی گئی۔

صبح ازل تو مرخاں مزاج و رویش صفت شخص تھا مگر بڑے بھائی کی طرف
 لوگوں کا رجوع ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ صبح ازل اکثر گوشہ خلوت ہی میں اپنا وقت
 عزیز گزارتا۔ صبح ازل کے مریدوں اور بہار اللہ کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔
 ملا محمد جعفر فاروقی اور ملا رحمت علی قاہر اور سید محمد اصفہانی نے بھائی لیا کہ بہار
 اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ بہار اللہ دو سال بعد کروڑوں
 کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ بمقام "سرکلو" رہائش اختیار کی۔ اور گاہے گاہے
 سلیمانہ میں آمدورفت جاری رکھی۔ بہائی ان ایام کو بہت اہمیت دیتے ہیں
 جس مہم کا آغاز بہار اللہ کرنے والا تھا۔ اس کی تیاری انہی ایام میں شروع ہو گئی
 بغداد میں باہمیوں کا قیام حکومت ایران کے لئے خطرناک تھا۔ اس لئے ترک
 حکومت نے مرزا حسین خان مشیر الدولہ ایرانی صغیر قسطنطنیہ کی شکایت پر صبح ازل
 اور اس کے بڑے بھائی بہار اللہ کو قسطنطنیہ میں منتقل کر دیا۔ پھر یہاں سے بھی
 ایڈریا نوپل میں بھیج دیا۔ جہاں ان کی رہائش چار سال (دسمبر ۱۸۶۲ء تا اگست
 ۱۸۶۶ء) رہی مگر دونوں بھائیوں میں اب کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اسی جگہ ۱۸۶۶ء
 بہار اللہ نے پہلی دفعہ اعلان کیا کہ

میں وہ ہوں جس کے بارے میں حضرت نقطہ اولے مرزا علی محمد باب نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ "من یظلم یبیشر"۔

اور تمام بابیوں کو دعوت دی کہ

"مجھ پر ایمان لائیں۔ میں صرف حضرت باب کا جانشین ہی نہیں ہوں بلکہ وہ کلمہ ہوں جس کا مصدق خود باب تھا۔"

اس دعوت پر رفتہ رفتہ اکثر بابیوں نے بلیک کہا مگر صبح ازل اور اکثر سربراہان اور وہ بابیوں نے انکار کر دیا۔ اب دونوں فرقوں میں مباحثہ اور مجادلہ بلکہ مقاتلہ کی نوبت پہنچ گئی۔ اور فریقین کے کئی آدمی مارے گئے۔ دونوں بھائیوں کے ایک دوسرے پر زہر خوردانی کے اقدام کا الزام بھی لگایا۔ مجبوراً ترکی حکومت کو مداخلت کرنی پڑی۔ صبح ازل کو توجزیرہ ساقیہ پس (قبرص) میں اور بہار اللہ اور اس کے خاندان کو "عکہ واقع شام میں بھیجا دیا۔"

ترکی گورنمنٹ نے ان کے درمیان آئندہ قانون شکن سرگرمی کا سدباب اس طرح کیا کہ چار بھائی امدان کے خاندان توجزیرہ قبرص میں اور چار ازل عکہ میں ان کی نگرانی کرتے رہیں۔ اور حکومت کو کسی ناخوشگوار واقعہ کی اطلاع دیتے رہیں۔

جو چار ازل عکہ میں آئے وہ تو بارے گئے۔ اور جو چار قبرص میں تھے ایک ایک مشہور مشورہ نویس تھا، قبرص میں رہا۔ جب یہاں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ ہر عکہ میں آ گیا۔

ہمارا اللہ اور اس کے بارے میں کچھ لکھنا سروسٹ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم مذاہب اسلامیہ کی تاریخ لکھ رہے ہیں اور ہمارا اللہ کے اعلان کے مطابق اس کی حیثیت ایک نئے بانی مذہب کی ہے۔ اس کو بھائی "امر بہار اللہ سے موسوم کرتے ہیں۔ جیسے ہم مسلمان اپنے دین کو "اسلاہ" یا "امر اللہ فی الحقیقت" ہمارا اللہ کا دعویٰ نبوت و رسالت نہیں وہ مدعی الوہیت ہے جیسے مسیحی مسیح کی

نسبت عقیدہ رکھتے ہیں۔ "ختم نبوت" کو بہانی تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس
 مہوم یہ ہے کہ آنحضرتؐ سے پیشتر انبیاء و رسل مسلسل آتے رہے مگر آنحضرتؐ کے
 بعد نبی نہ ہوتے۔ خدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر ایام جاہلیت
 تھے۔ اور فہم انسانی بالغ نہ تھے۔ اس لئے انبیاء کی سرپرستی ضروری تھی۔ ہم نے اس
 موضوع پر اپنی کتاب "خاتم النبیین" پر نلجیدہ مفصل بحث کی ہے اس لئے اس
 مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرتؐ کے بعد جو بھی
 دعویٰ کھڑا ہوا۔ وہ دراصل مدعی الوہیت ہی تھا۔ شیخان علی تو پہلے ہی اپنے اماموں کو
 معصوم عن الخطا یقین کرتے تھے۔ اور کرتے ہیں اور ان کے اکثر فرقے اماموں کو
 الوہیت ہی کا درجہ دیتے رہے۔ جیسا کہ ان اوراق کے مطالعہ سے واضح ہو گیا ہوگا
 چونکہ باب اور بہار اللہ کی پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ اس لئے یہ عقیدہ نسلاً
 بعد نسل ایسا پختہ ہو چکا تھا۔ کہ باب اور بہار اللہ کے دعویٰ کو تسلیم کرنا ان لوگوں کے
 لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ مسیحی بھی مسیح کو درجہ الوہیت دیتے ہیں۔ اس لئے امریکہ میں
 بہائی مذہب قبول ہوا۔

"صبح ازل" اور "بہار اللہ" کا مقابلہ کرتے ہوئے "سیریل رائیس"

(SIR CECIL RICE) جو تھران میں برٹش منسٹر تھا لکھتا ہے کہ

"دونوں کی مثال پطرس اعظم حواری مسیح اور مقدس پولوس ہیں جتنی ہے

پطرس تو انجیل کی تبلیغ صرف بنی اسرائیل میں جائز سمجھتا تھا جن کا نشان ختم ہے

اور پولوس غیر مختون غیر بنی اسرائیل میں۔ صبح ازل کی تبلیغ مسلمانوں بالخصوص

شیخان علی میں محدود رہی مگر بہار اللہ نے کل عالم انسانی کو مخاطب کیا۔ بہار اللہ

اور پولوس میں مماثلت جبرست انگیز ہے۔ پولوس کے اپنے مکتوبات سے واضح ہوتا ہے

اور خود کہتا ہے کہ

"میں یہودیوں میں یہودی اور دینداروں میں دیندار اور رومیوں میں

رومی اور بیدنیوں میں بے دین بنا رہا اس لئے کہ مسیح کی طرف جتنے

نفوس بھی ہو سکے کھینچ لادوں۔ (نامہ پولوس اور کا انتہی ۱۹)

یہی تعلیم بہار اللہ کی ہے کہ ہر ایک مذہب و ملت کے آدمیوں کے ساتھ روح اور
ریحان کی طرح رہو۔ خواہ وہ مشرک اور کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا کی مخلوق کافر بھی
ہیں مومن بھی جو شخص مظہر الوہیت ہو "باکفر و باایمان چہ کار"

ہمیں سر دست باب اور ہامیوں کے عقائد سے بحث ہے۔ باب کی تصنیفات
میں ایک "زیارت نامہ" ہے۔ اس میں ان زائرین کے لئے جو اماموں کے روضوں کی
زیارت کے لئے جاتے ہیں ہدایات ہیں۔ اور اسی تیس کی کتاب صحیفہ البینین الحرمین
ہے۔ یہ ابتدائی تصانیف ہیں۔ تیسری کتاب "دلائل سیدہ" ہے اور چند قرآنی سورتوں،
البقرہ اور یوسف اور العصر اور الاحقاف کی تفسیر ہے۔ یہ تصانیف باب
نے دعویٰ سے پیشتر لکھی ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ

"میں نہ صرف باب ہوں بلکہ خود امام اور نقطہ ہوں۔"

دعویٰ کے بعد اس نے جو کچھ لکھا وہ مجموعہ "بیان" سے موسوم ہے۔ ادبی خوبی تو
ان میں نہیں اس لئے علماء ایران کے ساتھ جب کبھی باب کا مباحثہ ہوا اور انہوں
نے اس کے اغلاط کی طرف اشارہ کیا تو یہ کہہ کر بیچھا چھڑا یا کہ "میں صرف و نحو کا
پابن نہیں ہوں۔"

بابی اصطلاحات میں سے "باب" کی تشریح ہم کر چکے ہیں۔ "نقطہ" ایک قول
سے ماخوذ ہے جو حضرت علیؑ سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ کہ تمام قرآنِ خلاصہ سورہ
فاتحہ ہے اور سورہ فاتحہ کا خلاصہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" اور "بِسْمِ اللّٰهِ" کا
خلاصہ نقطہ حروف "ب" کا ہے۔ اور میں وہ نقطہ ہوں۔

عربی میں اکائی کے لئے نقطہ واحد ہے۔ بحساب جمل حروف: و = ۶، ا = ۱،
۳ = ۵، ۸ = ۲ اور اعداد کی میزان انہیں ۱۹ ہے۔ یعنی اعداد انہیں ۱۹ واحد کے
برابر ہیں۔ ۱۹ × ۱۹ = ۳۶۱ اور یہ اعداد ہر ایک شے کا شمار ہے۔ "عدد کل شئی"
اور الفاظ "کل شئی" بحساب ابجد: ک = ۲۰، ل = ۳۰، ش = ۳۰۰،

ی = ۱۰، میزان ۳۶۰۔ اس پر اکائی یا واحد کا اضافہ کیا جو ہر ایک عدد میں شامل ہے۔ میزان ۳۶۱ ہوتی ہے۔ اس لئے تعدد ہر ایک شے کی عدد ۳۶۱ ہے یا ۱۹، اس عدد انیس کو بابی مقدس سمجھتے ہیں اور بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا مہینہ ۱۹ روز کا۔ سال انیس ماہ کا۔ اس پر حرف لا = ۵ کا عدد زیادہ کرتے ہیں تاکہ سال شمسی بجائے قمری ہو جائے۔ مہینوں اور دنوں کے نام بھی باب، جلال، جمال وغیرم تجویز کئے گئے ہیں۔ اور ماہ و سال کو زرتشتی تقویم کے مطابق بنایا گیا ہے۔ سال "نوروز" سے شروع ہوتا ہے جو "۲۱ مارچ" پر پڑتا ہے۔ نوروز سے انیس روز پیشتر یعنی بابی سال کا آخری مہینہ "یام پیام" ہے۔ بابیوں نے عدد انیس کو روپیہ پیسہ عرف "عدد کل شے کی بنیاد قرار دیتے ہوئے تمام معاشری اور اقتصادی امور پر بھی اس کا اطلاق کیا مگر تجربہ سے ناممکن العمل ثابت ہوا اس لئے بہار اللہ نے اپنی کتاب "قدس" میں اس حد تک تجاوز منسوخ قرار دیا۔

"صبح ازل" نے جو باب کا نامزد جانشین تھا اپنے نام "یکئی" میں ایک اور جدت پیدا کی۔ یہ نام لفظ "حی" سے مشتق ہے۔ یکئی کے حروف کی میزان ۲۸ ہے صبح ازل کا دوسرا لقب "وحید" بھی ہے جس کے حروف کی میزان بحساب الجحد ۲۸ ہے۔

ایڈریا لاپیل کو ترکی "ادرفنہ" کہتے ہیں۔ صبح ازل نے اسے "ارض السرا" سے موسوم کیا۔ "ادرفنہ" اور "سرا" بحساب جمل برابر ہیں ۲۶۰ کے۔ اسی طرح زبجان ارض اعلیٰ سے موسوم کیا۔ زبجان = اعلیٰ = ۱۱۱، اعداد و شمار بابی اور ازل اور بہائی طریقہ میں اکثر استعمال ہوتے ہیں۔ اور ان سے دلائل دربارہ اثبات دعاوی اخذ کئے۔ باب کا نام علی محمد سات حرفی ہے اس کو "ذات الحروف السبعہ" سے موسوم کیا۔ آسمان سات (سبع سموات) بہار اللہ نے "عکہ" کو "بقعہ الجہا" قرار دیا جس کے معنی "عکہ" ہیں۔

باب نے حرام و حلال میں بھی سبوت پیدا کی۔ گوشت اور پیاز ممنوع قرار دیا۔

بھائی اس کے پابند نہیں لیکن "ازلی" اب بھی پابند رہیں۔ تمباکو نوشی حرام قرار دی
 عرض ایک نئی شریعت کی بنیاد رکھی جس پر بہار اللہ نے اضافہ کیا۔ اور کچھ بابی شریعت
 میں ترمیم و تنسیخ بھی کی۔ چوں کہ "ہماتیہ" کوئی اسلامی فرقہ یا مذہب نہیں بلکہ ایک نیا
 دین ہے۔ اس لئے اس پر بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اتنا ہم کہہ
 سکتے ہیں کہ جو عقائد و بارہ امامت شیعہ کے تھے اس کا لازمی نتیجہ یہی کچھ ہو سکتا تھا
 جو بہار اللہ کے دعویٰ پر واضح ہوا۔

ہم شیعہ فرقوں کے حالات کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں کہ فرقہ بندی کی ابتداء
 مسئلہ امامت سے ہوئی۔ مسعودی اپنی کتاب "مروج الذهب" میں لکھتا ہے کہ ایک
 فریق (القائلون بالنصب) کا تو یہ عقیدہ ہے کہ امامت نامزدگی سے صحیح ہے اور دوسرا
 فریق (اصحاب الاختیار) کا یہ عقیدہ ہے کہ امام نسبتاً نہیں بلکہ وصفاً منتخب ہونا چاہئے
 اول الذکر کا یہ عقیدہ ہے کہ امامت حضرت علیؑ اور آپ کے بعد آپ کی اولاد کا حق ہے
 جس کو آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت "نم" پر اپنا جانشین نامزد
 فرمایا۔ اور جن کو حضرت علیؑ نے اپنا جانشین نامزد کیا۔

اصحاب اختیار ایک تو خوارج ہیں اور فرقہ مرجئیہ اور اکثر اہل سنت والجماعت
 ان کا عقیدہ ہے کہ امت کو اپنا امام خود منتخب کرنا چاہئے۔ چونکہ عملاً خلافت راشدہ میں
 ایسا ہی ہوتا رہا۔ اس لئے یہی صحیح طریقہ ہے۔ شیعان علی امامت اور خلافت ایسی موروثی
 شخصی حکومت سمجھتے ہیں۔ جیسی کہ ملوکیت ازمنہ تا ایک میں تھی اور اب بھی ممالک اسلام
 میں کہیں کہیں ہے۔ واقعہ "نم غدیرہ" کوئی تاریخی نہیں۔ یہ اور ایسے واقعات سیاسی
 کی اختراع ہیں۔ اگر آنحضرتؐ مبینہ وصیت فرماتے اور اصحاب مہاجرین اور انصار
 اس سے واقف ہوتے تو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد نہ انصار سقیہ بنی ساعدہ
 میں جمع ہو کر اپنے میں سے ایک شخص کا انتخاب کرتے اور نہ صدیق اکبر وغیرہ کو حراست
 ہوتی کہ قریش میں سے کسی کو تجویز کرتے۔ حالانکہ اس وقت حضرت عمرؓ کے علاوہ
 امین الامۃ ابو عبیدہ بن الجراح بھی موجود تھے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ آنحضرتؐ نے

ایسی اور ایسی وصیت فرماتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر حضرت علیؑ کی بیٹی چیکے نہ رہتے
 صدیق اکبرؑ کے بعد فاروق اعظمؓ اور آپ کے بعد عثمانؓ ذی النورین کا انتخاب ہوتا ہے
 اور حضرت علیؑ کا وراثت ہے۔

آن حضرتؑ کی علالت کے دنوں میں صدیق اکبرؑ ہی امامت کے فرائض انجام
 دیتے رہے۔ اگر "خم غدیر" کا واقعہ تاریخی تسلیم کیا جائے۔ تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرات
 شیعہ علیؑ سچے ہیں اور سوائے حضرت علیؑ اور ان کے اہل و عیال کے کوئی بھی
 صحابی مسلمان نہ تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی بھی عرب مسلمان نہ تھا۔ مسلمان ہونا
 ہی تو مسلم مجوسی تھے۔

نواب محسن الملک مدنی علیؑ نے اپنی کتاب "آیات بیانات" میں یہی کچھ
 لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام محض ایک سیاسی ڈھونگ رہ جاتا ہے۔ حالانکہ خلفاء
 راشدین کی بے لوث خدمات اور ان کی درویشانہ سادہ زندگی سے یہ امر بہت بعید
 ہے کہ وہ دنیوی حکومت اور جاہ جلال کے طالب تھے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ایرانی
 ہی اس بات کے قائل ہیں کہ خلافت حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کا حق تھا جو غضب
 کیا گیا ہے اور سب صحابہ کی نسبت نہایت ناشائستہ کلمات استعمال کرتے ہیں۔
 بہر حال یہ تفریق جو امامت اور خلافت کے نظریہ نے پیدا کی محض سیاسی ہے۔ ایرانی
 پھر سے اپنی گزشتہ عظمت و شان بحال کرنا چاہتے تھے۔ یہ حقیقت مولف "دستان
 مذاہب" اور حال میں قاسم زادہ ایرانی نے اپنی کتاب "جلوہ ریزی روح ایران"
 میں بے نقاب کی ہے۔ انہوں نے "اہل بیت" کا ساتھ اسی لئے دیا کہ اموی خلافت
 جو خالص عربی تھی اس کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ کوفہ ان کی شورش کا مرکز تھا اور ہمیشہ
 رہا۔ اور حضرت علیؑ سے بھی سیاسی غلطی یہی ہوئی کہ مدینہ کی جگہ کوفہ کو دار الخلافہ مقرر
 کیا۔ اس لئے کہ کوفہ ایران کے قریب میں ہے۔ آپ عرب سے اور عرب آپ سے
 بیگانہ ہو گئے۔ عرب بنو امیہ کا پشت پناہ بن گیا۔ ان کی عقیدت کا فائدہ ان کو اور
 بنو ہاشم کو سیاسی تنازعہ ہوا کہ بنو امیہ کے ساتھ عرب کا زور ٹوٹ گیا۔ عباسی خلافت

میں بھی اول براء مکہ اور پھر وینا لہذا ایرانی ہی خلیفہ اور خلافت کے سرپرست رہے۔
بلکہ تمام غیر عرب سلاطین خلیفہ کرتے تھے۔

عجمی عموماً "اہل بیت" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اور اس سے مراد پنج تن
یعنی آنحضرتؐ اور حضرت علیؑ اور حضرت زین العابدینؑ اور ان کے دو بیٹے امام حسنؑ اور حسینؑ
ہیں۔ یہ بالکل عربی محاورہ کے خلاف ہے۔

اہل بیت، قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے اور معنی گھر والی یا گھر والیاں ہے۔ لیکن
عجمی پر اپنا غنڈا کے اثر کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اہل سنت والجماعت بھی اس
اصطلاح کو عجمی مفہوم کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔

اس اہل بیت نے ایک اور سیاسی الجھن پیدا کر دی۔ مسلمانانِ فارس ممکن ہے کہ کوئی
شخصیت ہو۔ لیکن اس کا نام اتنا اچھا لگتا۔ کہ اکثر روایات اس کی فضیلت کے بارے
میں موجود ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ جب آنحضرتؐ نے مہاجرین اور
انصار میں رشتہ مواخاة قائم کیا تو ایک مسلمانِ فارس ہی باقی رہ گیا۔ یہ نہ مہاجر تھا اور نہ انصار
رسول کریمؐ نے فرمایا کہ مسلمانانِ من اهل بیتی۔ عام تشریحی روزمرہ میں اس کے معنی یہ ہوتے
ہوتے کہ مسلمان میری زوجہ ہے یا ازواج میں سے ایک ہے۔ لیکن عجمی پر اپنا غنڈا لٹانے اور
تو اسے اہل بیت میں جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں شامل کیا۔ اس کے بعد اس کی شان میں قرآنی
آیت بھی نازل ہوئی۔

واخرین منہما لہا یلحقوا بہما (۲۸)

اور ان (میں سے) دوسرے پر جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوئے
جب اصحاب نے دریافت کیا کہ وہ کون خوش نصیب ہے جس کے حق میں یہ آیت
نازل ہوئی ہے تو ان حضرت نے فرمایا کہ
"وہ فارسی الاصل مسلمان کا ہر قوم ہوگا۔ علم اگر تشریحاً میں ہوگا یا تشریحاً میں وہ
وہاں سے جیسا کہ آئے گا۔"

چنانچہ ایران میں جس کسی نے دعوتِ نبوت یا امامت کیا اسی حدیث کو سنداً پیش کیا۔

اس حدیث نے ان تمام احادیث کی تردید کر دی جن کی رو سے مہدی کا ظہور ہونا قاطع سے ہوگا۔ بعض احادیث کی رو سے ہونا شہ سے ظہور روایت ہوا ہے۔ سلمان فارسی کی نسبت ابن اثیر اسناد لغابہ میں لکھتا ہے کہ

”بعض روایات کے مطابق اس کی عمر جب اس کو ان حضرت کی صحبت

نصیب ہوئی چھ سو سال تھی۔ اس نے جو اریان مسیح کا زمانہ پایا۔ بعض

روایات سے کم از کم عمر ڈھائی سو سال تھی۔“

ہمارے زمانہ کے مشہور فسانہ نگار مولانا عبدالحلیم شرر نے ”ہو یا ئے حق“ لکھ کر انہی روایات کی تصدیق کی ہے۔

اگر آنحضرت حضرت علیؑ کی نسبت وصیت فرماتے تو مناسب وقت حجة الوداع

کا تھا۔ جہاں سب اصحاب موجود تھے۔ اور اس کے بعد کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہ

رہتی۔ عجمی پر وہاں عندا کی تائید میں بے شمار احادیث وضع کی گئیں اور بعض صحیح

احادیث میں ایک آدھ لفظ بھی بڑھایا گیا۔ مثلاً آنحضرت نے فرمایا کہ

”میں اپنے بعد قرآن چھوڑ رہا ہوں اگر تم اس کو مضبوطی سے تھامنے رکھو گے

تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔“

”کتاب اللہ کے ساتھ لفظ ”عترتی“ اور بعض جگہ ”اہل بیٹی“ بڑھا دیا گیا۔ آیہ

”لا استلکم علیہ اجر الا المودة فی القربی۔ لفظ ”قربی“ سے مراد اہل بیت

لی گئی۔ اگر یہ صحیح ہو تو اجر کی نفی نہیں ہو سکتی۔ لیکن آیت کا مطلب بالکل صاف ہے

کفار جو بھی اسلام قبول کرنا اس کا مقاطع کرتے۔ آنحضرت نے سمجھایا کہ تبلیغ کا جو تمہارا

ہی فائدہ کی بات ہے میں کچھ اجر تو مانگتا نہیں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ فطری رشتہ قرابت

کا تو پاس کرو۔ اپنے ہی بھائی بندوں سے محض قبول اسلام پر قطع تعلق نہایت نامناسب

ہے۔

ہندوستان میں بھی ہندوؤں نے کفار مکہ کی سنت پر عمل کیا۔ اگر وہاں ہوش و

خرد سے کام لیتے تو وہ قوموں کا نظریہ جس کا وہ آج روٹنے ہیں کسی کے ذہن میں پیدا نہ ہوتا

اور نہ ہندوستان پر اغیار کا تسلط ہوتا جس نے ان دونوں کو ایک ہی لاطھی سے ہانکا اور
 نراج یہ برصغیر بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہوتا۔ اس تلخ تجربہ کے بعد بھی ابھی تک
 ان کے حواس خمسہ درست نہیں ہوتے جو کچھ تقسیم کے بعد قتل و غارت کا مظاہرہ
 کیا۔ وہ ان کی روایتی ذہنیت کی لپستی کے مناسب ہے۔ انہوں نے بدصحوں اور
 جینیوں سے کیا سلوک کیا۔ یہ "مست" اور ان کے پیروان کے مذہب کی شاخیں
 ہیں اور یہ لوگ ان کے اپنے بھائی ہیں۔ ان کی تنگ نظری نے "قومیت" کا رپود
 بکھیر کر رکھ دیا۔

کفار مکہ کو آں حضرت نے بہت دفعہ سمجھایا کہ "لکھنا دینکم ولی دین (نہی)
 لیکن کفر و شرک کا خاصہ ہی فتنہ و فساد برپا کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عرب حلقہ
 بگوش اسلام ہو گیا۔ اور ہندوستان سر دست دو حصوں میں تقسیم اسی لئے ہوا کہ "مودتہ
 فی القرینی" کی حکمت کفار و مشرکین ہند نے نظر انداز کر دی۔ اور ابھی تک اسی جاہلیت
 کی ضد پراٹے ہوتے ہیں۔ اور کبھی چین نہ بیٹھیں گے جب تک صغیر ہستی سے کفار مکہ
 کی طرح حرف غلط کی طرح نہ میٹ جائیں۔

"مودتہ فی القرینی" میں ایک سبق مسلمانوں کے لئے بھی ہے۔ محض ایک فرعی
 عقیدہ کو اتنی اہمیت دینا کہ اپوں سے رشتہ اخوت توڑنا اور غیروں سے جوڑنا کہاں
 کی عقل بندی ہے۔ "ان المؤمنون اخوة"۔

ہم نے ان اوراق میں مذاہب اسلامیہ کے عقاید پر بحث کرتے ہوئے اس تاریخی
 واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ابتدا میں ہر ایک فرقہ کا جوش اتنا حد اعتدال سے
 بڑھا ہوا تھا کہ ایک دوسرے کو کافر کہتا۔ اس میں پیش پیش خوارج اور شیعہ تھے۔ جب
 ذرا طبع میں سکون پیدا ہوا تو کہنے لگے کہ کافر سے مراد "کافر نعمت" ہے کافر ملت نہیں
 ابوالحسن اشعری معجز لہ کو تمام عمر کافر کہتا رہا۔ آخر اتنا نرم پڑ گیا کہ وصیت کی کہ کسی
 مسلمان کو جو اہل قبلہ ہو کافر کہنا جائز نہیں۔

خوارج

ازارۃ | خوارج کے فرقوں کے حالات مختصر ہم لکھ چکے ہیں۔ ان کے تاریخی حالات
 جہاں تک خلافت اموی سے تعلق ہے ہم نے اپنی کتاب دمشق میں
 لکھے ہیں۔ ان اوراق میں صرف بہ تعلق مذاہب اسلامیہ ان کے عقائد سے بحث ہے
 شہرستانی نے فرقہ ازادہ کے چند عجیب بیان کئے ہیں :-

(۱) سب سے بڑا عجیب یہ ہے کہ حضرت علیؑ اور آپ کے اصحاب کی تکفیر کرتے
 ہیں اور حضرت علیؑ کے قاتل عبدالرحمن ابن ملجم کی مدح میں رطب اللسان ہیں۔ ان کے ایک
 مفتی اور زاید اور شاعر عمران بن محطان نے ابن ملجم کی مدح میں شعر کہے ہیں۔ نمونہ
 ملاحظہ ہو :-

یا ضرباً من نسیب ما اراد بها

کیا ہی اچھی کاری ضرب تو بہ کرنے والے نے لگائی

الذی یبلغ من ذی العرش رضوانا

کہ اس کی عرض محض اللہ کی خوشنودی ہی تھی۔

انی لا ذکرہ یومنا فاحسبہ

میں اسے یاد کرتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ اس کے نیک اعمال

اوقی البریہ عند اللہ میزاننا

اللہ کے نزدیک تمام خلق سے بڑھ کر ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ خوارج کا یہ فعل بہت ہی مذموم ہے۔ واقعہ یہ ہے

کہ ان ایام میں خوارج کی لنگاہ تین شخصوں پر تھی۔ ایک حضرت علیؑ دوسرے امیر معاویہ اور تیسرے عمرو بن العاص۔ ان کی رائے یہ تھی کہ انہی تینوں شخصوں کی وجہ سے دنیا تے اسلام میں فتنہ و فساد برپا ہے۔ اور یہی تین شخص خوارج کے دشمن بھی تھے۔ اس لئے ایک سازش یہ پختہ کی گئی کہ بیک وقت تینوں کو قتل کیا جائے۔ چنانچہ کوفہ میں حضرت علیؑ پر جب کہ آپ صلوٰۃ الفجر کے لئے مسجد کی طرف جا رہے تھے، ابن ملجم نے قاتلانہ حملہ کیا۔ آپ جاہر نہ ہو سکے۔

ابن اثیر لکھتا ہے کہ

ابن ملجم موقع پر ہی گرفتار ہوا۔ اس کو نہایت اذیت سے مارا گیا پہلے اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے۔ اس کی زبان پر قرآن کی آیات تھیں۔ زبان کاٹنے لگے تو کہا کہ ایسا نہ کرو۔ میرے باقی اعضاء ایک ایک کر کے کاٹ دو۔ جب تک میں زندہ ہوں اجازت دو کہ میری زبان پر آیات قرآن ہوں۔ ایسا سخت جان تھا کہ سخت اذیت پر بھی افسانہ تک نہ کی اور برابر قرآن پڑھتا رہا۔

بعض روایات کے مطابق اس کی لاش جلا دی گئی۔

دمشق میں امیر معاویہ پر بھی صلوٰۃ الفجر کے وقت بحالت امامت حملہ ہوا۔ آپ کا قد دراز تھا۔ اس لئے ضرب کندھے پر پڑی۔ زخم اگرچہ گہرا تھا۔ مگر چند ماہ بعد مدمل ہو گیا۔

جامعہ مصر میں بحالت امامت ایک اور ناگروہ گناہ پر حملہ ہوا۔ عمرو بن العاص اس روز بیمار تھا۔ اس لئے ایک اور شخص فرائض امامت انجام دینا ہوا مارا گیا۔

اگر ہم آج اپنے زمانہ کے سیاسی حالات کا جائزہ لیں تو اس قسم کے قتل کے اسباب وہی سیاسی ہی ہیں۔ لیکن ان ایام میں جن کا تذکرہ ہم کر رہے ہیں مذہبی جوش میں لوگ ہوتے تھے۔ لیکن ایک بات پتہ کی ہم بھی کہتے ہیں۔ کہ حضرات اثناعشریہ بھی تو قاتل عمر کے گن گاتے ہیں اور قتل عثمانؓ پر بغلیں بجاتے ہیں۔ ہم تو اس قسم کے قتل کو انتہائی مذموم

اور بدترین جرم یقین کرتے ہیں۔ اور جو بھی کسی مومن مسلمان کو عمدتاً قتل کرے اس کی سزا جہنم ہی مقرر ہے۔ بالخصوص خلفاء راشدین پر ہاتھ اٹھانا اور ان کی شان میں ناشائستہ الفاظ کہنا کسی مومن مسلمان سے بعید تر ہے۔

۲۔ دوسرا عجیب شہرستانی نے خوارج پر یہ لگایا ہے کہ

”خوارج ان مسلمانوں کی بھی تکفیر کرتے ہیں جو ان کے عقائد کے خلاف ہیں“

”ایں گناہیست کہ در شہر شمایز گفتند“

Hamud
P.O. Box
Lah

کون سا فرقہ ہے جو ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کرتا۔ اور ان کے فتویٰ کفر پر یقین کیا جا تو تمام دنیا نے اسلام میں ایک مسلمان نہیں۔ ہم تو ان کا فرقہ فرقوں کو غلطی خوردہ سمجھتے ہیں۔ کاش یہ سلف صالحین کا اتباع کرتے اور کافروں کو مسلمان بناتے۔ یہ مسلمانوں کو اچھے بھلے مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔

دائے گراؤ پس امروز بود فری

۳۔ تیسرا فرقہ قراداد جرم میں یہ ہے کہ مخالفوں کے بچوں کو بھی تکفیر کرتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ مسیحیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ کہ جو بچہ اصطلاح نہ پائے جہنم میں جاتے گا۔ یہ عقیدہ خوارج کے بعض فرقوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور بعض فرقے اس کے خلاف تھے۔ بہر حال یہ عقیدہ مسیحیوں کا ہو یا خوارج کا، صحیح نہیں۔

۴۔ چوتھا جرم یہ ہے کہ ”زانیہ اور زانی کی سزا جہنم تسلیم نہیں کرتے“

قرآن میں تو زہم کی سزا نہیں۔ بلکہ نص قرآنی میں ہے کہ زانیہ زانی سے اوزانی زانیہ سے نکاح کرے۔ اگر سزا جہم ہوتی تو نکاح کی نوبت ہی نہ آتی۔ دوسرے نص موجود ہے کہ نوزیدوں کی سزا زنا آزاد عورتوں سے نصف ہے۔ زہم کا نصف تو ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ ہماری تحقیق کی روش سے خوارج اس مسئلہ میں حق پر ہیں۔ نص میں

موجود ہے کہ مومن مرد اور مومن عورت پر کسی زانیہ اور زانی سے نکاح حرام ہے۔ ظاہر ہے کہ زہم کے بعد نکاح کا بار بار نکورے معنی ہے اور یہ کہ اہل ایمان پر زانیہ یا زانی سے نکاح حرام ہے اور زانیہ یا زانی خود نکاح باہم کریں یا کسی مشرک سے ظاہر ہے کہ بھلائی زنا وہ ایمان سے خارج ہیں اور احادیث بھی اس کی تائید میں ہیں کہ زنا کا مرتبب ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ بخاری

کا یہ عقیدہ بھی قابل گرفت ہے۔

ہ۔ پانچواں جرم یہ ہے کہ خوارج تقیہ نہ گفتار میں اور نہ کردار میں جائز قرار دیتے ہیں۔

یہ مسئلہ تقیہ خالص شیعہ اور خوارج میں متنازعہ فیہ ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ جائز ہے اور خوارج کہتے ہیں نا جائز ہے۔ اہل سنت والجماعت خوارج کے ہم نوا ہیں۔ ہم نے اس پر بحث کی ہے نص قرآنی کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ تقیہ کی شرعی رخصت ایک خاص حالت میں ہے۔ اس کو فرض و واجب کے تحت نہ لانا چاہیے۔ اس کی حکمت آیہ "ولا تعلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" (۲/۸) میں واضح کی گئی ہے۔ انسانی زندگی سب سے بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے جان ہے تو جہان ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے اس کو اس کمال کے حاصل کی توقع ہے جو اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ علاوہ ازیں کسی ایسی شخصیت کا قتل جس سے قوم کی توقعات وابستہ ہوں بسا اوقات قوم کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ حضرت عثمان اور حضرت علیؓ اور امام حسینؓ ایسی شخصیتیں ہیں کہ ان کا قتل آخریہ رنگ لایا کہ عرب کے ہاتھ سے خلافت مکمل گئی۔ اگر امام حسینؓ تقیہ سے کام لیتے تو آج جو شیعہ و خوارج کا بھگڑا ہے پیدا نہ ہوتا۔ سنی محض ایک عقیدہ کی وجہ سے شیعہ کے نزدیک واجب القتل ہیں۔ صفوی خاندان نے اس کو عملاً ثابت کیا۔ اور سنیوں کا قتل عام بھی ردعمل کا تقاضہ کرتا تھا۔ شام میں شیعوں کو نتیجہ بھگتنا پڑا۔

"تقیہ" میں رواداری کا مفہوم پایا جاتا ہے اور خاموش "مدافعت" بھی ہے ہماری تحقیق کی روش سے شیعہ عقیدہ دربارہ تقیہ ایک حد تک صحیح ہے۔ خوارج کا یہ عقیدہ کہ تقیہ نہ قولاً نہ فعلاً جائز ہے۔ اس عقیدہ سے لگا کھاتا ہے کہ حق کا اظہار بلے سو متلا تمہ کرنا چاہیے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ بعض ہستیاں اظہار حق پر اپنی یائیں قربان کر گئیں۔ ان کا نام اور کارنامہ زندہ ہے۔ ان کی تبلیغ کا اثر اس قربانی سے خاطر خواہ ہوا۔ لیکن ہر ایک شخص اس دل و جگر کا آدمی نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن حکیم

نے ایک راستہ معقول بتایا ہے کہ سانپ مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ہجرت سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں۔ آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اور امام اعظم حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ اور حضرت موسیٰؑ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ سب نے ہجرت کی۔

بہر حال اختلاف عقیدہ جو فرعی ہے ایسی بات نہیں کہ کسی مسلمان کی تکفیر کی جائے خود شہرستانی لکھتا ہے کہ

”مسئلہ تقیہ پر خوارج کا بھی اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے اور بعض کہتے ہیں ناجائز ہے۔ اور دونوں دلائل آیات قرآنی ہی سے اخذ کرتے ہیں۔“

یہ ایک فقہی مسئلہ ہے کہ کوئی شخص کسی آیات قرآن کا منکر کا فر ہے لیکن اگر کسی آیت کی تاویل کرتا ہے تو وہ منکر نہیں اس لئے کافر بھی نہیں۔

شہرستانی لکھتا ہے کہ

”خوارج سجستان اور خراسان اور کرمان اور کہستان عطیہ کے مذہب پر ہیں۔ نجدہ بن عامر اور نافع بن اندق میں اختلاف اسی مسئلہ تقیہ پر ہوا۔ نافع کہتا تھا کہ تقیہ حلال نہیں اور نجدہ حلال کہتا تھا۔ نافع آیہ کریمہ ”وإذا فریق منهم بخترون الناس كخشيبة الله“ اور ”يقاقلون في سبيل الله لا يخافون لومة لائم“ سے استدلال کرتا ہے اور نجدہ دلیل میں آیہ کریمہ ”الذات تقوا منهم لقاة“ اور ”قال رجل من آل فرعون يكتما إيماناً“

اس مباحثہ میں نافع کچھ نرم پڑ گیا۔ اور کہا کہ حالت تقیہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اہل ایمان مقہور ہوں اور اصحاب رسول اللہ مکہ میں مقہور تھے۔ لیکن جب امکان مجاہدہ ہو تو تقاعد کفر ہے۔ کیونکہ ”وفضل الله المجاہدین علی القاعدین اجراً عظیماً“ مجاہدہ کی طاقت رکھتے ہوئے تقاعد کفر ہے۔ اب یہ مسئلہ صاف ہو گیا۔ احکام حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ جو کچھ حالات کا تقاضا ہے۔ اسی کے مناسب احکام بھی

قابل عمل ہیں۔ زمان و مکان کے لحاظ سے حالات مختلف ہیں اس لئے ان کی مناسبت کے ساتھ احکام بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ماسویٰ اصولی احکام کوئی حکم مطلق نہیں ہے۔ حالات کے تحت اس کی صورت مختلف ہوگی۔ خوارج اور شیعہ کی غلطی یہی ہے کہ اس کو مطلق سمجھتے رہے۔

احکام شریعت پر ہم نے اپنی کتاب اصول فقہ اسلامی میں بحث کی ہے فرقہ زیاویہ صفحہ ۲۴۱ پر ہے۔ جاہل زمانہ میں جائز نہیں سمجھتا۔

آج ہمیں یہ باتیں کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں کہ فرقہ خوارج عجاوبہ اور صبیہ اور میمونہ وغیرہم میں اختلاف کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ کفار کے نابالغ بچے فوت ہو جائیں تو جہنم واصل ہوں گے یا جنت میں جائیں گے؟ یہی بحث جو انتہائی نامعقول معلوم ہوتی ہے مسیحی علماء میں بھی بہت عرصہ پیشتر موضوع بحث رہی۔ انہی سی بات پر فرقہ بندی اور تفرقہ پیدا ہو گیا۔

ہمارے زمانہ میں فرقہ وہابیہ جو اہل حدیث کہلاتا ہے و آئین بالجہر اور رفع یدین پر اپنا تمام زور استدلال صرف کرتا رہا۔ حنفی کہتے کہ آئین نخی اور وہابی کہتے بالجہر واجب یا فرض یا کیا کچھ ہے۔ دونوں کو معلوم نہ تھا کہ لفظ "آئین" عبراتی ہے اور قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ نخی ہویا جلی جزو مذہب نہیں۔ ممکن ہے کہ اس حضرت نے یہ تقلید اہل کتاب "آئین" کہی ہو۔ آنحضرتؐ جب تک کوئی حکم کسی خاص امر میں وحی نہ ہوتا اہل کتاب کا اتباع فرماتے۔ جیسے تحویل قبلہ۔ کسی نے آئین کہی یا نہ کہی میرے نزدیک ایک ہی بات ہے۔

خوارج اور بالخصوص معتزلہ میں ذات و صفات و اسماء اللہیہ بھی بحث کا موضوع تھیں اور اختلاف رائے پر علیحدہ علیحدہ فرقے بھی بنے۔

تو کارزیں را لکوساختی

کہ با آسمان نیز برداشتی

خوارج میں خاص بحث کا موضوع یہ رہا ہے کہ گناہ کبیرہ کسی مومن سے رزق نہیں

ہوتا۔ اگر ہو تو مومن نہیں۔

ہم اس موضوع پر بحث کر چکے ہیں۔ صحیح حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ

لا ینزنی الزانی حین ینزنی و لا یسرق السارق حین

یسرق و هو مومن ۛ

یعنی کوئی شخص زنا اور سرقہ کا ارتکاب بحالت ایمان نہیں کر سکتا۔

یہ بھی ایک فقہی مسئلہ ہے۔ اس کا اثر حقوق اللہ پر نہیں پڑتا۔ جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے یہ جرائم قابل مواخذہ ہیں اور ان کی انتہائی سزا بھی مقرر ہے۔ نوعیت و حالات جرم کے لحاظ سے عدالت سزائیں کمی بھی کر سکتی ہے۔ مگر انتہائی سزا مقررہ سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد اور توبہ کے بعد اصلاح کی جہنی گنجائش ہے۔ سزا کے بعد کوئی اور سزا اپنی طرف سے تجویز کرنا حدود اللہ سے تجاوز کرنا ہے۔

خارجی فرقہ اباضیہ نے اموی خلیفہ مروان بن محمد کے زمانے میں خروج

کیا۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارے مخالف ہمارے مذہب کے منکر یا کافر ہیں ویسے

مومن اور موحّد ہیں۔ اور یہ جو بھی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے کافر بکفران نعمت ہے

نہ کافر ملت۔ اور کفار کے بچے اللہ کے فضل سے بہشت میں جائیں گے۔

فرقہ حقیصہ بھی یہی کہتا ہے کہ

”زنا و سرقہ و شرب خمر سے مسلمان کافر نعمت ہوتا ہے مگر شرک سے

بری ہے ۛ

فرقہ زیاد و یہ صفریہ جو زیاد بن اصف سے منسوب ہے یہ کہتا ہے کہ

ہر ایک عمل جو گناہ یا جرم ہو اس کی حد مقرر ہے۔ زانی کو زانی اور چور کو

چور اور شرابی کو شرابی کہیں گے کافر نہیں کہہ سکتے۔ البتہ وہ کیا کرتے

جن کا اثر حقوق اللہ پر پڑتا ہے مثلاً ترک صلوٰۃ کفر ہے۔ کیونکہ مومن اور

کافر میں ماہ الامتیاز یہی عمل ہے ۛ

ان کا عقیدہ ہے کہ

شُرک دو قسم کا ہے۔ ایک شرک طاعت شیطان اور دوسرا عبادت
 اوتان (بت پرستی) اور کفر بھی دو قسم کا ہے ایک کفر نعمت اور دوسرا
 کفر بویہت۔

فرقہ یونسیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ

”ایمان اللہ کی اطاعت اور خضوع اور ترکِ اشکبار ہے اور بس۔ اطمین
 کو بھی معرفت، توحید حاصل ہے۔ مگر بوجہ تکبر کافر ہوا جس دن میں خضوع
 ہو اور بت الہی ہو۔ معصیت کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا۔ اگر معصیت
 مبتلا بھی ہو تو یقین و اخلاص کی وجہ سے مضر نہیں۔ مومن اخلاص کی وجہ
 سے بہشت میں جائے گا نہ عمل و طاعت سے۔“

Hammad
P.O. Box No. 27
Lahore

معتزلہ

ہم "اسباب تفرقہ" کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ اسلام میں عجمی عقائد کا داخلہ ایک تو ایران اور دوسرے یونان سے ہوا۔ ایرانی عقائد کا اثر شیعہ اور اس کے مختلف فرقوں میں واضح کیا جا چکا ہے۔ ان عقائد میں مخلوق کو خالق کے مشابہ یا مثل سمجھا گیا ہے۔ یا یہ حلول و اتحاد کے قائل ہیں۔ اس بنیادی عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عصمت انبیاء و امام سے نمایاں جگہ لے لی۔ اور ظاہر ہے کہ انبیاء و رسول اور امام کو اگر صفات لغظوں میں "اللہ" نہ بھی کہا جائے۔ منظر الوہیت یا کسی اصطلاح سے یاد کیا جائے تو مفہوم ایک ہی ہے۔ کہ ایسا شخص ان انسانی ظہری کمزوریوں سے پاک ہے۔ جس میں سے ایک خطا و نسیان بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے۔ امام بھی حی و قیوم ہے۔ اکثر فرقوں کا یہ عقیدہ ہے کہ امام ابھی تک زندہ ہیں و دوبارہ تشریف لائیں گے۔ کسی مصلحت کے تحت روپوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی تو ہم سے روپوش ہے۔ اور اسباب سے جو اس کے پیدا کردہ ہیں کام لے رہا ہے۔ اسی طرح امام غائب اپنے نائبوں سے کام لے رہے ہیں جب امام ظاہر ہوگا تو اسی طرح عدل و انصاف فرمائے گا۔ جس طرح بروز قیامت اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ امامت کو شیعہ نے بنو ہاشم بالخصوص بنو فاطمہ میں محدود رکھا۔

ہم واضح کر چکے کہ شیعہ اور خوارج کی ابتدا سیاسی تنازعات و اختلافات سے ہوئی۔ اب ہم ایک اور فرقہ کا تذکرہ لکھتے ہیں جو سیاسیات سے الگ رہا۔ اس پر فلسفہ یونان کا اثر تھا۔ اس فرقہ کو فلسفہ یونان سے اتنی واقفیت نہ تھی جیسی کہ آج ہمیں ہے۔

مگر اتنی بات ضرور تھی کہ یہ لوگ معقول پسند تھے۔ ہر ایک عقیدہ کو میزان عقل میں تولد ان کی بحث کا موضوع الہیات ہی رہا۔ اس لئے ذات و صفات باری تعالیٰ کے متعلق جو کچھ عقائد تھے انہی کو زیر بحث لائے۔ جاحظ "حیوان" میں اتنا تسلیم کرتا ہے کہ معتزلہ نے لوگوں کی قوت فکریہ میں ایک حرکت پیدا کر دی۔ اور مفید راستہ کھولا۔

معتزلہ کے بنیادی عقائد پانچ ہیں جن کو پانچ ارکان کہنا چاہیے۔

۱۔ قل ھو اللہ احد القول بالتوصیہ

۲۔ اللہ عادل ہے القول بالعدل

۳۔ سزا و جزا اعمال کے مناسب دیتا ہے۔ القول بالوعد والوعید

۴۔ گنہگار مسلمان بے دین تو نہیں لیکن فاسق ضرور ہو جاتے ہیں۔ منزلة بن المنذر

۵۔ واجب ہے کہ انسان راست باز اور راستی کا حامی ہو اور گمراہی اور

بدی کی مزاحمت و مدافعت کرے۔ ~~اس~~ اسر بالمعروف و ہی عن المنکر

ان کی تشریح مسعودی نے مروج الذهب میں اور ابن حزم اور دیگر مورخین نے

کی ہے۔

معتزلہ پر یہ الزام عموماً عاید کیا جاتا ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ کو منزه صفات

یقین کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے مخالفین نے ان کو "معتزلہ" سے مخاطب کیا۔ یعنی

"معتزلہ" جو ذات کو صفات سے علیحدہ کرتے ہیں۔ صفات سے ان کو انکار نہیں۔ مگر

ان کی توجیہ وہ اور طرح کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض فرقوں نے جو انسان اور

خدا کے اسماء و صفات میں مشابہت یا مماثلت یا عینیت پیدا کر رکھی ہے معتزلہ

اسے تسلیم نہیں۔ وہ "لیس کمثلہ شی" پر زور دیتے ہیں اور ھو السميع بصیر

کی تاویل کرتے ہیں۔

"معتزلہ" کی وجہ تسمیہ ایک یہی بیان کی گئی ہے کہ

"ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا اور کہا کہ مسلمانوں میں ایک جماعت

ہے جو کہتی ہے کہ جو شخص کبائر کا مرتکب ہو وہ کافر ہے۔ اور یہ فسوق

”وَعِيْدِيْهِ خَارِجِيٌّ“ ہے جو ایسا کہتا ہے۔ دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے کہ گناہ خواہ

کبیرہ ہو ایمان کے لئے مضر نہیں کیونکہ عمل رکن ایمان نہیں۔ وہ کہتے

ہیں کہ کوئی گناہ ایمان کے لئے ضرر رساں نہیں جیسے کوئی نیک عمل کفر

کے ساتھ مفید نہیں۔ اس فرقہ کو ”مرجیہ“ کہتے ہیں۔ یہ افراط و تفریط جو

ان مذاہب کے عقائد میں ہے۔ ان کی نسبت آپ کا کیا ارشاد ہے۔

حسن بصری تو تھوڑی دیر مراقبہ میں گئے۔ واصل بن عطا آپ کا

شاگرد موجود تھا۔ اس نے کہا کہ میں بتاتا ہوں۔ افراط و تفریط کے درمیان

عدل ہے۔ اس لئے جو کبیرہ گناہ ترک ہو جائے تو مطلقاً مومن ہے اور نہ

مطلقاً کافر۔ ایمان و کفر کے درمیان ایک منزل ان دو منزلوں میں ہے،

اس کے بعد اٹھ کر مسجد کے ایک ستون کی اوٹ جا بیٹھا۔

خواجہ حسن بصری نے کہا کہ ابن عطا ہم سے الگ جا بیٹھا۔ عولت

پکڑی۔ اس لئے اس فرقہ کا نام ”معتزلہ“ ہوا جو عزل سے مشتق

ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ ”شہرستانی“ نے ”طلح والنخل“ میں لکھا ہے۔ خواجہ حسن بصری نے

فرمایا کہ :-

”ایمان سے مراد خصائل نیک ہیں جس میں یہ خصائل جمع ہوں ہم اسے

مومن کہتے ہیں۔ اور اس اسم سے اس کی مدح کرتے ہیں اور فاسق وہ

کہ جس میں نیک خصائل جمع نہ ہوں اس لئے وہ مستحق مدح بھی نہیں۔

جب ہم کسی کو ”فاسق“ سے مخاطب کرتے ہیں تو اس کی مذمت بوجہ

خصائل ذمیرہ کر کے ہیں۔ لیکن اس کو مومن و کافر بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ کلمہ

کریمہ کی شہادت کا قائل ہے اور کچھ نیک اعمال بھی اس سے سرزد ہوتے

ہیں۔ البتہ جو شخص کبار کافر تکلیف ہو۔ تو یہ گنہگار ہے اور مر جائے تو

ضرور جہنم واصل ہوگا۔ مگر اس پر بھی اس پر عذاب ہر

ہوگا۔

ہم نہیں سمجھ سکے، کہ خواجہ صاحب نے کیا بات واصل بن عطا کی تردید میں کہی۔ البتہ اسی کی رائے کی تشریح کر دی کہ "کتہ کار مسلمان کافر مطلق نہیں ہوتا" معلوم نہیں کہ اس نقلی بحث میں کیا رکھا ہے۔ خواجہ بھی یہی کہتے ہیں کہ کیا مکر کا مرتکب کافر نعمت ہے کافریت نہیں اور مرتضیٰ بھی یہی کہتے ہیں۔ اور معتزلہ بھی دوسرے لفظوں میں یہی کچھ کہہ رہے ہیں۔

۱۹ صلیہ یہ فرقہ معتزلہ پہلا فرقہ ہے جو واصل بن عطا سے منسوب ہے۔ اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام عقلا کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہ اللہ قدیم نہیں ہو سکتے اس لئے اگر اثبات غیر ذات کیا جائے تو وہ اللہ قدیم ہوں گے جو محال ہے۔ ذات واحد ہے اس میں تعدد کا وجود شرک ہے۔ اس لئے اگر صفات کو غیر ذات تسلیم کریں تو تعدد لازم آتا ہے اور یہ شرک ہے۔ البتہ اس کے دو صفات علم و قدرت جو دراصل ایک ہی صفت علم ہے عین ذات ہے۔ ایک شخص کو کسی شے کے بنانے کا علم ہے اگر نہ بنائے تو اس علم کی نفی نہیں ہوتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات واحد کامل ہے۔ انسان کو کسی شے کے بنانے کے لئے اسباب کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم بلا سبب اشیا خلق فرماتا ہے جس کا اسے علم ہے یعنی اسے دوسری صفات کی مدد کی ضرورت نہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب ہم کسی شے کو مشخص و معین کریں گے تو غرض یہ ہے کہ اس کو اپنے احاطہ تصویر میں لائیں۔ اس طرح اس کو محدود بناتے ہیں۔ غیر محدود کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم و غفار و جبار و غیر ہم ہے تو ہم اسے اسماء و صفات سے مشخص کرتے ہیں اور غرض یہی ہے کہ اس کو اپنے احاطہ تصویر میں لائیں۔ اس طرح ذات باری تعالیٰ معین و مشخص ہو کر محدود ہو جائے گی۔ لیکن قرآن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ بیان کئے گئے ہیں۔

معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ معرفت امثال ہی سے ممکن ہے۔ ناممکن ہے کہ خدا ایک

دوسرے کو پہچانیں۔ نور پر ظلمت کا اور ظلمت پر نور کا ہم قیاس نہیں کر سکتے۔ اس لئے
 اگر کسی کو دعویٰ معرفت باری تعالیٰ ہے تو زیادہ سے زیادہ وہ اس کو اپنی مثل ہی قیاس
 کریگا۔ مگر "یس کعشلہ شیء" وہ تو کسی شے کی مثل جیسا نہیں ہے۔ لیکن ہمیں
 سمجھانے کے لئے یا ایک کیفیت ہمارے ذہن میں پیدا کرنے کے لئے فرمایا کہ وہ سمیع و
 بصیر ہے۔

جب کسی شے کی مثل نہیں تو ثابت ہوا کہ جو کچھ غرض اور مقصد سمیع و بصیر کا ہے اس
 کی کیفیت ہمارے ذہن میں آ سکتی ہے مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہماری طرح سمیع و بصیر
 ہے۔ معتزلہ جب یہ کہتے ہیں کہ ذات الہی مستزہ صفات ہے تو ان کا مدعا یہ ہے کہ اس
 کو انسانی صفات پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ جو کچھ وہ ہے وہاں تک ہمارے علم کی جو
 قلیل ہے رسائی نہیں۔

چنانچہ ارشاد قرآن ہے کہ :-

"خالق کل شیء فاعبدوا وادعوا علی کل شیء وکیل۔ لا تدبرکہ الا بصار و

ھوید ما ک الا بصار، وھو اللطیف الخبیر۔ (۱۶)

"ہر ایک شے کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کر۔ اور وہ ہر ایک شے پر وکیل ہے۔
 (انسانی) نظریں اس کا ورک نہیں کر سکتیں اور اسے نظروں کا ورک ہے۔ اور وہ لطیف
 اور خبیر ہے۔"

منزہ ذاتش از چند وچہ وچوں تعالیٰ شانہ عما یقولون

از ویر چہ بگفتند از کم و بیش

نشانے داوہ انداز ویدہ خویش

ان آیات میں ایک کیفیت پیدا کی گئی ہے کہ ہم باری تعالیٰ کی نسبت کچھ سمجھ

سکتیں ورنہ عارف رومی نے سچ کہا ہے کہ

"انچہ در اندیشہ نایدان خدا است"

تمام صوفی بزرگ معتزلہ ہی تھے۔

ارشاد قرآن ہے کہ "اللہ نور السموات والارض: یہ اسی کا نور ہے کہ اشیا اس کی روشنی میں نظر آ رہی ہیں بلکہ "ھویدرک البصار" ہماری نظروں میں بصارت اور دلوں میں بصیرت اسی نور کی پیدا کردہ ہے۔

ہم نے "غلات" کے فرقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے عقاید کا جائزہ لو تو "علیٰ عرش استوی" سے یہ عقیدہ اخذ کیا کہ اللہ ایک چہت سے محدود ہے اور عرش سے یہ چہت ملتی ہے۔ یہ عقاید ہیں جن کو معتزلہ مسترد کرتے ہیں اور حق بجانب ہیں۔ تشبیہ اور تمثیل سے باری تعالیٰ منزہ ہے۔ لیکن ہم اس کے بغیر سمجھ نہیں سکتے۔ اس لئے قرآن میں ہمیں سمجھانے کے لئے امثال بیان کی گئی ہیں۔ مگر کوئی مثل ایسی نہیں جس سے وہ اپنی ذات کو تعبیر کرتا ہو۔ اسما و صفات ہیں اور اس کی نفی کی گئی ہے کہ وہ انسانی اسما و صفات کی مثل ہیں۔

آج ذہنی ارتقا کے ساتھ جس طرح ہم ان مسائل کو سمجھ سکتے ہیں۔ آج سے ایک ہزار برس پہلے معتزلہ نہیں سمجھے۔ اس لئے وہ موزوں الفاظ میں اپنے تصور کو واضح نہ کر سکے اور ان کا تصور بھی دھندلا ہی تھا۔ اس لئے غلط فہمی کا موجب بھی ہوا۔ ہم اسے ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

ارشاد قرآن ہے کہ

وَمَا حَعَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ الْوَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِي حَاجِبٍ أَوْ يَرْسُلَ رَسُولًا
فِي وَحْيٍ بَازِنٍ، مَا يَشَاءُ، إِنَّهُ عَلِيمٌ وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ
قَدْرِي مَا الْعَشَبُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا
وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ، صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ
إِلَى اللَّهِ تَعْبِيرُكَ مَوْجِبٌ (۲۵)

"کسی بشر میں یہ تاب و طاقت نہیں کہ اللہ اس سے کلام فرمائے مگر (اس کی ایک سورت یہ ہے کہ زوحیا) اور دوسری یہ کہ پر وہ کی اوٹ یا (تیسری یہ ہے) کوئی رسول بھیج دیتا ہے تو وہ (عوام کو) وہی کچھ اللہ کے اذن سے وحی کرتا ہے (جو بلفظہ اسے ہوتی ہے)

تحقیق اللہ بلند مرتبہ حکمت والا ہے اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے امر سے ایک روح (کلام
 وحی) کیا تو نہ جانتا تھا کہ کتاب (فطرت) کیا ہے اور نہ ایمان سے واقف تھا لیکن ہم نے
 اسے نور بنایا ہے ہدایت کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں تحقیق تو
 البتہ ہدایت کرتا ہے سیدھی راہ کی طرف اس راہ کی طرف جو اللہ کی ہے جس کا ہے جو
 کچھ بھی آسمانوں اور جو کچھ بھی زمین میں ہے خبردار ہو کہ تمام امور کا رجوع اللہ ہی کی
 طرف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کلام حقیقت مجردہ ہے اور حرف و صوت سے منزہ ہے۔ ناممکن ہے
 کہ انسان کو حقیقت مجردہ کا احساس تک ہو جب تک وہ کسی صورت میں رونمانہ ہو
 اس کی دوہی صورتیں ہیں۔ ایک بصورت "وحی" اور دوسری "من وراء حجاب" تمام
 اشیا عمل زیر وحی کر رہی ہیں۔ وحی میں غلطی نہیں۔ اس لئے غلطی اشیا نہیں کرتی۔ شہد
 کی مکھی جو کچھ عمل کرتی ہے وہی لکھتی ہے۔ اس کو کسب و اکتساب کی ضرورت نہیں
 وہ سب کچھ فطرۃ کرتی ہے اور علی ہذا القیاس لیکن ماسوی انسان کوئی جاندار ترقی
 نہیں کرتا۔ انسان غلطی کرتا ہے مگر ترقی بھی کرتا ہے اس لئے ترقی کا راز اس کی غلطی
 مضمر ہے۔ اس لئے واجب ہے کہ انسان غلطی کرے اور اگر نہ کرے تو وہ انسان
 نہ ہوگا۔ اس لئے کوئی انسان بحیثیت انسان معصوم عن الخطا نہیں۔ انسان کو وہ
 بلفظ ہوگی۔ معانی مجردہ کا احساس ناممکن ہے۔ بے کسوت عبارت معانی کا اکتساب
 اس پر ممکن نہیں۔ انسانی قلب میں کوئی خیال بلا الفاظ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ الفاظ
 کیا ہیں، اشارات ہیں۔ اس لئے ہر ایک مہبط وحی کو اس کی قومی یا مادری زبان
 ہی میں وحی ہوگی جو کچھ دل میں ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ زبان ایک بے شعور آلہ
 ہے۔ وحی کا سرچشمہ صحیفہ کائنات ہے جو صحیح معنی میں کتاب ہے۔ لاریب فیہ
 قرآن اسی کا بیان اور اسی کی تفصیل ہے۔ "خطابیان للناس اور التفصیل
 العتب لادینا فیہ"۔ اس موضوع پر جو مستقل ہے ہم نے علیحدہ بحث کی ہے۔
 ارشاد قرآن ہے کہ "اقل ما ادھی الیک من الکتب" (پ) صحیفہ کائنات

میں جو کچھ محسوس ہو رہا ہے محض صورتیں ہیں۔ انہی صورتوں میں حقیقت چلوہ نما ہے۔

”حجاب“ یہی صورتیں ہیں اور من و عن ان کا نقش ہمارے قلب پر بالارادہ اور بلا ارادہ پڑتا ہے جو کچھ خارج میں ہے۔ وہی کچھ ہمارے قلب میں ہے ظاہری حواس سمع و بصر کا کام اتنا ہی ہے کہ ان صورتوں کے عکس یا ”نقل“ کو (لسان قرآن کے لفظوں میں) ہمارے آئینہ ذل پر لے آئیں۔ اس کے بعد قلب کی قوتوں کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اگر ہمارا قلب سلیم ہو اور کبار خانہ نہ ہو جیسا کہ عوام کا لانعام کا ہوتا ہے تو خواب یا رویا میں بھی ہم ان صورتوں کو اسی نظم و نظام میں مشاہدہ کریں گے جیسا کہ بیداری میں کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیداری میں ہم بلا ارادہ اور خواب یا رویا میں بلا ارادہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ بیداری میں تذکر و تدبیر و تفکر یعنی عقلاً کرتے ہیں اور خواب میں بلا ارادہ یہ حقائق آشیا ہواشیا کی صورتوں میں رونما ہوتے ہیں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور فطری زبان میں ہم سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ فطری زبان ہی تصویری زبان ہے۔ صحیفہ کائنات کتاب مصور ہے

و کائنات من آیات فی السموات والارض یمرّون علیہا وھما معضون
وما یؤمن اکثرھما باللہ الا وہما مشرکون (۳۱)

”اور (صحیفہ) کائنات سماوات والارض میں بے شمار آیات ہیں کہ (ان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور یہ ہیں کہ یونہی ان پر سے گزر جاتے ہیں اور متوجہ نہیں ہوتے۔ اور (اگر بے توجہی سے دیکھتے بھی ہیں تو) اکثر اللہ پر ایمان لاتے ہوئے بھی شرک کرتے ہیں۔“

جب ہم بلا ارادہ متوجہ نہیں ہوتے تو ایسی حالت میں جبکہ ظاہری حواس معطل ہوتے ہیں یہی صورتیں خواب میں رونما ہوتی ہیں اور ہمیں پھر اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ المختصر کلام اللہ ہم سے انہی دو صورتوں میں فرماتا ہے ایک وحیاً جس میں غلطی نہیں۔ دوسرے ”من وراء حجاب“ غلطی اس میں بھی نہیں۔ لیکن چونکہ اس کی تعبیر یا ”آویل“ (لسان قرآن کے لفظوں میں) ہم عقلاً کرتے ہیں۔ ہم غلطی بھی کرتے ہیں۔

تاویل اس مناسبت مشاہدہ ہے۔ جو اشیاء کی صورتوں کو حقائق اشیاء کے ساتھ ہے۔ اس مناسبت میں زمان و مکان کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اور صاحب رویا کے طبعی رجحان وغیرہ کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ مثلاً آنحضرتؐ نے خواب میں دیکھا کہ مکہ معظمہ میں اصحاب کے ساتھ امن کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں اور اطمینان کے ساتھ مناسک حج ادا کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ کو یقین تھا کہ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا چنانچہ اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑے مگر جب "حدیبیہ" پر آئے تو کفار مکہ کو سامنے صفا آرا دیکھا۔ اگر آنحضرتؐ مقابلہ پر آتے اور کفار کو شکست بھی ہوتی۔ خواب کی تفسیر صحیح نہ ہوتی، کیونکہ خواب میں دکھایا گیا تھا کہ آپ امن کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی "مکہ" جاتے امن ہے اور یہاں جنگ و جدل ممنوع ہے۔ آنحضرتؐ فوراً سمجھ گئے کہ رویا کے پورا ہونے کا یہ مناسب وقت نہ تھا۔

"لقد صدق الله رسوله المرء اذا لم يلق الله خلق المسجد الحرام ان شاء الله امنين مخلصين ربه وسكرو مقسمين لا تخافون فعلما ما لم تعلموا فجعل من دون ذلك فتحا قديرا" (۲۶)

"تحقیق اللہ نے اپنے رسول کا سچا خواب سچ ہی دکھایا کہ تم ضرور مسجد حرام میں اللہ کی مشیت کے تحت امن سے داخل ہو گے۔ اپنے سر کے بالوں کو منڈواتے اور کتراتے بلا خوف و خطر پس اللہ کو تو معلوم تھا جو تم نہیں جانتے تھے، یہ کہ (اس رویا کی تفسیر اس کے علاوہ فتح مکہ نزدیک تر ہے۔"

مکہ میں امن کے ساتھ داخلہ اور مناسک حج بلا خوف ادا کرنا اسی صورت میں ممکن تھا کہ مکہ فتح ہو جانا اور فتح بلا جنگ و جدل ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خواب کی تفسیر فتح مکہ تھی۔ غور کرنا چاہیے کہ آنحضرتؐ کو بھی "تاویل" میں غلطی ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے روایا میں دیکھا تو تاویل میں غلطی کی۔ تاویل یہ تھی کہ بیٹے کو داد وغیر ذی زرع میں لسانا ہے۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی۔ اسی طرح اہل علم و حکمت جب تذکر و تفکر سے کام لیتے ہیں۔ انہی اشیاء کائنات کی صورتوں میں حقائق

کی تلاش کرتے ہیں تو اکثر غلطی بھی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کلام تو ہر ایک شے سے فرماتا ہے۔ جہاں تک عالم انسانی کا تعلق ہے کلام وحی یا من وراء حجاب ایک ہی شخص سے فرماتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں تمام علمی اکتشافات ہر ایک زمانہ میں فرداً فرداً ایک ہی شخص پر ہوتے ہیں۔ اگر محض عقلاً ہوتے تو ہر ایک اہل عقل پر ہوتے۔ "نیوٹن" اپنے زمانہ میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا کہ عقل میں اس کا مقام سب سے ارفع و اعلیٰ تھا۔ مگر ایک آیت کی طرف اس کی توجہ ہوئی جو ہر ایک زمانہ میں ہر ایک جگہ واقع ہوتی رہتی ہے۔ مگر کسی کی توجہ اس طرف کبھی نہ ہوئی۔ اس نے مسئلہ کشش ثقل دریافت کر لیا۔ کشش ثقل اس کی شخصیت سے بے نیاز ہے۔ وہ پیدا نہ ہوا تھا کہ اس کا عمل آفرینش سے جاری ہے۔ مگر یہ تو دل سے ہی سرگرم عمل ہے اسی علمی اکتشاف کا فائدہ سب کو یکساں ہے جو بھی اٹھانا چاہے۔ کچھ نیوٹن کے لئے خاص نہیں۔ اسی طرح دین اللہ بھی رسولوں اور انبیاء کی شخصیت سے بے نیاز ہے۔ اس کا اکتشاف ان پر ہوا۔ انہوں نے بخل سے کام نہیں لیا۔ اس کا فائدہ ہر ایک شخص اٹھا سکتا ہے۔ جو منکر ہو خواہ میں رہے گا۔ دین کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

ہم نے یہ مثالیں اس لئے پیش کی ہیں کہ معتزلہ کے عقاید سمجھنے میں غلط فہمی نہ ہو معتزلہ نے "کلام" کو بلیغ عبارت میں اس لئے ادا نہ کیا کہ اس کی حقیقت کا تصور ان کے ذہن میں بھی صاف صاف میسر نہ تھا۔ اور غلط فہمی سے ایسی الجھنیں پیدا کر دیں کہ جب یہ عقیدہ کہ قرآن مخلوق ہے حکومت وقت کا راج و دھرم ہو گیا تو کسی ناکر وہ گناہ جو اس عقیدہ کے مخالف تھے مصائب میں مبتلا ہو گئے۔ امام احمد حنبل سے کسی شخصیت بھی نہ بچ سکی۔

معتزلہ کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید عقلاً معلوم ہو سکتی ہے۔ اس لئے "وحی" کے بغیر بھی اہل عقل و حکمت توحید پر ایمان لاسکتے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی غلط فہمی کا موجب ہوا۔ اور مخالفین نے یہ سمجھا کہ معتزلہ سرے سے "وحی" کے منکر ہیں۔ چونکہ معتزلہ کو

حقیقت وحی کا علم نہ تھا۔ اس میں بعض فرقوں نے اتنا غلو کیا کہ وحی کی ضرورت سے انکار کر دیا۔

ہم نے "وحی پر علیحدہ بحث کی ہے۔ یہ ایک مستقل اہم موضوع ہے۔ چند اشارات بطور تذکرہ میں لکھ چکے ہیں جو فہم و تفہیم کے لئے سروسٹ ہمارے لئے جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے کافی ہیں۔ یہ "وحی" ہی ہے جس سے تمام نظام عالم قائم ہے۔ عالم انسانی تو صرف کرہ ارض کے ایک حصہ پر آباد ہے اور کرہ ارض نظام شمسی میں ایک ذرہ ہے۔ تمام کائنات کے مقابلہ میں اس کی کیا حقیقت ہے۔ معتزلہ کا یہ دعویٰ کہ عقلاً توحید پر بغیر وحی اہل عقل کا اتفاق ہے یا ہو سکتا ہے۔ صریحاً غلط ہے۔ کسی زمانہ میں علماء و حکماء کا کسی نظریہ پر کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اور اکثر اہل عقل مادی کائنات ہی کو قدیم اور قائم بالذات سمجھتے رہے۔ معتزلہ کی عقل شاید انوکھی تھی کہ ان کا اتفاق عقلاً توحید پر ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آیات قرآن اس امر کی تائید میں ہیں کہ توحید پر اہل علم کی شہادت بھی ہے۔

"شہد انہ انہ لا اله الا هو الملک والوالعلماء قائماً بالقسط"

الہ الا هو العزیز الحکیم (۳)

"اللہ نے گواہی دی کہ نہیں کوئی معبود مگر وہی اور ملائکہ اور علم والوں نے جو قسط

پر قائم ہیں گواہی دی کہ نہیں کوئی اللہ مگر وہی اللہ جو غالب حکمت والا ہے"

اس آیت میں اہل علم کے ساتھ "قسط" کی شرط ہے "قسط" اور "عدل" میں یہ

فرق ہے کہ "عدل" تو وہ "میزان" ہے جو کائنات میں اللہ تعالیٰ نے وضع فرمائی ہے۔

(والسما و وضع المیزان) اسی نے اس عالم اضداد و اختلاف میں توازن قائم رکھا

ہے۔ انسان ایسا عدل خود اپنے وجود میں بھی قائم نہیں رکھ سکتا اگر کوشش کرے تو "قسط" قائم

رکھ سکتا ہے۔ اہل علم جو قائم بالقسط ہیں۔ متنازع، آرزوؤں اور نفسانی خواہشات سے الگ ہو

کر جو کچھ نہ کہ انہار سے مشاہدہ کریں گے وہ بلاشبہ توحید پر شہادت دیں گے۔ لیکن ایسی حالت

تو شاذ ہی ہوتی ہے۔ انبیاء اور رسل جو آنسرت سے پیشتر گزرے تباہوں سے خالی نہ تھے

ارشاد قرآن ہے کہ:۔

”وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبي الا اذا تمشى الفى الشيطان

فى امنيته - (۱۱/۱۱)

”اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی بھیجا کہ اس نے آرزو کی ہو اور شیطان نے اس آرزو میں القانہ کیا ہو۔“

ہم واضح کر چکے ہیں کہ محض عقلاً کوئی نظریہ ایسا نہیں کہ جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو بہر حال اگر اہل علم خالی الذہن ہو کر کائنات کا مشاہدہ کریں اور اس کی تخلیق اور اختلاف میل و نہما رہی تذکر و تفکر سے کام لیں تو ان پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات باطل نہیں قرآن میں نسب سے مقدم شہادت اللہ کی ہے۔ اللہ اپنی توحید اور الوہیت پر شہادت انہی آیات کائنات میں دے رہا ہے۔ اور ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک وحیاً اور دوسری ”من وراء حجاب“ اور یہ کہ وحی کے فہم میں غلطی نہیں مگر من وراء حجاب کے فہم میں غلطی کا احتمال ہے۔

قرآن میں اور آیات بھی ہیں جن سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ اہل علم شہادت توحید پر دیتے ہیں۔

”یلخصوا ایٹ بیئت فی ضد لالذین اونوا العلم (۱۱/۱۱)“

بلکہ وہ آیات جن کو علم دیا گیا ہے۔ ان کے سینہ میں ہیں۔

لیکن سوال ”علم“ کا ہے کہ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ وحیاً یا من وراء حجاب“ لیکن وحی کی شہادت مقدم اور قطعی ہے جس میں غلطی نہیں۔

معرکتہ الآراء مسئلہ جس پر معتزلہ نے اپنی قوت استدلال صرف کی لہجہ و شریا فزرد جبر کا ہے۔ واصل بن عطا کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم اور عادل ہے۔ اس لئے اس کے عدل کے تقاضا کے خلاف ہے کہ ظلم و شر کو اس سے منسوب کیا جائے اور نہ ایسے ارادہ کو منسوب کیا جاسکتا ہے کہ اپنے بندوں سے وہ بات چاہے جو اس کے امر و حکم کے مخالف ہو اور پھر ان کو جزا بھی دے۔ لاجرم فاعل خیر و شر و کفر و ایمان و طاعت و معصیت بندوں کا فعل اختیاری ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی جزا و سزا انہی کے مناسب

✓ دیتا ہے اور دے گا۔ شہرستانی لکھتا ہے کہ

✓ میں نے ایک رسالہ پڑھا ہے جو خواجہ حسن بصری سے منسوب ہے۔

عبد الملک مردان نے ایک مکتوب آپ کو لکھا اور سوال مسئلہ قدر کے بارہ

میں کیا۔ اس میں جواب مذہب قدریہ کے عقاید کے مطابق دیا گیا ہے۔

اس رسالہ میں آیات قرآن اور استدلال عقلیہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔

✓ شہرستانی کی یہ رائے ہے کہ قدریہ معتزلہ کا مذہب ہے اس لئے جواب مکتوب اصل بن

عطا کا معلوم ہوتا ہے۔ اور اصل شاگرد خواجہ حسن بصری کا تھا۔ ایسے ہی عقاید پر اصل

سے علیحدگی (اعتزال) اختیار کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ جبر و اختیار یا قدر مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں عرصہ

تک زیر بحث رہا۔ اور جبریہ اور قدریہ فرقے بھی دست درگریہ رہے۔ معتزلہ قدریہ

ہیں۔ ان کا عقیدہ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔ یہ ہے کہ خیر و شر وغیرہ بندوں سے منسوب

ہے۔ اور اگر اللہ سے منسوب کیا جائے تو انسان پر منجانب اللہ جبر عائد ہوتا ہے جب

کسی سے ایک عمل جبراً کرایا جائے۔ پھر اس کو اسی عمل کی سزا یا جزا دی جائے۔ اللہ

تعالیٰ کے عدل کے خلاف ظلم ہوگا۔ اور نص قرآن سے ثابت شدہ ہے کہ اللہ عادل

ہے ظالم نہیں اور یہ کہ انسان ہی خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ یہ بھی نص قرآن سے

ثابت شدہ ہے کہ

”ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سيئة فمن

نفسك“ (۵)

”جو بھلائی تجھے پہنچتی ہے وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے

وہ تیرے نفس سے ہے۔“

معتزلہ کا یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے خیر ہی کا ارادہ فرماتا ہے

صحیح ہے۔ لیکن معتزلہ اور ان کے مخالف اشعریہ دونوں نہ سمجھ سکے کہ اصل حقیقت

کیا ہے؟ اگر انسان صاحب اختیار ہے تو خیر و شر اسی سے منسوب ہوگا اور اگر مجبور ہے

تو دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں جو قدریہ اور جبریہ کہتے ہیں خبر کی ضد شر، حسد، کی ضد سینہ، جبر کی ضد اختیار ہے۔ ایک کی تصدیق دوسرے کے تصور کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور یہ بالبداهت ثابت شدہ حقیقت ہے کہ خیر و شر دونوں موجود ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک شے کا خالق ہے اس لئے خالق خیر و شر بھی ہے۔ لیکن یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ چونکہ وہ خالق و خیر و شر ہے اس لئے اپنے بندوں کو مجبور کرتا ہے کہ ایسا عمل کریں کہ شر میں مبتلا ہوں۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا میں نہ کوئی شے خالص اچھی اور نہ خالص بری ہے۔ ہر ایک شے میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ آگ کا خاصہ ہے جلانا۔ اسے نباتات اور حیوانات بھی فطرۃً جانتے ہیں۔ نباتات اور حیوانات ایسی شے سے جو ان کی زندگی کے لئے مضر اور مہلک ہے دور اور نفور رہتے ہیں۔ انسان بھی جانتا ہے کہ آگ نہایت مفید شے ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ ارادۃ یا بلا ارادہ بوجہ غفلت۔

چو یک دم اندراں رفت بسوزد

انسان اس سے مفید کام بھی لے سکتا ہے اور اپنا یا کسی دشمن کا گھر بھی جلا سکتا ہے اس سے خیر یا شر کسب کرنا اس کا اپنا اختیار ہے۔ اگر وہ خیر کسب کرتا ہے تو یہ فطرۃً پسندیدہ امر ہے اور اگر شر کسب کرتا ہے تو مذموم ہے۔ اور تقاضائے عقل بھی یہی ہے کہ انسان خیر ہی کسب کرے۔ یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے میں شر کی قابلیت ہی کیوں رکھی، نہ ہوتی نہ انسان کسب کرتا جہالت ہے۔ یہ ایسا ہی سوال ہے کہ اللہ نے انسان کو کیوں خلق کیا نہ ہوتا نہ شر کسب کرتا۔ غرض ہر ایک شے میں دونوں امکانات موجود ہیں!

انا ہدیۃ السبیل اما شاکر اوما کفوراً (۲۹)

ہم نے اس کو راستہ بتا دیا یا شکر گزار ہوتا ہے یا کفر کرتا ہے

اللہ تعالیٰ نے کچھ تو فطرۃً اور کچھ عقلاً انسان کو خیر و شر سے آگاہ کر دیا ہے یہ اس کا اختیار ہے کہ خیر کسب کرتے ہوئے شکر کرے کہ اللہ کی نعمت ہے اور اگر شر کسب کرتا ہے تو

اس کا وبال بھی اس پر پڑتا ہے کہ اس نے خود شراپے لئے پسند کیا۔ اس کو اپنے اعمال کی جزا و سزا بھی اسی خیر و شر میں مل جاتی ہے جو وہ کسب کرتا ہے۔ اللہ کے ہاں جبری ایمان و عمل قابل قبول نہیں اور عقلاً ہونا بھی نہ چاہیے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قَدْ تَبَيَّنَ الرِّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۱۳۱)

دین میں کوئی (جیزو) اکراہ نہیں۔ تحقیق ہدایت و گمراہی میں نمایاں امتیاز ہو چکا ہے (اور انسان علی نفسہ بصیرہ ہے)

اللہ تعالیٰ خالق خیر و شر ہے لیکن وہ اپنے بندوں کے لئے پسند فرماتا ہے کہ ارادہ خیر ہی کسب کریں اور شکر کریں۔ اگر وہ خود شر کسب کریں تو جو شر کا خاصہ ہے اس کا عمل تو ہو کر رہے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے کہ اگر بوجہ جہالت یا غفلت بلکہ ارادہ شر کسب کریں تو باز گشت کی توفیق وہی دیتا ہے اور بگڑی بنانے والا کار ساز بھی وہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نور و ظلمت کا خالق ہے لیکن پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے نور میں داخل ہوں۔ یہ ایسی سیدھی سادی باتیں ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ ان قدر یوں اور جبریوں پر کیا وحشت سوار تھی کہ اس میں موشگافی کرتے ہوتے ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتویٰ صادر کرتے رہے۔ ملاحظہ کیجئے ان کے مسائل موضوعات و جوابان کی گرما گرم بحث کا موضوع تھے:-

۱۔ اگر انسان کسی حادثہ سے مر جائے تو کیا وہ "اجل مسمیٰ" ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر اتنی ہی مقرر کی تھی اور یہ مقدمہ ہو چکا تھا کہ وہ حادثہ سے اپنے وقت مقررہ پر مر جائے گا۔

۲۔ حیوانات کا حشر کیسے ہوگا کیا ان کو بھی اس کا اجر ملے گا۔ جو ان کو کسی حیوان انسان سے مصیبت پہنچتی ہے۔

۳۔ کیا موذی حیوانات جہنم میں جائیں گے۔

۴۔ کیا اللہ انسان کو ایسی بات کا مکلف بناتا ہے جو اس کا نفس برداشت نہیں کر سکتا۔

۵۔ کیا حرام اشیاء رزق کا حصہ ہیں جو اللہ انسان کے لئے پیدا کرتا ہے۔

۶۔ معراج جسمانی تھا یا روحانی

۷۔ معجزات جو انبیاء سے منسوب ہیں اس کا کوئی ثبوت عقلاً یا خبریں صحیحہ پر

مبنی ہے؟

۸۔ کیا روستہ حق تعالیٰ اس دنیا یا آخرت میں ممکن ہے؟

یہ اور اسی قبیل کے سوالات خود ہی پیدا کئے اور خود ہی ان کو وہ اہمیت دی کہ ایک ہنگامہ برپا ہوتا رہا اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض امور ایسے ہیں کہ اہل علم و حکمت کو تحقیق کی دعوت دیتے ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں کہ کسی مخالف یا موافق کو اگر تسلیم کرے یا نہ کرے کافر کہا جائے۔

ان سوالات میں سے پہلے سوال کا تعلق مسئلہ "تقدیر" سے ہے۔ ایک فریق بالخصوص اشعریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں ہر ایک شخص کے مفصل حالات جو بھی اسے زندگی اور بعد ممات پیش آئیں گے۔ قلم سے لکھ دئے ہیں۔ معتزلہ تسلیم نہیں کرتے۔

قرآن حکیم میں لفظ "قدر" اندازہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے مسئلہ تقدیر | یہ قانون فطرت ہے اور تمام کائنات میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ اشیاء

کی تخلیق ان کی شکل و صورت اور خواص سب اسی قانون "قدر" کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ مثلاً یہ علم کیمیا کا موضوع ہے کہ کسی شے کے اجزاء میں خاص تناسب ہوتا ہے اگر اسی تناسب سے یہ اجزاء ہم بھی ترکیب دیں تو یہی شے بن جائے گی۔

ہماری زندگی کے لئے ہوا ضروری ہے۔ اگرچہ ہوا کا کرہ موجود ہے مگر ہم کو بقدر ایک سانس کے ہی بیک وقت ملتا ہے۔ یہ اندازہ انسان خود مقرر نہیں کرتا فطرت کا مقرر کردہ ہے۔ اگر اندازہ سے زیادہ یا کم ہوا ملے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس لئے زندگی کا فطری مقرر کردہ اندازہ ہی صحیح ہے

پانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اس کا ناختم ہونے والا خزانہ موجود ہے مگر

ہم بقدر پیاس ہی پیتے ہیں، اس کا اندازہ خود انسان مقرر کرتا ہے اور کبھی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جتنا بھی کرتا ہے کافی ہے اور زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے۔ اگر زیادہ پانی پی لے تو پیٹ اچھر جاتے۔ آیات قرآن سے تو اتنا ہی واضح ہوتا ہے کہ "تقدیر" کا یہی کچھ مفہوم ہے۔

حسب ذیل آیات میں تدبیر کرنا چاہیے:-

(۱) "وَحَلَّ شَيْءٌ عِنْدَ مَقْدَارٍ عَلِيمٍ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرِ الْمُتَعَالِ" (الرعدہ - ۱۳)

"اور ہر ایک شے کا اندازہ اس کے پاس ہے۔ غیب اور ظاہر کا عالم بڑا بلند ہے۔"

(۲) "وَأَنَّ مِنْ شَيْءٍ عِنْدَنَا خِزْيَانًا مَّا لَمْ يَلْمِذًا لِمَا لَا يَلْمِذًا مَعْلُومًا" (البحر - ۱۲)

"اور کوئی شے نہیں جس کے (نہ ختم ہونے والے) خزانے ہمارے پاس نہیں اور ہم اندازہ ہی سے اسے نازل کرتے ہیں۔"

(۳) "أَنَّ اللَّهَ بَالِغٌ أَمْرٍ قَدْ جَعَلِ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا" (الطارق - ۲۸)

"تحقیق اللہ اپنے امر کو پورا کرتا ہے۔ تحقیق اللہ نے ہر شے کا اندازہ ربہ تعلق زمان و مکان، مقرر کر رکھا ہے۔"

(۴) "وَجَلَّ حَلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا" (المفرقان - ۱۸)

"ہر ایک شے کو پیدا کیا۔ پس اس کا اندازہ ٹھیک مقرر کیا۔"

آیات بہت ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسی "قانون تقدیر" کے تحت ہر ایک شے پیدا ہوتی اور بتدریج "وقت مقررہ" پر ارتقائی منازل طے کرتی رہتی ہے اور "خلق جدید" میں "تغیرات امثال" کے بعد دوبارہ ہوتی ہے۔ موت و حیات دونوں اسی قانون کے تحت خلق ہوتے۔ جو دراصل "تجدد امثال" کی صورتیں ہیں اور یہ ارتقائی سلسلہ لاتنا ہی جاری ہے اور جاری رہے گا۔ اسی مرتبہ المنتہی —

وَاللَّهُ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (السجده - ۲۴، البقرہ - ۲۳، الانعام - ۱۸)

قرآن عظیم کتاب علوم نہیں لیکن اصول علوم ہے۔ اور ان آیات میں کتنے علوم کی طرف رہنمائی فرماتا ہے۔ انسانی علوم کبھی کامل نہیں ہوتے۔ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ان میں ارتقاء ہے۔ رب زدنی علما۔ تعجب ہے کہ معتزلہ اور اشعریہ کن مسائل میں الجھے ہوئے تھے لیکن یہ بھی "تقدیر" کا کرشمہ ہے۔ ذہن انسانی ابتدا میں یہی کچھ تصور کرتا ہے۔ بتدریج اصل حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اور جو کچھ عقاید پختہ کئے ہوئے ہیں۔ آئندہ نسلیں اس پر اسی طرح مضحکہ اڑائیں گی جس طرح آج ہم متقدمین کی باتوں کا اثر اسے ہیں۔ کتنا بلند ذہن اس وقت ہو گا جب

"یوما یجعل الولدان شیبیا، اسما منقطر بہ، کان وعدہ مفعولا،

ان حصہ تذکرہ، فن شامہ اتخذ الی ربہ سبیلہ" (۲۹)

"اس دن طفل (مکتب) بڑھے بوڑھوں کی طرح (باتیں کرتے ہوں گے آسمان کے پوست کندہ حالات اس (ذہنی ارتقاء) کے ساتھ منکشف ہو جائیں گے یہ وقت بھی آکر رہے گا یہ یاد دہانی ہے تو جو جیسا ہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کر لے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور ہم نے اپنے مقالات میں بحث علیحدہ کی ہے۔ ہر دور ہر معتزلہ کے عقائد کا جائزہ لیتے ہیں۔ تقاضہ انصاف ہے کہ ہم داد دیں کہ آئندہ نسلوں کے لئے آزادی فکر کا راستہ کھول دیا۔ معتزلہ اپنے آپ کو "اہل توحید و عدل" کہتے۔ مخالف ان کو معتزلہ۔ ہمیشہ مخالفت کا تجویز کردہ نام ہی مشہور ہوتا ہے۔

اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ ہر ایک شے کی عمر طبعی مقررہ ہے۔ اس کے بعد اہل بھی ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض انسان بچے، لڑکے، جوان عمر طبعی تک نہیں پہنچتے۔ وبائی امراض یا بعض حادثات کی وجہ سے پیش از وقت مر جاتے ہیں۔ اور اس کا بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ اگر امراض کا سدباب کیا جائے یا مناسب علاج ہو اور حادثات کی روک تھام کی جائے۔ تو انسان طبعی عمر تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے ہر ایک دور کی دوا اور ہر ایک حادثہ کے سدباب کے اسباب بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ انسان کا اختیار ہے کہ ان سے کام لے۔ اگر انسان عقل و فکر سے

کام لے تو جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں بہت کچھ شر کا سبب بنا کر سکتا ہے جن کا امکان اشیاء میں موجود ہے۔ اگر قوانین حفظانِ صحت پر عمل کرے تو صحت بھی قائم رکھ سکتا ہے اگر کہیں اتفاقاً آگ لگ جائے تو بجھا سکتا ہے۔ بلکہ ایسا سبب بنا کر سکتا ہے کہ آگ ہی نہ لگے۔ ہر ایک بیماری کا علاج ہے اگر تشخیص صحیح ہو کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔

منشاءِ فطرت ہے کہ انسان عقلِ خداوند سے کام لے اور قوانینِ فطرت کا اسے علم ہو۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں شام میں طاعون پھیل گیا جو طاعونِ عمواس کے نام سے مشہور ہے۔ ابو عبد اللہ بن الجراح سپہ سالارِ فوجِ شام بہت بلند پایہ صحابی تھے۔ غالباً حضرت عمرؓ کے بعد ہی خلیفہ ہوتے اگر زندہ رہتے۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو مدینہ میں طلب کیا۔ مجھ گئے۔ اس خیال سے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ مجھے قضاۃ الہی سے بھاگنے والا اللہ کے حضور ٹھہرایا جائے، نہ گئے۔ اور طاعون کا شکار ہو گئے۔ شام میں عمرو بن العاص بھی موجود تھا اس نے مشورہ دیا کہ طاعون زدہ علاقہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا چاہیے۔ شریحیل بن حسنہ ایک اور بڑے پائے کے صحابی بھی وہاں تھے کہنے لگے کہ

”جب میں رسولِ کریمؐ پر ایمان لایا تو اپنے گھر کے گدھے سے بھی زیادہ

جاہل تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ ایسی وہابی متعدی بیماری کو

دوسری جگہ نہ پھیلاؤ۔ اس لئے میں تو یہاں سے نہ نکلوں گا۔“

اگر صحابہ طاعون کی نذر ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو سخت رنج ہوا اور فرمایا کہ

”امراض سے بچنا چاہیے۔ یہ قضا سے فرار نہیں بلکہ ایک تقدیر کے ضرر

سے بچنے کے لئے ہم دوسری تقدیرِ الہی کی پناہ میں جاتے ہیں۔“

اس کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اگر کہیں آگ

لگ جائے تو یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ اسے اپنا عمل جاری رکھنے دیا جائے اس

لئے کہ اسے بجھانا قضا و قدر کا مقابلہ کرنا ہے۔ تقاضائے عقل یہی ہے کہ اسے بجھا

دیجاتے اور ان اسباب سے بچھایا جاتے جو تقدیر ہی کے پیدا کردہ ہیں۔
 چونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر ایک شے کا علم ہے۔ اس کا علم ہر ایک پر وسیع و محیط
 ہے۔ وہ تمام واقعات کو خواہ اس کا تعلق کسی زمانہ سے ہو، جانتا ہے اور کوئی شے
 چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ یہ سب قرآنی
 خصوصیات ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اس لئے معتزلہ کے عقیدہ کے خلاف فرقہ
 اشعریہ کا ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ہر ایک انسانی فعل اللہ
 تعالیٰ کی مشیت کے مطابق سرزد ہوتا ہے۔ بظاہر و قیچ ہے۔ لیکن اس سے اس
 اختیار کی نفی نہیں ہوتی۔ جو قانون تقدیر کے تحت انسان کو حاصل ہے۔ دونوں
 فریق اپنے اپنے نقطہ نظر سے صحیح استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ تصویر کو "نیم رخ" ہی
 دیکھتے ہیں۔ اگر "مستقبل" دیکھتے تو ایک دوسرے کا انکار نہ کرتا۔

یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ ذات باری تعالیٰ ایک تو
 "غنی عن العالمین" ہے۔ معتزلہ اس کو اس حیثیت سے اپنی بحث کا موضوع
 بناتے ہیں۔ دوسرے بہ تعلق کائنات اسماء صفات سے مشغول ہے۔ اشعریہ اور
 دوسرے فرقے اسی حیثیت سے بحث کرتے ہیں ہر ایک کی تحقیق تا حد نظر ہے۔

ہر کس میں جا از مقام و حال خود گوید خبر
 از زبانی حرف او گزشتنوی با در ممکن : (بیدل)

ہر ایک محقق کی تحقیق اس کی اپنی حد نظر ہے۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے اپنے
 مقام اور حال کی خبر دیتا ہے۔ ایک شخص درخت کے سایہ کو خاک پر دیکھتا ہے اور
 کہتا ہے کہ سیاہ ہے۔ دوسرا پانی میں تمثال دیکھتا ہے۔ درخت سایہ اور خاک اور
 پانی سے الگ اور باہر ہے۔ وہ درخت کو نہ دیکھتا ہے اور اس کی بصیرت سے
 درک کر سکتی ہے۔ وہ اپنی ہی نظر اور حد نظر کی رسائی کی خبر دیتا ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی کہتے ہیں کہ

"ہر ایک شخص نے اپنے اپنے عقیدہ میں ذات باری کو محدود بنا رکھا"

عارف وہ ہے جو ہر ایک عقیدہ میں دیکھے اور نہ اپنے اور نہ کسی اور عقیدہ میں محدود کرے۔

آنچہ اندیشی نیست۔ "ما عرفناک حق معرفتک" قول عارف کامل کا ہے۔
 زمان و مکان اور حوادث و واقعات و حالات غرض جو کچھ بھی ہے کائنات سے باہر نہیں اور نہ باہر متصور ہو سکتے ہیں۔ ہم ہر ایک شے اور ہر ایک حادثہ کو خاص خاص مکان و زمان میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں تمام کائنات غیب شہادت واقعہ واعدہ ہے۔

ہم واقعات کو دیکھتے ہیں اور ہر ایک سلسلہ میں ماضی و حال و مستقبل اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک کڑی کڑی "حال" ہی حال ہے۔ ماضی معدوم مستقبل موبہوم، حال ہی معلوم ہے بحیثیت وان صحیح پیشگوئی دربارہ کسوف و خسوف کرتے ہیں۔ زمانہ ماضی میں ہی واقعہ کسوف خسوف جو بے شمار دفعہ گزر چکا ہے۔ بحیثیت وان اس کے صحیح اوقات بتا دیں گے۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے ہر ایک زمانہ میں کسوف و خسوف بحیثیت واقعہ واحدہ دیکھتے ہیں۔ یہ واقعہ خواہ ماضی سے یا مستقبل کے متعلق ہو، علم میں حال ہے۔

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے یہی اشارات کافی ہیں۔ معتزلہ کے بھی کئی فرقے ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں بلند پایہ معتزلی گزرے ہیں۔ بصرہ اور بغداد ان ایام میں علم و حکمت کے مرکز تھے۔ بغداد و اہل خلافت عباسیہ تھا۔ یہاں عباسی خلیفہ مامون نے ان کی بہت کچھ حوصلہ افزائی کی۔

شہرستانی لکھتا ہے کہ

"فلسفی یہ کہتے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ ہر ایک جہت سے واحد ہے اور کسی وجہ سے کثرت اس میں متصور نہیں ہو سکتی۔ ذات پر کوئی امر زاید نہیں۔ اس لئے صفات سے انکار کر دیا۔"

معتزلہ فرقہ و اصل یہ نے یہ عقیدہ انہی سے لیا۔ لیکن ابوالمنذیل محمد بن ابوالمنذیل العلاف

صفات کا قائل ہے لیکن صفات عین ذات قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر صفات وجود ذات خیال کئے جاتے تو یہ مذہب نصاریٰ کا ہے جو "اقانیم" ثلاثہ کے قائل ہیں۔

ہدایہ | ابو الہذیل ایک واسطے سے واسطہ بن عطا کا شاگرد ہے۔ خلیفہ عباسی مامون الرشید کی مجالس مناظرہ میں اکثر موجود رہتا۔ جوانی میں اکثر یہود و نصاریٰ سے بھی مناظرہ کرتا رہا۔ ان ایام میں عام مذہبی آزادی تھی۔ البتہ اتنا لحاظ ہر ایک فریق کو ہوتا کہ کوئی ناشائستہ کلمہ کسی کے حق میں نہ کہے۔ مگر مسلمانوں کو کھسلی چھٹی تھی کہ ایک نہ تو دوسرے کے حق میں جو جی میں آئے کہے۔

ابو الہذیل کا مناظرہ ایک یہودی سے ہوا۔ یہودی نے پوچھا کہ "موسیٰ اور توراہ کے بارہ میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟"

ابو الہذیل نے کہا کہ موسیٰ سے تمہاری مراد وہی موسیٰ ہے جس کا مذکور قرآن میں ہے اور توراہ وہی ہے جس کا بیان قرآن میں ہے تو میں مانتا ہوں کہ موسیٰ رسول اور نبی تھا اور توراہ الہامی کتاب ہے۔

کسی نے سوال کیا کہ کائنات کو مخلوق ثابت کر دو مگر حرکت و سکون کو بحث میں نہ لاؤ۔ جواب دیا تمہارا حال تو اس مدعی کا ہے جو مدعا علیہ کو کہتا ہے کہ چلو فاضی کے پاس لیکن شہادت پیش نہ کرنا۔

ایک شخص نے اسے کہا کہ اگر تیرا مناظرہ "النظام سے ہو اور تو غالب آئے تو یہی بہتر ہے کہ تم دونوں کے دلائل مشکوک قرار دئے جائیں۔

ابو الہذیل نے جواب دیا کہ پچاس شکوک ایک یقینی بات سے بہتر ہے۔ یہی بغداد کسی نے پوچھا کہ بناؤ نیند کی راحت کا احساس کس وقت ہوتا ہے مذہب میں تو ممکن نہیں کیونکہ سو اس معطل ہوتے ہیں اور اس کا شعور نہیں ہونی تعالیٰ آیات پہلے بیداری میں بھی ممکن نہیں کیونکہ اس وقت خواب کا وجود ہی لایا نکل و نیک و بد نیند کے بعد نہیں کیونکہ اس وقت نیند ختم ہو جاتی ہے۔

ابو الہذیل سے کچھ جواب بن آیا۔

ابو ہذیل کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان خواہ بستر پر مرے یا کسی حادثہ سے۔ ابتدائی عمر میں فوت ہو یا اذیل میں۔ وقت مقررہ پر ہی مرتا ہے ایک ساعت اُس کے پیچھے نہیں ہوتی۔ عمل تو اس دنیا میں ہے۔ آخرت میں اعمال نہ ہوں گے۔

کسی نے اس پر پھٹی جمانی کہ ابو ہذیل اس دنیا میں قدر یہ ہے اور آخرت میں جبریہ۔

ابو ہذیل یہ دلیل پیش کرتا کہ ہر ایک شے کا آغاز اور انجام ہے، انسانی عمل باہمہ اختلاف آغاز و انجام کا تقاضہ کرتے ہیں اس لئے آخرت میں کوئی صورت اعمال کی نہیں۔ ایک حالت سکون و راحت ہوگی۔ اس پر کسی نے سوال کیا کہ بتاؤ نیند کا سکون و راحت کس وقت محسوس ہوتا ہے؟

نظامیہ | شہرستانی نے ابو الہذیل کے عقاید مفصل بیان کئے ہیں۔ اس کا حریف ابراہیم بن سیار نظام تھا۔ دونوں معتزلہ تھے مگر بعض باتوں میں اختلاف تھا۔ کتب فلاسفہ کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اور معتزلہ کے عقائد میں فلسفہ کو مخلوط کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خیر تو تقدیری ہے مگر شر ہماری طرف سے ہے۔ اللہ تو حق ہے۔ اس لئے باطل جو حق کی ضد ہے پیدا نہیں فرماتا۔ عموماً معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ باطل کو پیدا کرنے پر قادر ہے مگر پیدا نہیں کرتا۔ قبیح کی صفت ذاتی قبیح ہے۔ گو حضرت ذات کبریائی سبحانی سے منسوب کرنا ممنوع ہے۔ اور ذات کبریائی سے ان ایہ صدور جو قبیح کا وصف ذاتی ہے کسی طرح جائز نہیں۔ اسی طرح فاعل عدل خلیفہ نام نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کی جزا و جزا ضرور ملے گی مگر عذاب پھر سے معین ہے کم و بیش نہ ہوگا۔ اور نہ ثواب میں کمی بیشی ہوگی۔

فلسفی ۲۲۲ھ یا ۲۲۵ھ میں قریباً سو سال کی عمر میں فوت ہوا۔

اور کسی وجہ سے ابراہیم بن سیار النظام ابو ہذیل کا ہم عصر تھا۔ معتزلہ میں یہ اس لئے نہیں۔ اس میں اس نے کئی شاخسائے نکالے۔ یہ خلیل بن احمد کا شاگرد تھا معتزلہ فرقہ واصلیہ۔ بدلے۔ ایک وقت وہ زرتشتی دوتی کا قائل تھا۔ پھر مادہ پرست

ہوا۔ پھر لاادریہ جو کہتے ہیں کہ دلائل موافق و مخالف دونوں بیکار ہیں۔ اس کے عقاید میں ہر ایک مذہب کی جھلک پائی جاتی ہے۔ معتزلہ کا یہ عام عقیدہ ہے کہ عادل نظام نہیں ہو سکتا۔

ابن ہشام بن الحکم کا مذہب یہ تھا کہ رنگ روپ ذائقہ آوازیں اجسام ہیں۔ یہی مذہب نظام کا تھا۔ ذرا بلحاظ وقت ضرورت سے زیادہ آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ معتزلہ جنات کے قائل نہیں اور دیگر توہمات اور نیک و بد شکون کے بھی قائل نہیں نظام بیان کرتا ہے کہ

ایک دفعہ میں سفر کے لئے نکلا۔ ہر ایک مرحلہ پر شکون عام عقیدہ کے مطابق برے ہی دیکھے مگر سفر کا انجام خاطر خواہ اچھا رہا۔ اس دن شکون کی بے ہودگی واضح ہوئی۔

نظام کی نسبت مخالف بھی اچھی رائے رکھتے۔ اس نے کبھی دیدہ واپس نہ جھوٹ نہ بولا۔ وہ عموماً بحث کسی حقیقت پر نہ کرتا جو بھی قیاس میں آتا اسے حقیقت ثابتہ قرار دے کر دلائل پیش کرتا۔ اور یہ بھول جاتا کہ اصل دعویٰ تو محض ایک قیاس ہے۔ نظام کی صحبت کے فیض یافتہ ایک تو احمد بن حابط تھا جس سے مذہب حلیطیہ منسوب ہے۔ دوسرا فضل بن حدیثی یہ مذہب حدیثیہ کا بانی ہے۔ بقول شہرستانی انہوں نے تین بدعت اضا فہ مذہب نظامیہ پر کیا جو مذہب نصاریٰ سے اخذ کئے۔

بشریہ بشر بن معتمر کی نسبت شہرستانی لکھتا ہے کہ افضل علماء معتزلہ ہے یہ ادیب شاعر اور مذہبیات سے خوب واقف تھا۔ اصل تو کوفہ تھی بغداد

میں ہارون الرشید کے زمانہ میں آیا۔ ہارون نے قید رکھا کہ اس کے عقائد شیعہ مذہب کے ہیں۔ اس نے اکثر نظمیں لکھی ہیں جس میں یہ واضح کیا کہ ثبوت باری تعالیٰ آیات کتاب کائنات ہیں۔ اور عقل ہی رہنمائے صراط مستقیم ہے۔ اور حق و باطل و نیک و بد میں تمیز عقل کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ تمام معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خیر و شر کا صدور انسان سے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو قدریہ کہتے ہیں۔

ایک "جبری" سے بشر کا مناظرہ ہوا۔ اس نے سوال کیا کہ کیا تم اللہ کی حمد اپنے ایمان سے کرتے ہو؟
جواب اثبات میں دیا۔

جبری نے کہا کہ ثابت ہوا کہ اللہ حمد پسند فرماتا ہے ایسی بات کے لئے جو اس کا فعل نہیں۔ کسی شخص کی تعریف ایسے کام کے لئے کرنا جو اس نے نہیں کیا، جو ہے حمد نہیں۔

معتز کے شاگردوں میں سے عیسیٰ بن صبیح بھی ہے۔ بہت بڑا زاہد تھا۔ اس کو راہب معتزلہ کہتے ہیں۔ یہ شخص ہر ایک کو کافر ہی کہتا جو اس کے عقیدہ کے خلاف ہوتا۔ ابراہیم سدی نے ایک دن پوچھا کہ ساکنان زمین کا کیا حال ہے۔ اس نے سب کی تکفیر کی۔ ابراہیم نے کہا کہ قرآن میں بہشت کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ "جنت عرضہا کعرض السموات والارض" معلوم ہوتا ہے کہ ایسا تنگ واقع ہوا ہے کہ تیرے اور تیرے قین متبعین کے سوا اس میں کسی کی گنجائش ہی نہیں۔
شہرستانی بحوالہ کعبی لکھتا ہے کہ

اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن تو لوح محفوظ میں ہے۔ یہ تو ہونہیں سکتا کہ وہاں سے منتقل ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آجائے۔ وہ وہیں ہے جہاں تھا۔ یہ قرآن جو ہم پڑھتے ہیں ہمارا بنایا ہوا اور ہمارا فعل ہے۔ تمام معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن مخلوق ہے اور اللہ نے خلق فرمایا ہے۔ مگر یہ فرقہ ایک قدم اور بڑھ گیا کہ خلق ہم نے کیا ہے۔

شامیہ | ثمامہ بن اشعرش سے بھی ایک فرقہ منسوب ہے۔ ثمامہ خلیفہ نامون رشید کے زمانہ میں تھا اور خلیفہ کے نزدیک اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ کہتے ہیں کہ اسی نے نامون کو معتزلہ پر مائل کیا۔

شامیہ | ہشام بن عمرو فوطی سے منسوب ہے۔ چونکہ صدور خیر و شریکوں سے ہوا ہے۔ ہشام نے اس کو منطقی نتیجہ پر اس طرح پہنچایا کہ تالیف قلوب کی

نسبت جو قرآن میں اللہ سے کی گئی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ مومنوں کے دلوں کو خود نہیں جوڑتا بلکہ مومن اپنے اختیار سے جوڑتے ہیں اسی طرح "ختم اللہ علی قلوبہما" اور "طبع اللہ علیہا بظنرہما" "وجعلنا من بین یدیہما سداً ومن خلفہما سداً" کی تاویل کرتا کہ یہ بھی ہم جیسیوں کا فعل ہے۔ امامت کے بارہ میں اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ "امت کی تصدیق اجماع کے تصور کے بغیر نہیں اس لئے امامت ایام فتنہ میں منعقد نہیں ہوتی۔ حضرت علی کے ایام میں فتنہ نہ پڑا تھا بلا اتفاق جمیع صحابہؓ اور ہر طرف آپ کے مخالف صحابہ تھے۔ دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ جنت و جہنم ہمارے زمانے میں موجود نہیں ہیں اور اگر تسلیم کیا جائے کہ ہیں تو خالی پڑے ہیں۔ اس کا کیا فائدہ جب ضرورت ہوگی اس وقت موجود ہوں گے۔ اس کا شاگرد رشید عباد تھا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر خلق نہیں فرمایا۔

اس لئے کسی کافر کو بھی پیدا نہیں کیا۔ نبوت اجزاء عمل ہے جب تک دنیا باقی ہے نبوت بھی رہے گی۔ کسی شے کا علم اس وقت ہوتا ہے جب یہ شے موجود ہو جب کائنات موجود نہ تھی تو اشیاء کائنات غیر موجود کا علم بھی حق تعالیٰ کو نہ تھا۔ شے کا اطلاق کسی شے پر اسی وقت ہوگا جب وہ موجود اور معلوم ہو۔ اگر اشیاء کا علم اللہ کو قدیم سے ہوتا تو اشیاء کا قدیم میں ہونا بھی لازم آتا ہے۔

اس نے بھی تکفیر کا فتویٰ اپنے مخالفوں کے حق میں عام بلا استثنا صادر کیا اور عقیدہ یہ تھا کہ وہ کافر ہیں ان کا مال ہر جائز ناجائز طریق سے خواہ غصب یا سرقت کیا جائے جائز ہے۔ اسے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آیا دوسروں کی آنکھوں کے تنکے چننا رہا۔

جا حظیہ | عمر بن جاحظ سے یہ فرقہ منسوب ہے۔ معتزلہ میں فاضل و یگانہ روزگار شمار ہوتا ہے۔ مذہب اعتزال پر اس کی تصانیف بہت ہیں۔ اور کتب فلاسفہ اکثر اس کے مطالعہ میں رہی ہیں۔ مذہب اعتزال کو اسی رنگ میں ڈھالا یہ شخص خلیفہ عباسی معتصم اور متوکل کے عہد میں تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ

اہل دوزخ دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ہمیشہ رہیں گے تو عذاب محسوس نہ کریں گے۔ کیونکہ آگ سے ان کی طبیعت مناسبت پیدا کر لیگی آگ میں کسی شخص کو ڈالا نہیں جاتے گا بلکہ آگ خود انہیں جذب کر لے گی۔ یہ مذہب ابن عربی کا بھی ہے کہ اہل دوزخ بھی نعیم میں ہوں گے۔

جو شخص دعویٰ مسلمانی کرتا ہے اور اس کا یہ اعتقاد ہے کہ حضرت کبریا سبحانی جسم نہیں اور آنکھ رویت حضرت کبریا ممکن نہیں اور وہ عادل بھی ہو اور ظلم نہ کرے اور معصیت کا ارتکاب نہ ہو تو وہ صحیح مسلمان ہے۔ اگر کسی کو علم و حکمت سے سے پرہیز ہو اور اتنا ہی جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق اور رب ہے اور آنحضرتؐ اس کے رسول ہیں وہ بھی مومن ہے۔ اور اس پر کوئی ملامت نہیں وہ اتنی ہی بات کا مکلف ہے۔

قرآن کے بارے میں جاہل کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کا جسد ہے۔ کبھی انسانی صورت میں کبھی حیوانی شکل میں منتمل ہوتا ہے۔ جاہل زیادہ تر طبیعات کی طرف مائل تھا۔ الہیات کی توجیہ بھی وہ فلسفہ اور علم طبعی کے اصول پر کرتا۔

شیخ طریقیہ ابن الحسن بن عمر بن ابن النجیاط سے یہ فرقہ منسوب ہے۔ یہ شخص ابنی القاسم بن محمد کعبی کا استاد ہے۔ ان دونوں بغدادی معتزلہ کا ایک ہی مذہب ہے۔ ابن خیاط کا یہ عقیدہ ہے کہ جب یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ مرید ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ افعال پر قادر ہے۔ جب یہ کہیں گے کہ مرید افعال ہے تو مراد یہ ہے کہ ہر طبق علم کامل تھان افعال ہے۔ اگر کہیں کہ وہ سمیع ہے تو معنی یہ ہیں کہ مسموعات کو جانتا ہے اسی طرح بصیر کا یہ مطلب ہے کہ مبصرات کا اسے علم ہے۔

رومت حق کے بارے میں اس کا عقیدہ عام معتزلہ کے مطابق ہے مگر اتنا فرق ہے کہ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو دیکھتا ہے اور مرتبیات کو بھی دیکھتا ہے اور مدبرک ہے۔ اور اس کا ادراک اس کے علم پر زیادہ ہے۔ مگر کعبی اس بارے

میں اتنا اختلاف استاد سے کرتا ہے کہ "اور انک" تو علم پر زیادہ نہیں معتزلہ تمام صفات کو ایک علم ہی کی مختلف صورتیں قرار دیتے ہیں یعنی صفت علم عین ذات ہے اور مختلف حالات میں اس کے نام مختلف ہیں۔

مذہب اعتزال کے فرقے تو اور بھی ہیں۔ لیکن نام بنام شمار کرتا ہے فائدہ طوالت ہے۔ معتزلہ فلسفہ اور طبیعیات کی طرف زیادہ ترقی پائی ہے۔ طبیعیات میں عملی تجربہ کی طرف تو توجیہ نہ تھی۔ البتہ حکمت نظری اور استدلال ہے۔ بہر حال یہ بھی فلسفہ ہی سمجھنا چاہیے۔ ہم نے صرف ان کے عقاید زیادہ مذہب ہی مختصر بیان کئے ہیں۔ اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ معقول باتیں پسندیدہ سمجھی گئیں اور مخالف فرقہ کو بھی اپنے مذہب کی تائید میں استدلال عقلیہ ہی سے کام لینا پڑا۔ معتزلہ بغدادی اور بصری کا اختلاف دربارہ نبوت و امامت ہے۔ بعض کا عقیدہ موافق عقیدہ شیعہ اور بعض کا موافق اہل سنت و الجماعت ہے۔ فرقہ "جبائیہ" و "حسیمیہ" ابی علی محمد بن عبد الوہاب اور اس کے بیٹے ابی ہاشم عبد السلام سے منسوب ہیں۔ دونوں معتزلہ بصری ہیں اور دونوں کا عقیدہ دربارہ نبوت و امامت اہل سنت کے مطابق ہے۔ متاخرین معتزلہ مثل قاضی عبد الجبار کا مذہب بھی ابی ہاشم کے مطابق ہے۔

جبریہ

ہر ایک فرقہ نے اپنے لئے کچھ امتیازی نام تجویز کیا۔ اور یہ اچھا ہی تھا۔ لیکن مخالف فرقہ نے اس کے عقاید کا جو مخالف اس کے اپنے عقاید کے تھے۔ ایک اور نام سے مخاطب کیا جس میں ذمہ کا پہلو نکلتا ہے۔ معتزلہ اپنے آپ کو "اہل توحید و عدل" کہتے۔ مخالفوں نے "معتزلہ" سے شہرت دی۔ معتزلہ نے مخالف فرقوں کو "جبریہ" اور "مستویبہ" سے موسوم کیا۔ غرض یہ ناموں اور عقاید کی جنگ مسلمانوں میں عرصہ سے جاری ہے اور اب بھی ہے۔ مگر اس میں وہ پہلی سی شدت نہیں۔ جو نقصان وہ اٹھا چکے ہیں ایسا نہیں کہ ان کے جو اس خمسہ کو درست نہ کرتا۔ اس لئے شنی اور شیعہ اب "الصالح بیرو" ہی میں اپنی خیر دیکھتے ہیں۔

آنچہ وانا کند گند ناداں
نیک بعد از ہزار رسوائی

تاریخ "مذہب اسلامیہ" ہم اس لئے لکھ رہے ہیں کہ ہر ایک فرقہ زبان حال سے

کہہ رہا ہے کہ

من نہ کردم شما حذر بکنید

تاکہ مسلمان ویدہ عبرت سے ان کے حالات دیکھیں "فاعتبر وایا اولی الابصار"
قرآن حکیم میں قوموں کی ہلاکت کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے سب سے بڑا سبب یہی تفرقہ اور شہر انگریز فرقہ بندی ہے۔ اختلاف رائے اور بات ہے۔ اور اس

میں شریک پیدا کرنا اور شے ہے۔

”وواعقل را نباشد کین و پیکار“

شر ہمیشہ جاہل ہی پیدا کرتے ہیں۔

مسئلہ ”جبر و اختیار“ علماء اسلام میں عرصہ سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ احوال جو انسان بلکہ ہر ایک ذی حش سے صادر ہوتے ہیں ایک قوفطری ہیں۔

”قل کل یعمل النشاکلتہ“ فرمایا علیہ بین صواحدی سبید (۱۵)

”کہو کہ ہر ایک اپنی ڈیل ڈول کے مناسب عمل کرتا ہے تو تیرا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ صحیح روش پر چل رہا ہے“

ہر ایک طبقہ میں ہر ایک شے کا عمل اس کی فطری وضع کے مناسب ہی صادر ہوتا ہے۔ چوپائے اڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کے پر نہیں ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس انسان کے اعمال میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ دیگر حیوانات میں نظر نہیں آتا۔ اگر وہ پرندوں کی طرح پرواز نہیں کر سکتا تو اس کو ایک ایسی طاقت فطرت نے عطا کی ہے کہ ”طیارہ“ سے وہ کام لے رہا ہے جو پرندوں کا ہے۔ ہر ایک جاندار کو جیسی ڈیل ڈول فطرت نے عطا کی ہے وہ آلات اس عمل کے ہیں جو ان سے صادر ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو یہ عمل بھی ان سے صادر نہ ہوتا۔ ہر ایک شے کو شوق اللہ فرماتا ہے اور ساتھ ہی ان آلات کے صحیح استعمال کا طریقہ بھی فطرۃً وحی فرماتا ہے

”ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ہدینا (۱۶)“

جیسا کہ ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی کی مثال قرآن میں دی گئی ہے۔ مکھی وہی کام آفرینش سے کر رہی ہے جو اس کی ساخت کے مناسب ہے۔ وہ اس کے علاوہ کچھ اور کام نہ کر سکتی ہے اور نہ کرتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مکھی گائے کی طرح دودھ کیوں نہیں یا گائے مچھلی کی طرح پانی میں کیوں نہیں رہتی اور یہ کہہ کر دل کو تسلی دے کہ محبوب ہے تو یہ جہالت ہے۔ محبوب کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے کہ ایک کام کوئی کر سکتا ہے مگر اسے کرنے نہیں دیا جاتا ہے۔ طبقات نباتات اور حیوانات میں نظر کرو۔ اگر کوئی خارجی

امریات نہ ہو تو وہی کچھ کریں گے جو ان کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ انہیں بھی ان حالات میں ہم مجبور نہیں کہہ سکتے۔ اگر انسان کسی چوپایہ کو باندھ کر رکھے تو وہ مجبور ہے۔ کہ اپنے فطری تقاضہ کو عمل میں نہیں لاسکتا۔ انسان پر مجبور کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب اس طرح خارجی دباؤ اس پر پڑے

ارشاد قرآن ہے کہ

”من كفر بالله ما من بعد ايمانه ان من اضراة قلبه مطمئن بالايمان“

(۱۴)

”وہ جھوٹا ہے جو اللہ کا انکار ایمان لانے کے بعد کرے سوائے اس شخص کے جو اس پر مجبور کیا گیا ہو۔ مگر اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے۔“

کفر باللہ بحالت مجبوری جائز ہے۔ اسی سے شیعہ فرقہ نے تقیہ کا جواز پیدا کیا۔ جس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ اللہ کے ہاں تو جبری ایمان و عمل مقبول ہی نہیں۔

”لاکراه في الدين“ دین میں کوئی جبر نہیں۔ سوچنا چاہیے کہ بندہ پر بندہ جبر کرے۔ اور اس جبر کا ذمہ دار اللہ کو ٹھہرایا جائے جہالت نہیں تو اور کیلے ؟

ہم بعض اوقات کہتے ہیں کہ ”ہم حالات سے مجبور ہیں۔“ یا ”حالات پر ہمارا اختیار نہیں۔“ یہ صحیح ہے اگر حالات ایسے ہی ہیں جیسے آبِ محولہ بالا میں مذکور ہیں تو انسان مجبور ہے۔ اور بحالت جبر جو عمل اس سے کرایا جائے۔ اللہ کے ہاں قابل مواخذہ نہیں۔ ایسا عمل جو اللہ انسان سے کرانے اور وہ کفر و شرک کے مناسب ہو اور اللہ خود ہی اس پر سزا و جزا تجویز فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف ہے مزید تشریح جبروں کے عقاید میں ملاحظہ ہو۔

یہ فرقہ جہم بن صفوان سے منسوب ہے۔ یہ شخص بلخ کا باشندہ تھا۔ ”ترمذی“ میں

جہم سے اس نے اپنے عقائد کا اعلان کیا۔ اس لئے وہ ”الترمذی“ اور ”سمرقندی“ سے بھی موسوم ہے۔ بنی امیہ کے آخر عہد میں مسلم بن احمد مازنی نے اس کو قتل کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ خراسان کا والی بنو امیہ کی طرف سے ”حارث“ تھا۔ اور ”جہم“ اس کا معتقد

تھا۔ حارث نے علم بناوت بلند کیا اور جہم نے اس کا ساتھ دیا۔ بغدادی اپنی کتاب
 "فرق بین الفرق" میں لکھتا ہے کہ

"اب بھی اس کے پیرو "قرند" میں ہیں۔"

بغدادی ۳۱۰ھ میں فوت ہوا۔

بغدادی لکھتا ہے کہ

"اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کو کوئی قوت عمل ذاتی نہیں اور یہ
 کہ انسان اپنے فعل کا مختار نہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ آخر
 نابود ہو جائیں گے۔ ایمان صرف معرفت الہی ہے۔ کفر جہالت ہے۔ اللہ
 کے سوا کوئی کسی فعل پر قادر نہیں اور نہ غیر اللہ سے منسوب کیا جاسکتا
 ہے اگر ہم غیر اللہ مخلوق سے منسوب کرتے ہیں تو عجازا کرتے ہیں مثلاً
 ہم کہتے ہیں کہ سورج طلوع یا غروب ہو گیا۔ سورج خود اپنے اختیار
 سے طلوع و غروب نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو جو کچھ معلوم ہے وہ حادث ہے جو کسی
 مکان یا محل میں نہیں۔ اس لئے کہ کسی شے کی آفرینش سے پیشتر کسی شے کی معرفت
 ہو تو اس شے کا علم نہیں۔ اگر کسی شے کی آفرینش سے پیشتر اسے اس شے کا علم ہے
 تو دو حال خالی نہیں۔ اگر علم وہی ہے جو آفرینش سے پہلا تھا تو وہ ہوشے کی آفرینش کے
 لئے بعد ہے۔ غیر علم اول ہے اس لئے جہل لازم آتا ہے۔ اور اگرچہ علم اول باقی نہ رہا
 تو لازم آتا ہے کہ متغیر ہوا اور متغیر مخلوق ہوتا ہے اس لئے قدیم نہ ہوا۔
 ہشام بن حکم کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ جب اس طرح علم کا حادث ہونا مقرر کر لیا
 تو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو ذات میں حادث ہوگا یا محل یا مکان میں۔ اگر ذات میں
 حادث ہو تو ذات میں بھی تغیر لازم آئے گا اس لئے کہ ذات محل حوادث ہو جلتے گی
 اور اگر محل یا مکان میں حادث ہو تو محل متصف بہ علم ہوگا نہ کہ ذات باری تعالیٰ۔
 اس لئے ماننا پڑے گا کہ علم الہی حادث ہے۔ اس کی ذات میں نہیں غیر ذات میں
 اگرچہ یہ عقیدہ معتزلہ کا ہے۔ مگر جہم کو معتزلہ میں شمار نہیں کیا گیا۔"

بعد اوی لکھتا ہے کہ

”میرے زمانہ میں اسمعیل ابن ابراہیم شبیرازی ترمذی میں جمیوں کے پاس گیا۔ اور ان کو ان کے باطل عقیدہ سے آگاہ کیا۔ الحمد للہ اکثر تائب ہوئے اور ہم میں شامل ہو گئے۔“

جہم کا یہ عقیدہ تھا کہ ایمان میں کچھ تفاوت نہیں۔ انبیاء اور امت کا ایمان برابر ہوتا ہے۔ انبیاء کے ایمان کو اہم کے ایمان پر کچھ فضیلت نہیں۔ ایمان عقیدہ و قول و عمل سے منقسم نہیں ہوتا اور نہ زبانی انکار سے کوئی کافر ہوتا ہے۔ زبانی کوئی شخص علم کا انکار کرنے تو علم زائل نہیں ہوتا۔ زبانی انکار سے اسی طرح اگر کوئی کافر ایمان ہے مومن ہی رہے گا۔

علم کے بارہ میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کے علم میں واقعہ واحد ہے۔

شجرہ یہ فرقہ حسین بن محمد بن عبداللہ النجار ابو عبداللہ سے منسوب ہے۔ یہ شخص النظام کا شاگرد تھا۔ جس کا حال ہم معززہ کے تحت لکھ چکے ہیں۔ استناد اور شاگرد میں اکثر مناظرہ رہتا۔ ایک دفعہ بحث کی گرمی میں اسٹاؤکے نجار کو ایک لات رسید کی۔ نجار غصہ میں چلا آیا۔ تب لوزہ میں مبتلا ہو گیا اور مر گیا۔ نجاریہ کا عقیدہ کچھ تو اشعریہ سے اور کچھ قدریہ کے مطابق ہے۔ مگر بعض عقاید میں بالکل جدا ہیں۔

اشعریہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ ان اعمال کا خالق ہے جو انسان کسب کرتا ہے اور یہ کہ کوئی شے ہست نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کا ارادہ نہ ہو۔ اور یہ اعمال کی سزا و جزا مغفرت منجانب اللہ ہے۔ نجاریہ ان عقاید میں اشعریہ سے متفق ہیں۔ قدریہ سے اتفاق اس عقیدہ میں ہے کہ ذات منزہ صفات علم و قدرت حیات و غیر ہم ہے۔ حشر میں ویدار الہی کا انکار اور یہ کلام اللہ مخلوق ہے۔ قدریہ ان کافر اس لئے کہتے ہیں کہ اشعریہ کے ہم عقیدہ ہیں اور اشعریہ ان کو کافر اس لئے کہتے ہیں

کہ معتزلہ کے ہم عقیدہ ہے۔

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

روئت کے بارہ میں نجاریہ کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے دل میں کوئی قوت پیدا کر دے اور یہ قوت بصر میں آجائے اور بندے دیدار سے مشرف ہوں۔ شاید "راستہ ربی بنور ربی" سے یہ استدلال کیا ہے۔

نجاریہ کا یہ عقیدہ ہے کہ کلام الہی جب پڑھا جائے عرض ہے جب لکھا جائے جسم سے خواص اشیاء اللہ سے پیدا کئے ہیں اشیاء کے ذاتی نہیں۔ صحیح! یہ فرقہ بھی کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ اور وجہ اختلاف بھی مسئلہ خلق تھا۔ یضل بہ کثیراً ویسہدی بہ کثیراً۔

(۱) پیر غوثیہ — محمد بن عیسیٰ کا لقب پر غوث ہے۔ اسی سے یہ فرقہ منسوب ہے۔
(۲) زعفرانیہ — یہ النجار کا ہم عصر تھا۔ اور "رے" کا باشندہ تھا۔ بغدادی لکھتا ہے کہ زعفرانی کی اکثر باتوں میں قیاس مع الفارق ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کلام الہی اللہ کی صفت ذات نہیں جو غیر صفت ذات ہے مخلوق ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ ایسے شخص سے کتابھی بہتر ہے جو کلام الہی کو مخلوق کہتا۔

اس کے متعلق یہ روایت بھی ہے کہ وہ شہرت پسند تھا۔ اس لئے ایک شخص کو بے پیسہ دیا اور کہا کہ ایام حج کے موقع پر میری نسبت جو بھی ناشائستہ الفاظ ہیں استعمال کرتا تاکہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ حج کے لئے لوگ دور و نزدیک اور مختلف ممالک سے آتے ہیں ان کو اتنا تو معلوم ہوگا کہ زعفرانی بھی کوئی ہے۔
(۳) مسند رکیبہ — مسئلہ خلق قرآن کے بارہ میں ان کا عقیدہ نجاریہ کے مطابق ہے مگر یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے حروف کی ترتیب مخلوق ہے اور ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں کہ

"ان کلام اللہ مخلوق علی ترتیب الحروف"

اس حدیث کی توجیہ بھی مختلف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کلام اللہ جب تلاوت

کیا جاتے تو مخلوق ہے مگر قرآن قدیم بھی اللہ کے پاس ہے۔ اور وہی آنحضرتؐ کو "وحی" ہوا۔

بچوں نذیرند حقیقت رہ افسانہ زوند

اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔

ضرارہ یہ | یہ فرقہ ضرار بن عمرو سے منسوب ہے۔ ضرار کے ساتھ "حفص فرد" کا بھی بوجہ ہم عقیدہ مورخین ذکر کرتے ہیں۔ اشعریہ کے ساتھ ان کا

اتفاق اس لیے ہے کہ اعمال انسانی اللہ خلق فرماتا ہے مگر انسان کسب کرتا ہے اللہ تعالیٰ قادر ہے اور عالم ہے۔ عبادت اور جاہل نہیں، ذات الہی کی ماہیت ذات الہی ہی کو معلوم ہے اور یہ قول ابوحنیفہ سے منسوب کرتے ہیں۔ جو اس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹی طہس بھی ہے۔ اور اسی جس سے رویت الہی بہشت میں ہوگی۔ اعمال انسانی اگرچہ مخلوق الہی ہیں۔ مگر جائز ہے کہ ایک ہی فعل دو فاعل کے درمیان مشترک ہو۔ چنانچہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اعراض کو اجسام میں اور اجسام کو اعراض میں بدل دے۔ آنحضرتؐ کے بعد "حجت" صرف اجماع پر منحصر ہے۔ احکام دین منقول میں خبر اعاذ قابل قبول نہیں۔ امامت کے بارہ میں ضرار کی یہ رائے ہے کہ قریش سے باہر جائز نہیں۔ لیکن اگر قریشی اور نبطی میں امام کا انتخاب کرنا ہو تو میں نبطی کو منتخب کروں گا۔ اس لئے کہ وہ اقلیت میں ہیں۔ ان کے حقوق کی حفاظت بسہولت اسی طرح ہو سکتی ہے اور اگر کسی وقت نااہل ثابت ہو تو بسہولت معزول بھی ہو سکتا ہے۔ معتزلہ کا اختلاف اس سے اتنا ہے کہ وہ امامت غیر قریش میں جانے قرار دیتے ہیں لیکن اگر نبطی بھی ہوں تو قریش ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

صفاتہ

معتزلہ اور صفاتیہ میں یہ فرق ہے کہ صفاتیہ سلف کا مذہب ہے جو صفات الہی کو ازلی یقین کرتے ہیں۔ جیسے علم و قدرت و حیات و سمیع و بصر و ارادت و کلام و جلال و اکرام و وجود و انعام و عزت و عظمت اور ان صفات میں فرق نہیں کرتے ان میں سے بعض صفات ذات اور بعض صفات افعال ہیں۔ اصطلاح میں صفات ذات کو "صفات ثبوتیہ" اور صفات افعال کو صفات مشروطیہ کہتے ہیں۔ علم و ارادہ و قدرت و حیات و کلام و سمیع و بصر کو "ائمہ صفات" بھی کہتے ہیں۔ صفات مشروطیہ وہ ہیں جیسے اسماء رازق و خالق وغیرہ، خالق اسی صورت میں ہم کہیں گے جب مخلوق بھی ہو اور اسی طرح رازق کے ساتھ مرزوق بھی ہو۔ رب کے ساتھ مربوب بھی ہے۔ ان صفات میں ہر ایک اسم رب ہے جو مربوب کا تقاضہ کرتا ہے۔ خالق مخلوق کا اور رازق مرزوق کا، و علیٰ ہذا القیاس۔ معتزلہ نفی صفات کرتے ہیں۔ اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بحث مسائل زیادہ تر لفظی ہے اور محض دماغی تعیش۔ معتزلہ کو اس لئے کہ نفی صفات کرتے ہیں، معطلہ" بھی کہتے ہیں۔

صفاتہ کے بھی کئی فرقے ہیں۔ بعض اس میں مبالغہ اس حد تک کرتے ہیں کہ "تشیہ" کی حد تک پہنچ گئے۔ ان فرقوں کے حالات ہم شیعہ "غلات" کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ وہ اماموں کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ جیسے نصاریٰ مسیح کو بعض تاویل یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شے کی مثل نہیں۔ اس لئے ایسی صفات مثلاً

کلام و مسح و بصر وغیر ہم جن کا اطلاق مخلوق پر بھی ہوتا ہے جب ان کا اطلاق ذاتِ الہی پر ہوگا تو وہ مشارق کی مثل یا مشابہہ نہیں۔ اسی طرح ایسی قرآنی آیات بھی ہیں جن میں مماثلت یا مشابہت یا حدود کا مفہوم پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

”الرحمن علی العرش استوی“ اور ”خلقت بیدی“ اور ”جام ربک

ہم ان کے معنی نہیں جانتے اور ان کی تاویل پر مکلف بھی نہیں ہیں۔ لیکن بعض کا

عقیدہ یہ ہے کہ ضرورتاً ان الفاظ کے معنی ظاہر لینے چاہئیں۔ اور بعض ظاہری نہیں

لیتے۔ مگر تاویل کرتے ہیں۔ جو ظاہر معنی کرتے ہیں وہ تشبیہ میں الجھ کر رہ گئے۔ یہودیوں

بھی ایسے فرقے ہیں جو توراہ کی بعض آیات سے تشبیہ کا مفہوم پیدا کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں شیعہ میں بعض فرقے افراط کی طرف اور بعض تقریط کی طرف زیادہ

مائل ہیں۔ جن فرقوں نے افراط سے کام لیا انہوں نے ائمہ دین کو الوہیت کا درجہ

دیا۔

پہلا قدم افراط کی طرف یہ ہے کہ امام معصوم عن الخطا ہے۔ جب بشری

فطری کمزوریوں کی نفی کی تو دوسرا قدم فوقیت اور فضیلت کی طرف گیا اور اماموں

کو فوق البشر تسلیم کیا گیا۔ تیسرا قدم الوہیت کے مقام تک گیا۔ اسی کا رد عمل معتزلہ

کی صورت میں ہوا۔ بعض روافض نے افراط و تقریط سے کنارہ کیا اور معتزلہ میں

شامل ہو گئے۔

ایک فرقہ جو تشبیہ ناجائز قرار دیتا تھا۔ ان آیات کی نسبت

جن میں تشبیہ کا مفہوم پایا جاتا ہے یہ کہہ کر خاموش ہو

اپوالحسن اشعری

گیا کہ علی الرحمن علی العرش استوی۔ میں الفاظ عرش اور استوی

تو معلوم ہیں مگر کیفیت مجہول ہے۔ اس پر ایمان تو واجب ہے مگر اس کی متعلق

سوال بدعت ہے۔

یہ مذہب امام مالک بن انس کا ہے۔ یہی طریقہ اور عقیدہ امام احمد بن حنبل کا

سقیان ثوری اور داؤد اصفہانی اور ان کے متبعین کا ہے۔ ان حضرات نے علم کلام

سے کام نہ لیا۔ اور لینا بھی نہ چاہتے تھے۔ لیکن جب معتزلہ نے اسے سنا تو کیا۔ اور خاص خاص عقائد کو ان میں ڈھالا تو ضرورتاً ایک جماعت کی توجہ اس طرف ہو گئی۔ عقائد تو وہی سلف صالحین کے تھے۔ علم کلام سے تائید کی۔

ابوالحسن اشعری اگرچہ معتزلہ کے مدرسہ کا تعلیمیافتہ تھا مگر جب علیحدہ ہوا اور عقاید سلف پر قائم ہو گیا۔ تو مناظرہ اور مباحثہ کی بساط بھی کچھ گئی۔ یہ طائفہ اہل سنت والجماعت کے نام سے موسوم تھا۔ اب "اشعریہ" ہو گیا۔ اشعریہ اس فرقہ کو اس لئے کہتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعریٰ جنگ صفین کے خاتمہ پر حضرت علیؓ کی طرف سے حکم مقرر ہوئے۔ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے عمر بن العاص تھا۔ دونوں میں طویل گفتگو ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ

"اللہ تعالیٰ مالک وجود و نمود و بود جو کچھ بھی اپنی ملک میں تصرف فرمائے ظلم سے تعبیر نہ ہوگا۔ جو کچھ بھی تم پر حکم فرماتے ظلم نہ ہوگا۔"

فرض حسب روایات ابوالحسن نے انہی ارشادات کو اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیا۔ ابو موسیٰؓ سے مروی ہیں۔ ابوالحسن نے ان کو استدلال عقلیہ کے ساتھ معتزلہ کے ملاقات مناظرہ میں استعمال کیا۔ ابو منصور بغدادی کی کتاب "فرق بین الفرق" مذہب اشعریہ کی مستند کتاب ہے۔ جس کا حوالہ ہم نے ان اوراق میں اکثر دیا ہے۔

"معتزلہ" کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں کہ "جہاتی" اور اس کا بیٹا ابی ہاشم معتزلہ بصریہ ہیں جن کا اختلاف بعض مسائل میں معتزلہ بغدادیہ سے تھا۔ جہاتی کا شاگرد ابی الحسن اشعری تھا۔ ابی الحسن $\frac{322}{935}$ میں فوت ہوا۔ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔

اشعری نے استاد سے پوچھا کہ:

"تین بھائی ہیں۔ ایک تو بچپن میں فوت ہو گیا۔ اور دو عمر طبعی کو پہنچے ایک

تو کافر مرنا اور دوسرا مومن۔ تینوں کے بارے میں کیا فتویٰ ہے؟

استاد نے کہا کہ:-

کافر جہنم میں، مومن جنت میں۔ اور بچہ نہ جہنم نہ جنت میں، کسی جائے
امن میں ہوگا۔

شاگرد نے کہا کہ:-

بچہ اگر خدا سے کہے کہ مجھے بچپن میں کیوں موت دی۔ بڑا ہوتا مومن بن
کر بہشت میں جاتا۔

استاد نے کہا کہ:-

خدا جواب دے گا کہ میں جانتا تھا کہ تو بڑا ہو کر کفر کرے گا اس لئے
جہنم میں جاتا۔

شاگرد نے کہا کہ:-

بڑا بھائی کافر اگر خدا سے کہے کہ مجھے بچپن میں موت کیوں نہ دی کہ نہ بڑا
ہوتا نہ کفر کرتا اور نہ جہنم میں جاتا۔

استاد سے جواب بن نہ آیا۔ ابی الحسن نے استاد بلکہ اعتزال سے اعتزال اختیار

کیا۔ اور پھر سلف کے مذہب کی طرف رجوع کیا۔ ابی الحسن کی نسبت عقیدہ تندرستی

نے کئی روایات بیان کی ہیں۔ معتزلہ اکثر اعلیٰ پایہ کے پرہیزگار آدمی تھے۔ اس لئے

اشعری کے تقویٰ کو بھی بڑھ چڑھ کر بیان کیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ

اشعری فلسفہ سے اتنا بیزار ہو چکا تھا کہ مذہبی مناظرہ سے بالکل قطع

تعلق کر لیا۔ مگر اس نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے ارشاد

فرمایا کہ اہل حدیث کا مذہب حق ہے اس کی حمایت کر۔

بہر حال روایت کچھ بھی ہو۔ اشعری نے یہی روش اختیار کی۔

یونانی فلسفی "سوفسطائیہ" (SOPHISTS) کہلاتے ہیں۔ ان میں سقراط اور

افلاطون جیسے اعلیٰ پایہ کے مفکر بھی گزرے ہیں۔ اور وہ بھی تھے جو بال کی کھال کھا

اور لفظی بحثوں میں الجھتے اور الجھاتے۔ یہی حالت معتزلہ کی آخر میں رہ گئی۔

جہانی "اللہ کے بارہ میں لفظ" عاقل" اس لئے استعمال نہ کرتا کیونکہ اس میں

مفہوم "عقال" کا پایا جاتا ہے جس کے معنی "پندش" ہیں۔ "عقال" اس رسی یا ڈوڑھ کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کا گھٹنا باندھتے ہیں یا "سر" سے لپیٹتے ہیں۔ اشعری نے کہا کہ لفظ "حاکم" میں بھی تو یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ "حکمہ" لگام کے ایک حصے کو کہتے ہیں۔ ایسی بحث کو محاورہ میں "سوفسطہ" (SOPHISTRY) کہتے ہیں۔ مناظرہ میں فریق مخالف لفظی ہیر پھیر میں لا کر مغالطہ میں ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ روش تحقیق سے بہت بعید ہے۔

ان ایام میں اہل حجاز "اصحاب حدیث" سے موسوم تھے۔ اور اہل عراق کو "اصحاب رائے" کہتے۔ اہل حجاز سیدھے سادے مسلمان تھے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ اور خلافت راشدہ کے وقت تھے۔ ان کی زندگی عملی تھی اور عقاید کی چھان بین کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اصحابؓ آنحضرتؐ کی صحبت کے فیض یافتہ تھے اور تابعین میں اصحابؓ موجود تھے۔ "قرآن" اور آنحضرتؐ کی موجودگی اصحاب کے لئے کافی تھی۔ ہنگامی حالات کے بارہ میں آنحضرتؐ جو بھی ارشاد فرماتے اس کی تعمیل فوراً ہوتی۔ اہم امور کے متعلق آنحضرتؐ اصحاب سے مشورہ بھی کرتے (شاورہ صہبہ فی الامم) تابعین کا زمانہ آنحضرتؐ سے اقرب تھا۔ حالات بھی کچھ بہت نہیں بد تھے۔ اس لئے وہ اپنے زمانے کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اصحاب کی طرف رجوع کرتے جو قرآن اور اس عمل کو بیان کرنے جو ایسے حالات میں آنحضرتؐ اور ان کا تھا۔ اور خود اصحاب کا "اسوہ حسنہ" بھی تابعین کے لئے قابل تقلید تھا۔ اہل حدیث میں امام مالک بن انس اور محمد بن ادریس شافعی اور ثقیان ثوری اور امام احمد بن حنبل اور داؤد بن علی بن محمد اصفہانی ائمہ اہل حدیث گذرے ہیں۔ یہ احکام یا تو قرآن کی نصوص سے یا احادیث سے اخذ کرتے۔ قیاس جلی و خفی سے احتراز کرتے۔

لیکن اہل عراق کے حالات مختلف تھے۔ ان کو اہل رائے اس لئے کہا گیا کہ احکام میں قیاس سے کام لیتے۔ اگرچہ قیاس کی بنیاد قرآن و حدیث ہی تھی۔ ان میں

امام ابی حنیفہ نعمان بن ثابت نے وہ نام پایا کہ آج بھی یونیاں اسلام کی اکثریت
 اسی کے مذہب پر ہے۔ ابو حنیفہ امام محمد جعفر صادق کے ہم عصر تھے۔ امام جعفر صادق اہل
 حجاز میں سے تھے اور مدینہ منورہ اہل حدیث کا مرکزی مقام تھا۔ عراق کوفہ اور بغداد اور
 بصرہ کو خاص شہرت اور اہمیت حاصل رہی۔ ابو حنیفہ کوفی تھے۔ ان کے اصحاب میں
 محمد بن الحسن اور قاضی ابو یوسف یعقوب بن محمد اور زفر بن ہذیل اور حسین بن زیاد
 لوہوئی اور ابو مطیع بلخی اور بشیر مرسی بلندیہ جتھہ گزرے ہیں۔ ابو حنیفہ سے آپ کے
 متبعین نے اختلاف رائے بھی بعض مسائل میں کیا ہے اور یہ ناگزیر امر تھا۔ اس لئے
 کہ رائے کا اختلاف ہر ایک کے فہم کی بلند و پستی کے مناسب ہوتا ہے اور خود ابو حنیفہ
 نے کہہ دیا تھا کہ

”میرا مذہب و علم رائے ہے اور احسن رائے ہی قابل قبول ہوتی ہے میری
 رائے سے بہتر رائے یا بہتر تعلقہ فی الدین کسی کا ہو تو وہی اس لائق ہے
 کہ اس کا اتباع کیا جائے۔“

اشعری امام احمد بن حنبل کا پیرو ہے۔ معتزلہ کا عروج عباسی خلفا مومن اور
 معتصم کے زمانہ میں انتہا پر تھا۔ لیکن جب یہ بھی متقدمین کی پرانی لکیر پیٹنے لگے تو ان
 میں کوئی متقدمین کے دل و دماغ کا آدمی پیدا نہ ہوا۔ عوام تو پہلے ہی ان کی فلسفیانہ
 بحثوں میں کبھی نہیں الجھے۔ خاص علماء دین جن کا عوام پر بہت اثر تھا۔ جب اسی
 حربہ ”علم کلام“ کو ان کے خلاف استعمال کرنے لگے تو یہ جاں بر نہ ہو سکے۔

اشعری معتزلہ کے خلاف اکیلا ہی نہ تھا۔ اس کا ہم عصر مصر میں ابو جعفر احمد
 الطحاوی (متوفی ۳۳۵ھ) اور سمرقند میں ابو منصور المطرودی (دو نوں علم کلام کے زور
 سے مذہب سلف کی حمایت کر رہے تھے۔ دونوں ابو حنیفہ کے مذہب پر تھے۔ لیکن
 اشعری نے وہ نام پیدا کیا کہ اسی کے سرسلف کے مذہب کے اچھا نہ کا سہرا ہے۔
 طحاوی کی کتاب ”بیان السنۃ والجماعۃ“ آج بھی درسی ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں امام محمد العزالی (متوفی ۳۵۵ھ) نے علم منطق سے کام

لیا۔ اور جو کام اشعری نے ادا دھورا چھوڑا تھا۔ اس کی تکمیل کی۔ "احیاء العلم الدین" میں اس نے عقاید اسلامیہ پر بحث کرتے وقت جہاں فلسفہ اور منطق سے کام لیا وہاں آیات قرآنی اور احادیث کا بھی جائزہ دیا ہے۔ منقول کو معقول کی صورت میں ڈھالا۔ بحث کا موضوع ایمان باللہ اور اللہ کے صفات اور رسالت آنحضرتؐ خاص ہے۔

امام غزالی کا ہم عصر ابوحنیفہ عمر بن النسفی (متوفی ۵۳۰ھ) نے "عقاید" پر جو کچھ لکھا وہ اب مستند سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ نسفی امام ابوحنیفہ کے مذہب پر ہے مگر مطرودی کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ نسفی اختصار پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے اس کی کتاب عقاید کی شرح اکثر علمائے کی۔ سعد الدین تفتازانی کی شرح بہت مشہور ہے۔ صفات اللہ اور وقت حق ایسے مسائل ہیں جن پر امام فخر الدین رازی اور دیگر علماء اسلام نے سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جہاں تک عقاید کا تعلق ہے مختلف اسلامی فرقوں میں پہلے ہی موجود تھے۔ اور ائمہ دین نے ان پر مفصل بحث بھی کی۔ لیکن تفتازانی کے وقت اب یہ مدون ہو چکے تھے۔ اس لئے اب علماء اسلام کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ نئے نئے شاخسائے نکالیں۔ اب جو کچھ متقدمین لکھ چکے تھے اسی کی شرح اور تفسیر کافی سمجھی۔ اسی طرح ملا علی القاری نے ابوحنیفہ کی کتاب "فقہ اکبر" کی شرح لکھی۔

ایک خاص بات جس کی طرف ہم قارئین کرام کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اختلاف رائے تو ایک فطری تقاضا ہے۔ اور ذہنی ارتقا اس کے بغیر متصور نہیں ہو سکتا۔ یہود و نصاریٰ میں بھی کثرت سے فرقے ہیں اور اختلاف رائے ہی پر مبنی ہیں۔ مگر تاریخ مذاہب اسلامیہ میں ایک خاص بات جس کی طرف "ازل" ڈاکٹر ایڈگر (EAF L EDGAR ELDER) نے ترجمہ شرح العقائد نسفی کے دیا چہ میں توجہ دلاتی ہے یہ ہے کہ:

”مسیحی کلیسا کی تاریخ میں علماء مسیحی کی کونسلوں نے مسیحی عقائد کی تدوین

کونسلوں (NICAEA وغیرہ) میں کی۔“

مگر آنحضرتؐ سے لے کر آج تک کبھی مسلمانوں نے ایسی مجالس دینی کی طرح نہیں ڈالی۔ جس میں علماء و حکماء اسلام ایک جگہ بیٹھ کر عقائد و فرہ و واضح کرتے ان میں ہر ایک فرقہ اور فرقہ کے عقائد ہر ایک زمانہ میں واحد شخصیت ہی سے منسوب ہیں۔ اور ہر ایک شخصیت قرآن اور سنت رسول ہی کو اپنا مشعل راہ بناتی رہی یہ تو ہر ایک شخصیت کا دعویٰ تھا۔ مگر جو کچھ اس کے اپنے زمانہ کے حالات کا تقاضہ تھا۔ اس سے ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے لئے جو کچھ اس نے ”تفقہ“ کیا۔ وہ اس کا ذاتی ”قیاس“ یا رائے تھی۔ اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگرچہ ائمہ دین نے معاصرین کے قیاس کی غلطیاں بھی نمایاں کیں۔ اور ان میں مناظرے بھی ہوتے اور متاخرین نے متقدمین سے اختلاف بھی کیا۔ لیکن کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ بمنزلہ وحی آسمانی ہے۔ اور لوگوں کو اس پر ایمان لانا چاہیے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر ایک فقہ کو اپنی رائے کی صحت کا یقین تھا۔ اور بحیثیت ”معلم“ ان کے حلقہ درس میں طالبانہ علوم کا ہجوم بھی رہتا۔ مگر انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ان کا قول حرف آخر ہے۔ یہی وجہ کہ شاگرد استاد سے اختلاف رائے کرنا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ایک زمانہ کے تمام علماء کی ایک دینی مجلس قائم کر جاتی اور پھر مجلس میں وہ اسی طرح اختلافی مسائل کو زیر بحث لا کر اتفاق کرتے جیسے مسیحی چرچ کونسل میں ہوتا رہا۔ باوجودی نظر میں یہ تجویز پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس لئے بھی پسندیدہ نظر آتی ہے کہ اس سے شرابہ تفرقہ منٹ جاتا جو فرقہ بندی میں رونما ہوتا رہا۔

تاریخ کلیسا مسیحی میں چرچ کونسلوں نے جو مسیحی عقائد تدوین کئے اس نے اہل ذہن و فکر و علم و حکمت کو اجازت نہ دی کہ وہ کچھ اپنی قوت فکر سے بھی کام لیں اور اگر کسی نے کبھی ان کے خلاف آواز بلند کی یا ان کی بے ہودگی معقولہ سے

واضح کی تو "محکمہ احتساب جو پارلیمنٹ پر مشتمل" دنا سے زندہ جلادینا۔ (FACGOT AND STAKE) صدیوں تک یہ دینی حکومت لوگوں پر اور اکثر مفکرین نے دین اور اکثر اہل حکمت جا دو گز قرار دئے گئے۔

جب اہل اسلام نے سپانیہ میں حکومت قائم کر لی اور دارالعلوم ملک کے طول و عرض میں کھول دئے۔ یورپ سے طلبہ یہاں آنے لگے اور مذہب مسیحی اور علم و حکمت میں جنگ شروع ہو گئی۔ اس معرکہ کے حالات مورخین یورپ نے مفصل لکھے ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر ڈی بی کی کتاب "کوئٹلک ٹیٹوین سائنس اینڈ ریلیجن" کا یہ خاص موضوع ہے مسلمانوں میں یہ لڑائی کی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ دو دفعہ اور صرف دو دفعہ حکومت نے مذہبی عقاید میں دخل دیا۔ پہلی دفعہ عباسی خلیفہ مامون رشید نے جس کا مذہب اعتزال تھا۔ اس پر ایرانی تمدن زیادہ اثر انداز رہا۔ اس کے عہد میں معتزلہ کا زور تھا۔ اور اہل قرآن و سنت پر عتاب نازل ہو رہا تھا۔ دوسری دفعہ صفوی خاندان نے مذہب امامیہ کو بزور شمشیر شائع کرنا چاہا لہذا کچھ علماء شیعوں مجتہدین نے سخت احتجاج کیا مگر حکومت کے نشہ میں اس نے کسی کی نہ حسنی۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا اس کی تلخی بھی اس نے محسوس کی۔ لیکن یہ خرابی تھوڑا عرصہ رہی اور جلد ختم ہو گئی۔

مسیحی دنیا نے بھی دیکھ لیا کہ عقاید کو قانونی تشکیل اگر دی جائے تو ہزار معاشرتی خرابیوں کا موجب ہوتی۔ مسیحی "آرٹیکل آف فیث" جو روس کی قیود لک چرچ نے وضع کئے پروٹسٹنٹ چرچ نے اس کی دھجیاں اڑا دیں۔ جو شرور بارہ عقاید مسیحی چرچ پر برپا ہوا۔ وہ چرچ کونسلوں کا پیدا کر رہا تھا۔ چرچ نے جو روش دربارہ عقاید اختیار کی بالکل خلاف فطرت انسانی تھی اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی دنیا میں مسیحی مذہب سے نفرت اور بغاوت اس حد تک بڑھ گئی کہ اکثر اہل علم و حکمت اس سے اعتقاد اور عملاً کنارہ تن ہو گئے۔ اور اکثر آدہ پرست ہو کر رہ گئے۔

عقاید کے بارہ میں ارشاد قرآن ہے کہ

”لَا كَرِهَ إِيَّاهُ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرِّشْدُ مِنَ الْغَيِّ“

”دین میں کوئی بیزیر نہیں رہدایت اور گمراہی میں نمایاں امتیاز ہو چکا ہے“

”قَدْ جَاءَكُمْ بِصَافِرٍ مِّن رَّبِّكُمْ مِّنَ الْإِصْرِ فَلْتَقِسْهُم مِّنْ عَمَلِ فَعْلِهِمْ“

”وَمَا آتَا عَلَيْكُمْ مِّنْ خَبْرٍ“ (۳۶)

”تحقیق تمہارے پروردگار کی طرف سے بصائر آپ کی ہے تو جو بصیرت سے کام لیتا

ہے تو اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو ہے اور جو آنکھیں رکھتا ہوا نہیں دیکھتا تو میں تم پر نگہبان نہیں ہوں۔“

”قَدْ كَرِهَ اللَّهُ مَنِاتٍ مُّذْكَرًا هَ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمَبِيضٍ ۗ الْآمِنُ تَوَلَّىٰ وَكُفِرَ ۗ فَيُعَذِّبُهُ

اللَّهُ الْعَذَابُ الْكَبِيرَ ۗ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۗ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ“ (۳۷)

”تو صرف یاد دہانی (عہد فطرت کی) کرائے والا ہے اس لئے یاد دہانی تو

ہرگز ان پر واروغہ نہیں ہوگی جس نے اس یاد دہانی سے منہ موڑا اور کفر کیا تو اللہ اسکو بڑے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ تحقیق ہماری طرف ہی ان کا پھرتا ہے پھر تحقیق ان کے ایمان و عمل کا حساب لینا ہم پر ہے۔“

”لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ۚ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ ۗ فَاتَّقِ اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ“

”وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ

غَفُورٌ رَّحِيمٌ“ (۳۸)

”پتیرا اس امر میں کچھ بھی اختیار نہیں یا تو ان پر مہربانی کرے یا ان کو عذاب

دے گا اس لئے کہ وہ ظالم ہیں اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے

جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۗ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ

كُنْتُمْ أَعْدَاءً ۗ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۗ وَكُنْتُمْ عَلَى

شَفَا حُفْرٍ مِّنَ النَّارِ فَنَقَّدَكُمْ مِّنْهَا ۗ فَذَكَرْتُمْ لَكُمْ آيَاتِنَا لَعَلَّكُمْ

تَهْتَدُونَ ۗ وَذُكِّرْتُمْ ۗ مَن يَتَّبِعِ الْإِسْلَامَ حَقًّا ۖ يَدْعُوهُ إِلَى الْحَيَاةِ الدَّارِ الْآخِرَةِ ۗ

وینہون عن المنکر واولئک صبرا لفلحون واولئک تکرہوا صالذین
تفترقوا واخلتقوا من بعد ما جاء صبرا لپیئت واولئک لہم عذاب
عظیمہ (یک)

”اور قرآن کو سب بالاتفاق منطوقی سے تھامے رکھو اور تفرقہ نہ ڈالو اور اللہ
کے احسان کو پاؤ رکھو جو تم پر ارزانی فرماتا ہے کہ ایک دوسرے کا دشمن تھا تو تمہارے
دلوں میں الفت پیدا کی اور تم اللہ کے احسان سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم تو
آگ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے تو اللہ نے تمہیں گرنے سے بچالیا۔ اس طرح اللہ
اپنی آیات تم پر واضح لفظوں میں بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور مناسب ہے
کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو معقول باتوں کا امر کرے اور نامعقول باتوں سے
منع کرے اور ان (یہود و نصاریٰ) کی طرح نہ ہونا جو بیانات کے بعد تفرقہ اور
اختلاف میں پڑ گئے ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔“

نصوص قرآنی سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کا منصب رسالت اتنا ہی تھا
کہ پیغام حق لوگوں تک پہنچادیں اور یہ کہ آنحضرتؐ نہ ”حفیظ“ نہ ”وکیل“ نہ ”جبار“
نہ ”مصیطر“ تھے۔ اور یہ امور احتساب کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ جب ایک نظام
اسلامی قائم ہو گیا۔ تو اس کی تشکیل بھی ارکان اسلام سے ہوئی۔ یہ توحید اور صوم و
صلوٰۃ اور زکوٰۃ و حج ہیں۔ آخر الذکر چار کبھی بحث کا موضوع نہیں بنے۔ بحث اللہ
تعالیٰ کی ذات و صفات و رتبت پر رہی زکوٰۃ اور حج کے لئے استطاعت شرط
ہے۔ اس لئے جو صاحب استطاعت نہیں ان پر فرض بھی نہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے
پابند تمام فرقے تھے اور نظام اسلامی میں رہتے ہوئے ان کی پابندی لازم ہے۔ عقلاً
دوبارہ توحید بھی صدر اسلام میں بالکل سیدھے سادھے تھے۔ آنحضرتؐ اور خلفاء
راشدین کے عہد میں ان کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ ان کا پختہ ایمان توحید پر تھا۔
کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا تبار اور رب العالمین ہے۔ اور
کی عبادت کرنی چاہیے۔ مخلوق کی بندگی شرک ہے۔

عقاید ذہنی امور ہیں۔ جب تک کوئی شخص تقریر یا تحریر سے ان کا اظہار نہ کرے کسی دوسرے پر واضح نہیں ہو سکتے۔ اور جبراً کسی کے ذہن میں ٹھونسا بالکل غیر فطری ہے۔ ارشاد قرآن ہے کہ

”حکمت اور مواعظتہ حسنہ سے عقاید کا بطلان کرنا چاہیے اور اگر کوئی شخص نہ مانے تو اسے مجبور بھی نہیں کیا جاسکتا“

مسلمانوں کے فرقے تو آخر مسلمان ہی تھے۔ یہود و نصاریٰ جو امن سے حکومت اسلامی میں رہنا چاہیں وہ اللہ اور رسول کے ذمہ میں تھے اور ان کو ”ذمی“ کہتے تھے۔ محض بعض فروع میں اختلاف کی وجہ سے ان کو اترہ اسلام سے خارج قرار دینا بالکل غیر اسلامی ہے۔

ترکی سلطان روم سلیم نے ایک فرمان جاری کیا کہ یہود و نصاریٰ اس کی مملکت سے نکل جائیں یا اسلام قبول کریں۔

شیخ الاسلام فوراً علماء کے ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوا اور کہا کہ یہ فرمان بالکل غیر اسلامی ہے۔

سلطان نے کہا کہ عیسائیوں نے یہ سب کچھ مسلمانوں سے یہی سلوک کیا اور قصاص جائز ہے۔

شیخ الاسلام نے کہا کہ جن عیسائیوں نے ایسا سلوک کیا ان سے قصاص لے سکتے ہو، ناگروہ گناہ سے قصاص جائز نہیں۔

سلطان نے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔

شیخ الاسلام نے کہا کہ وہ حکومت اسلامی کے تحت رہتے ہوئے مگر گم گنتا غریب تھے۔ یہود کو تو اس لئے جلا وطن کیا گیا۔ مسیحی اور دیگر اقلیتوں سے ساز باز کر

شفا ہے تھے۔ اور رسول اور مسلمانوں کے درمیان حالات جنت پیرا ہو چکے تھے۔ تو تہ حضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمام دنیا اسلام سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو۔ بلکہ

ان سے صلح و امن کا عہد باندھا اور کبھی عہد شکنی نہیں کی:

ایک جرمن مورخ لکھتا ہے کہ

”جن کے سیاسی فائدہ کے لئے سلطان نے یہ فرمان جاری کیا انہوں نے مخالفت کی۔“

سلطان ایسا جاہر تھا کہ وزیر کی گردنیں اتنی سی بات پر اڑا دیتا جو اس کی مرضی کے خلاف کچھ کہتے۔ مگر شیخ الاسلام کے سامنے جھاک گیا۔ اسمعیل صفوی نے فرمان جاری کیا۔ ”کہ تمام اہل سنت و الجماعت اس کی مملکت سے نکل جائیں۔ یہاں مذہب آشنا عشریہ قبول کریں۔“

”مجتہدین کا وفد اس کے پاس گیا اور چھایا کہ یہ فرمان بالکل بغیر اسلامی ہے۔“ اور یہ بھی کہا کہ عثمانیہ ترکیہ حکومت میں لاکھوں شیعہ آباد ہیں۔ اگر رد عمل ہوا تو اس کا نتیجہ سخت خوفناک ہے۔“

اسمعیل نے مانا اور قتل کا حکم دیا اور کروڑوں سنی مارے گئے۔ شام میں اس کا رد عمل ہوا تو ہزاروں شیعہ مارے گئے۔ اس کے بعد دو ہمسایہ مسلمان سلطنتوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اگرچہ صفوی شاہ کو نیچا دیکھنا پڑا مگر ایک شخص کی غلطی نے شیعہ اور سنی کا تنازعہ ایسا کھڑا کر دیا کہ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ

”اگر یہ تنازعہ پیرپانہ ہوتا اور ترک اور ایرانی باہم نہ الجھتے تو تمام یورپ پر اسلام کا پرچم اترتا۔ یورپ نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔“

یہ تھا عقاید پر اجمتساب اور احتساب صاحب حکومت و اختیار ہی لے سکتا ہے۔ ائمہ دین تو صرف معلم تھے۔ ان کے حلقہ درس تدریس میں ہزاروں طالب علم شامل رہتے اور خود شاگرد بھی استادوں سے اختلاف کرتے۔ عقاید پر احتساب ہر مذہب میں ہے کہ ان میں کسی طرح کا تیز و تبدیل نہ ہو۔ اور کسی مسلمان کو حق نہیں کہ کچھ اپنی خدا واد عقل و فکر سے بھی کام لے۔ حالانکہ خود رسول کریم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ۔

”قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني و
 سبغت الله وما انا من المشركين“ (پک)

”کہو کہ یہ ہے میرا طریق کہ میں اللہ کی طرف دعوت علی بصیرت دیتا ہوں
 میں اور وہ بھی جو میرا اتباع کرتے ہیں، (علی بصیرت ہی حق تسلیم کرتے ہیں۔
 اور دعوت الی الحق دیتے ہیں) اور اللہ پاک ہے (اس کو رکھنا نہ تقلیدی ایمان و
 عمل کو قبول نہیں فرماتا جو شرک ہے) اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔“
 اگر کوئی شخص چیز کسی شخص سے کوئی بات منوائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ
 وہ مجبور کے ذہن کو اپنے ذہن کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اپنی شخصیت کے اتباع
 پر مجبور کرتا ہے اور یہ شرک ہے۔

ارشاد قرآن ہے کہ

”والذین اذنا کسر و باعنا ربهم بخیر و علیہا صمنا و عميانا“ (پک)
 ”وہ اللہ کے بندے وہ ہیں کہ جب ان کو اللہ کی آیات یاد دلائی جائیں
 تو ان پر ہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ اپنے حواس و عقل سے کام لیتے
 ہیں)“

عقائد و قسم کے ہیں۔ ایک تو مستقل جیسے ارکان اسلام، ان میں سے
 توحید اصل اصول ہے۔ دوسرے غیر مستقل جو وقتی اور ہنگامی حالات کے
 مناسب فقہی احکام ہیں۔ ان کا وضع و واضح کرنا قرآن نے ایک جماعت
 کے عقل و فہم پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ جماعت شوریٰ سے موسوم ہے اور اسی کا
 مذکور آیات (پک) محولہ بالا میں کیا گیا ہے اور اسی کو خیر امم کہا گیا ہے کہ

”کنت خیر امتا اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر و
 تؤمنون باللہ“ (پک)

اور انہی کی نسبت کہا گیا ہے کہ ”وامرہم شوریٰ بینوم“ اور انہی سے ایسے ہی
 وقتی انتظامی امور میں مشاورت کا حکم آنحضرت کو بھی دیا گیا تھا اور صحابی الامر

یہ مجلس و ائین و قوانین ہنگامی تھی۔ لیکن ایسے قوانین حالات خارجی کے تحت جو غیر محدود اور ہمیشہ بدلتے ہیں مستقل نہیں ان کو بھی حالات کے مناسب بدلنا چاہیے۔ اگر ایسے فقہی احکام یا مسائل کے متعلق احتساب ہو تو وہ وقتی ہی ہوگا۔ اور ہر ایک حکومت اس کا جائزہ لیتی ہے۔ لیکن ان کو بھی عقاید میں شمار کرنا غلطی ہے۔ ایک شخص نیک نیتی سے کسی ہنگامی قانون کو معقولیت کے ساتھ غیر صحیح سمجھتا ہے تو اس کا حق ہے کہ صدائے احتجاج بلند کرے اور اگر وہ اس کی پابندی پر مجبور ہو اور بحالت مجبوری اس پر عمل بھی کرے تو اعتقاداً اس کو غیر صحیح ہی یقین کرے گا۔ اور کسی حکومت کا حق نہیں کہ اسے قابل مواخذہ قرار دے۔

قرآن نے جو نظام اسلامی پیش کیا وہ صحیح معنی میں جمہوری ہے۔ لیکن جب ملکیت چھا گئی تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ شخصی تفقہ سے کام لیا جاتا۔ ملکیت عامۃ المسلمین کی نمائندہ جماعت نہ تھی۔ اور نہ کوئی مجلس شوری تھی۔

ایرانی تمدن کے زیر اثر وزیر اعلیٰ خلافت عباسیہ پر تو اول ایرانی برآمد پھر ترک سلطان چھانے رہے۔ علماء اسلام اپنے اپنے محدود حلقہ درس و تدریس میں فقہی مسائل وضع کرتے رہے۔ چونکہ اجتہادات عقلیہ تھے اس لئے ان میں اختلاف بھی تھا۔

اہل سنت والجماعت نے چار ائمہ دین کا اتباع کیا۔ امام مالک اور امام احمد بن حنبل اور امام شافعی اور امام بوحنیفہ۔ اگرچہ ان کے اجتہادات میں اختلاف ہے مگر اسے نظر انداز کیا گیا۔ ان کے متبعین "مقلد" کہلاتے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے اماموں کے اجتہادات کو مستقل شرعی احکام قرار دیا۔ حالانکہ ان کی حیثیت محض وقتی تھی۔ مسلمانوں پر ذہنی جمود چھا چکا تھا جس کی ذمہ دار ملکیت تھی۔ اگر یہ اپنی قوت فکریہ سے کام لیتے تو ہر ایک زمانہ کے خارجی حالات کے مناسب خود تفقہ کرتے۔ لیکن جہاں لوگ عقل و فکر سے کام لیں ملکیت قائم نہیں رہ سکتی۔ ملکیت کے لئے یہی مفید ہے کہ لوگ فرقہ و فرقت تقسیم ہوں اور ایک دوسرے سے الجھتے رہیں

مغلیہ شاہنشاہ اکبر کا وزیر اعظم کہتا ہے کہ
"مگر بو حنیفہ و ز زمان مابو سے فقہ دیگر می نوشت :-"

سزے جسے احکام شریعت کہتے ہیں۔ مابو ہی ارکان اسلام سب وقتی اور رنگامی ہیں
اور ان پر احتساب اگر وہ ذہنی ہے ناجائز ہے۔

آج جہاں کہیں جمہوری حکومت ہے وہاں مجالس و اصناف قوانین بھی ہیں۔
اور یہ قوانین ترمیم و تنسیخ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ زمانہ کے خارجی حالات کے ساتھ
وہ اپنی ذہنیت بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ترقی بھی کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان وہی
پرانی لکیر پیٹتے چلے آ رہے ہیں اور تنزل میں ہیں۔ اس لئے جنہیں عقاید سے موسوم
کیا جاتا ہے ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

ابوالحسن اشعری نے اگرچہ معتزلہ کو نیچا دکھایا مگر یہی کہتا رہا کہ اختلاف عقاید
کوئی وجہ کفر نہیں اور یہ کہ "اہل قبلہ" سب مسلمان ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ائمہ
دین نے فقہی اجتہادات کو خود ثنائی حیثیت دی۔ ان کے مقلدین کے حسن عقیدت
سے فرع کو اصل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور شخصیت پرستی میں الجھ کر رہ گئے۔

امام ابی عبداللہ مالک بن انسؒ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور مدت العمر مدینہ
ہی میں رہے۔ مدینہ ان ایام میں ان علماء کا مرکز ہی مقام تھا جن کو بمقابلہ اہل عراق
بواہل الرائے کہلاتے اہل حدیث کہتے ہیں۔ یہ زمانہ نبوت سے قریب تر تھا۔ اس وقت
تابعین کی ایک جماعت موجود تھی جو صحابہ کو دیکھنے اور ملنے والے تھے۔ اگرچہ ان ایام
میں اور بھی علماء حدیث تھے اور انہوں نے بھی غالباً آنحضرتؐ سے ایک دو واسطہ
سے احادیث سن کر قلمبند کی ہو گی۔ لیکن امام مالک کے "موطا" کے سوا ہمارے
پاس کوئی کتاب احادیث ان ایام کی کبھی ہوتی نہیں۔ یہ کتاب امام صاحب
سے اپنی وفات سے چالیس برس پیشتر لکھی۔ آپ کی وفات ۱۷۹ھ میں واقع
ہوئی۔ موطا کی شرح زرقانی میں یہ حقیقت واضح الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ ابتدا
میں امام صاحب نے چار ہزار احادیث جمع کیں۔ ہر سال ان میں کاٹ چھانت کرتے

رہے آج موطا کے مختلف نسخوں میں تین سو سے پانچ سو حدیثیں ملتی ہیں۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں سے اصل کتنی اور الحاقی کتنی ہیں۔ اور یہ کہ اگر امام صاحب چند برس اور زندہ رہتے تو باقی کتنی یہ جاتی۔ حافظ عبد البر نے جامع بیان العلم میں لکھا ہے کہ امام صاحب علم حدیث ظنی یقین کرتے تھے۔ ابن حزم بھی موطا کی بعض احادیث کو "ضعیف" کہتا ہے۔ رجم زانی کے بارے میں بھی اس میں حدیث ہے۔ جس کو اکثر ائمہ حدیث نے بھی ضعیف ہی قرار دیا ہے، اور بخوارج اور مستزاد نے اسے موضوع قرار دیا کیونکہ قرآنی نصوص کے صریحاً خلاف ہے۔ احادیث کچھ تو یہودی اور کچھ زندقہ وضع کرتے رہے جن سے ان کے مذاہب کی تائید ہو۔

بنو امیہ کے دور حکومت میں بھی احادیث قلم بند کی جاتی مگر صحابہ اور تابعین نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ ان حضرت نے منع فرما دیا تھا اور اس لئے کہ آنحضرتؐ کے الفاظ کسی کو یاد نہ تھے۔ لیکن بنو عباس کے دور حکومت میں اس طرف خاص توجہ ہوئی۔

خلیفہ منصور عباسی نے امام مالک کو کہا کہ احادیث سے فقہی مسائل اخذ کر کے ان کو قوانین کی شکل میں ڈھالا جائے۔

امام صاحب نے انکار کر دیا اور کہا کہ آنحضرتؐ کے مخاطب اول آپ کی قوم اور عربی قبائل تھے لیکن اب دنیائے اسلام میں کئی قومیں ہیں ان کی تہذیب و تمدن جدا جدا ہے۔ اس لئے کوئی ایسا قانون مدون نہیں ہو سکتا جس کی پابندی پر سب مجبور ہوں۔

خلیفہ نے کہا کہ ہم سب کو مجبور کریں گے۔

فرمایا "لا اکراه فی الدین" دین میں تو ایسا قانون ماسوی قرآنی احکام نافذ نہیں ہو سکتا۔ ملکی مصالح کو مد نظر رکھتے ہوئے ذہنی اور خارجی حالات کے مناسبتاً احکام وضع ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی اختلاف زمان و مکان کی وجہ سے اختلاف لازم ہے۔

مسیحی کونسلوں اور ائمہ دین کے اجتہادات میں بہت فرق ہے۔ یورپ میں "پوپ" کا مذہبی اقتدار چھایا ہوا تھا۔ اور ایک دینی حکومت تمام یورپ میں قائم تھی۔ کونسلوں میں جو بھی عقاید وضع کئے وہ ناقابل تغیر و تبدیل سمجھے گئے۔ مگر ہمارے ائمہ دین نے کبھی اپنی شخصی رائے کو لوگوں پر بکبر نہیں ٹھونسنا۔ اصول دین میں سب کا اتفاق تھا اور تمام دنیا اسلام کا اب بھی اتفاق ہے۔ معاملات کے بارہ میں جو قوانین وضع ہوئے ان میں اختلاف ہے۔ اور یہ ناگزیر امر ہے۔ عقاید نسفی چند جملوں میں ختم کی گئی ہے۔ تقاضا زانی نے جو شرح لکھی اور دوسروں نے جو اس پر حاشیہ لکھی کی۔ اس میں عقاید کے تحت وہ اختلافی مسائل بھی زیر بحث آگئے جن کا تعلق علاوہ اور امور کے براہ راست اللہ تعالیٰ خالق کا مخلوق کائنات سے ہے۔ اس کے ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ذات باری تعالیٰ کی صفات خلق وغیرہ اور مخلوق یعنی کائنات کی کیا حقیقت ہے۔ امام محمد بن حنبل کے نزدیک یہ کافی ایمان باللہ تھا کہ ایک ذات واحد خالق کائنات ہے اور ہم سب اس کی مخلوق ہیں اور اسی کی عبادت کے لئے مخلوق ہوئے اس کی اہمیت دریافت کرنے کے لئے ہم مکلف نہیں۔ کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے۔ اگر مکلف ہوتے تو سب ہوتے۔ چند افراد کی ذہنی کاوش پر اس کا انحصار نہ ہوتا۔ مختلف فرقوں کے عقاید کی حقیقت دیکھ کر کسی نے یہ فرقیہت کیا کہ "نیوکار مسلم بالخصوص بنو ہاشم سے محبت کرو مگر شیعہ نہ بنو یالیوس نہ ہو مگر جینیہ نہ بنو۔ جان لو کہ خیر اللہ کی جانب سے اور شر تمہارے نفس کی طرف سے ہے مگر قدرت نہ بنو۔ جو بھی نیکی کرے نیک ہے اس سے محبت کرو خواہ وہ کان پھٹا جوگی ہو۔" بہر حال خواہ ہم مکلف نہ بھی ہوں جو اپنے اطمینان قلب کے لئے چاہتے ہیں کہ ان امور کا علم ہو انہیں کیوں روکا جائے۔ اس طرح تو ذہنی اور مادی ارتقاء رک جائے گا۔

ایڈیٹر لکھتا ہے کہ

اسلام نے جو اضافہ فلسفہ میں دہ بارہ نظریہ جوہر عرض کیا انیق (UNIC LA)

ہے۔ اس سے ابتدا اور نظم و نظام کائنات کی مکمل تشریح ہوتی ہے
مسلمانوں میں "باقلائی" (متوفی ۱۱۳۰ھ) اس نظریہ کا موجد سمجھا جاتا ہے،
نظریہ یہ ہے کہ :-

۱۔ کائنات جو اہر فردہ سے مرکب ہے جو لا یتجزیٰ ہے اور سب ایک
جیسے ہیں۔ ان میں اقدار نہیں لیکن بحالت ترکیب جسم کی صورت میں
پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ خلا جس میں کوئی شے موجود نہیں۔ اجزاء فردہ کا اتصال و انفصال
حرکات کا مقام ہے۔

۳۔ وقت بھی اجزاء فردہ ہے جو لا یتجزیٰ ہے

۴۔ اعراض بھی عناصر ہیں مگر غیر مستقل ہیں اگرچہ مادہ پر عارضی ہیں مگر ان سے
علیحدہ نہیں ہو سکتے۔

۵۔ مادہ بلا اعراض اور اعراض بلا مادہ نہیں ہوتا اگرچہ جو اہر یا اعراض کا حجم
نہیں ہوتا۔

۶۔ اعراض دو اجزاء وقت میں واقع نہیں ہوتے۔ اس لئے اشیاء میں
ذاتی قابلیت نہیں اللہ ہی جو اہر اور اعراض بیک وقت پیدا کرتا ہے اور
یہ فنا و بقا ہم ہوتے رہتے ہیں۔ جنہیں قوانین فطرت کہتے ہیں۔ وہ
سنت اللہ ہے جو تبدیل و تحویل نہیں ہوتی۔

۷۔ موت و حیات دونوں اعراض ہیں جو ہستی پر عارض ہیں بنکوں و حرکت
اور موت و حیات دونوں حقیقت ہیں۔

۸۔ جو اہر اور اعراض کے سوا اور کچھ ہست نہیں۔ تمام اجسام انہی کی
ترکیب سے بنتے ہیں۔ اجسام کی صورت میں اختلاف اور اعراض کے
اختلاف کی وجہ سے ہے جو اہر خود ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔

۹۔ ایک عرض دوسرے عرض میں نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک عرض بلا واسطہ

اپنے جوہر سے وابستہ ہے اس کا محل یا مکان ہے۔

۱۰۔ ارادہ الہی قوانین فطرت سے بالاتر ہے۔ اس لئے عالم میں غیر محدود

امرکانات ہیں۔ ارادہ الہی پر قوانین محیط نہیں۔

۱۱۔ غیر محدود کا تصور ناممکن ہے۔ غیر محدود جسم یا غیر محدود تعداد اجسام یا

غیر محدود تعداد اسباب محال ہے اس لئے کائنات محدود ہے۔

۱۲۔ بصر کی شہادت اس وقت معتبر ہے جب بصیرت تصدیق کرنے

یعنی جو اس ظاہری بصر وغیرہ سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے ہر ایک حال میں

قابل اعتبار نہیں۔ حقیقت کا شعور بصیرت سے ہوتا ہے۔

متکلمین کے ان نظریوں پر زیادہ بحث ہمارے موضوع سے سر دست خارج

ہے۔ ہم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ طبیعیات اور فلسفہ کی تحریک خواہ خارجی تھی

مگر مذہبیات نے ہی مسلمان حکماء کو اس طرف متوجہ کیا۔ اور اس میں جو قابل قدر

اکتشافات علمیہ ہوتے۔ وہ ہمارے زمانہ کے حکماء کے نظریوں سے لگا کھانے

ہیں۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ان نظریوں کا اثر متکلمین کے عقاید پر بھی ہوا

ہم ان عقاید کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ حقایق اشیاء ثابت ہیں اور ان کا علم علی الرغم سوفسطائیہ قابل تصدیق و

تحقیق ہیں۔

سوفسطہ (SOPHISTS) یونانی فلسفی ہیں۔ بلحاظ عقائد ان کے بھی کئی فرقے

ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ عالم محض ادھام و خیال ہے۔ یہ حقایق اشیاء کے

منکر ہیں۔

مولانا جانی کہتے ہیں :-

سوفسطائی کہ از خرابی خبر راست گوید عالم خیالے سر بسر راست

اگرے عالم ہمیں خیال است و لے

جاوید و حقیقتے بسر لہ گراست

اس فرقہ کو "عنادیہ" کہتے ہیں۔ دوسرا فرقہ "عندیہ" سے موسوم ہے۔ یہ بھی حقایق کے منکر ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ جنہیں حقایق سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ہمارا ہی تصور ہے اگر ہم نہیں کہ کوئی شے جو ہر شے تو وہ جو ہر شے اگر کہیں عرض ہے تو عرض ہے۔ اسی طرح نسیم و حارث و ہست و نیست سب کچھ انسانی تصورات ہیں۔ تیسرا فرقہ "لاادریہ" (AGNOSTICS) ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی شے کی نسبت نہیں کہہ سکتے کہ ہست ہے کہ نیست ہے۔ کیونکہ دونوں دعویوں کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور یقینی دلیل ہمارے پاس نہیں رہے ہر ایک کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے ہی شکوک پر بھی شک کرتے ہیں۔

ارشاد قرآن ہے کہ اولی الباب جب تذکرے سے کام لیتے ہوئے بدیہی واقعہ اختلاف دلیل و ہمارا اور تخلیق کائنات میں فکر کرتے ہیں تو اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "ربنا ما خلقت هذا باطلا" اور نیز ارشاد ہے کہ

"وما خلقنا السماء والارض وما بينهما باطلا ذلك ظن الذين كفروا" (۲۳/۱۳)

"ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے باطل پیدا نہیں کیا۔ ایسا ظن ان لوگوں کا ہے جو کفر کرتے ہیں۔"

"وما لهم بہ من علیہ ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً" (۲۳/۱۴)

"اور ان کو اس کا علم تو ہے نہیں۔ یہ تو صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور ظن کا حق میں کچھ حصہ نہیں۔"

باطل کی تعریف یہ ہے کہ

"ما یدعی الباطل وما یعیذ" (۲۳/۱۳)

"باطل سے نہ کچھ پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ پیدا نش کو دہراتا ہے۔"

اس لئے کائنات باطل نہیں بلکہ قائم بالحق ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ علم ہی سے حق کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کے حصول کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ "ظنیات سے خالی الذہن ہو کر مشاہدہ کرو اور اس کو اس کی حقیقی اور اصلی صورت میں دیکھو جیسی کہ ہے اور یہ کہ اگر باطل ہو تو اشیاء بحث اور بے نتیجہ ہوں گی اور ہمارے تمام علوم ہوان سے مانع ہیں باطل ہوں گے۔"

ہمارے زمانہ میں عموماً اہل علم و حکمت "لا اور یہ" ہیں۔ اور نظام کائنات میں کسی مقصد اور حکمت کے قابل نہیں۔ کہتے ہیں کہ ضروریات کے علم کی یہ کیفیت ہے کہ ان میں سے بعض کا علم حواس کے ذریعہ (حسیات) ہوتا ہے۔ لیکن حواس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ احوال ایک کو دودیکھتا ہے اور علی ہذا القیاس۔ بعض بدیہات میں۔ لیکن ان کے بارہ میں اختلاف رائے اختلاف نظریہ ہے۔ دوسری ضروری قسم "استقراہ" ہے۔ مگر کبریٰ یا تو حسیات یا بدیہات ہے۔ لیکن یہ خود غیر معتبر ہیں۔ اس لئے نتیجہ بھی غیر معتبر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مفکرین کے نظریوں میں اختلاف ہر ایک زمانہ میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

تفاز زانی جواب میں لکھتا ہے کہ:-

"ان کو راہ راست پر لانے کا سہل علاج یہ ہے کہ ان کو آگ میں جھونک دو۔ پھر ان سے پوچھو کہ اب تمہارے حسیات اور بدیہات کیلئے کیا بات یہ ہے کہ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مائیں گے۔ حالانکہ بات بالکل سیدھی سادھی ہے کہ حواس کی غلطی کسی خاص سبب سے ہوتی ہے۔ اگر یہ سبب رفع ہو جائے تو غلطی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے اس لئے محض غلطی سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔ رہا اختلاف رائے کا سوال تو اس کا ایک وجہ یہ ہے کہ بدیہات میں امر بدیہی سے واقفیت کا قصوب ہے یا اس کے متعلق باتباع ظن غلط نظریہ بطور کبریٰ قائم کیا جاتا ہے لیکن اگر صغریٰ و کبریٰ کا صحیح تصور ذہن میں ہو تو نتیجہ بھی صحیح ہوگا۔ انسان مغالطہ میں اسی لئے الجھتا ہے کہ کبریٰ صحیح نہیں ہوتا۔"

علامہ نسفی لکھتا ہے کہ تحقیق کے تین طریقے ہیں :-

۱۔ حواس سلیمہ

۲۔ اخبار الصادق

۳۔ عقل

ارشاد قرآن ہے کہ :-

”ومن الناس من يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتاب

منير“ (۲۱/۱۱)

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر علم اور نہ کوئی ان کے پاس ہدایت (صحیفہ) اور نہ کتاب روشن (صحیفہ فطرت) ہے۔ ان آیات میں بھی تین طریقے بتائے گئے ہیں :-

اول، علم (معقول)

دوسرے، کوئی صحیفہ آسمانی جیسے توراہ و انجیل و قرآن (منقول) جسے

علامہ نسفی اخبار الصادق سے تعبیر کرتا ہے۔ اور

تیسرے، آیات صحیفہ کائنات (اذکاک الکتب لاریب فیہا)

حقیقت یہ ہے کہ اصل منبع علم ہی صحیفہ فطرت ہے اور قرآن عظیم و حکیم اسی کی تفصیل (تفصیل الکتب لاریب فیہا) اور اسی کا ”بیان“ (ہذا بیان للناس) ہے۔ یہی ”کتاب منیر“ ”کتاب مبین“ ہے۔

(تلك آیت القرآن والکتب مبین، ۱۹/۱۹)

(تلك آیت الكتاب والقرآن مبین، ۱۷/۱۷)

(تلك آیت الكتاب والذی انزل آیت من ربك بالحق، ۱۳/۱۳)

یہی ام الکتب ہے جس سے تمام علوم ماخوذ ہیں۔ یہی کتاب حق بات کہتی ہے

(ولدینا کتب ینلق بالحق، ۱۵/۱۵) اور یہی سرچشمہ ”وحی“ ہے۔ (اتل ما اوحی

آیت من الکتب، ۱۱/۱۱) اگر حواس سلیمہ اور قلب سلیم نہ تو اسی کے مشاہدہ سے

اکتشاف ہی ہوتا ہے۔

یہ امر تجربہ اور روزمرہ مشاہدہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ایک شخص پر اکتشاف حق نہیں ہوتا۔ اس لئے جن پر ہوتا ہے اس کی شہادت پر اعتبار کرنا واجب ہے ورنہ جاننے کی ضرورت نہیں علمی اکتشافات جن کے قلوب پر ہوتے ہیں وہ ان کا اعلان عوام میں کرتے ہیں۔ کوئی جاننے یا نہ جاننے اس کا اختیار ہے لیکن جو جانتے ہیں ان کو اعتقاداً اور عملاً تسلیم کرتے ہیں۔ فائدہ میں رہتے ہیں اور ہوناتے ہوتے عمل نہیں کرتے۔ یا اعتقاداً اور عملاً نہیں آتے۔ خسارہ میں رہتے ہیں۔ انہی علمی اکتشافات کا عملی نتیجہ وہ ایجادات ہیں جن سے ہمارا معیار زندگی بلند ہو رہا ہے اگر کوئی ان کا انکار کرے تو ظاہر ہے کہ حسیات اور بدیہات کا انکار کر رہا ہے۔ یا تسلیم کرتا ہوا عمل میں نہیں لاتا تو ان کے فوائد سے محروم ہے اس لئے یہ امر عقاید میں داخل ہے کہ

(۲) رسولوں پر ایمان لایا جاتے جو مخبر صادق اخبار صحیحہ دیتے ہیں۔

(۳) ان کتب مقدسہ پر ایمان ہو جن میں اخبار الصادق ہیں۔

صحیح خبر و قسم کی ہے۔ ایک وہ جو کسی شاہد اول کی شہادت ہے۔ اس پر یقین کرتے ہوئے اس کا علم بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے مصر دیکھا اور مصر کے حالات چشم دید بیان کرتا ہے اگر کوئی شخص چاہے تو اس کو مصر دکھایا جاسکتا ہے اسی طرح وہ مرتبہ یقین سے علم حاصل کرے گا۔ اور اگر کوئی شخص مصر میں نہ جاسکے یا نہ جانا چاہیے۔ تو اس کے لئے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ اسے بہر حال یقین کرنا چاہیے۔ یہ شہادت تو نادی دنیا میں بذریعہ بصر کام آسکتی ہے۔ اگر شاہد کوئی ایسی بات کہے جسے ما بعد الطبیعتہ یا ما قبل الطبیعتہ کہتے ہیں۔ اس شہادت کی بھی تصدیق و تحقیق ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے بصیرت کی ضرورت ہے جس کے لئے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب مقدم ہے جو تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔

یہی وہ اخبار الصادق ہے جو ہمیشہ بحث کا موضوع رہا۔ شہر کو ران و حدیث
 فیل کا معاملہ ہے۔ اگر کوئی شخص صاحب بصیرت نہ ہو یا کسی وجہ سے ہو نہیں سکتا
 یا ہونا نہیں چاہتا تو اسے ہر حال اس مہادت پر یقین کرنا چاہیے۔ اور یقین کے
 کے ساتھ اس کے مناسب عمل بھی کرنا چاہیے وہ فائدہ سے محروم نہ رہے گا۔
 باطل کی تعریف کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ محض ظنیات اور دوران
 کار و اوقات (تمنا) اور توہمات ہوتے ہیں۔ "حق" کی تصدیق اس کے نتیجے سے
 ہو سکتی ہے۔ جو بات بے نتیجہ ہو وہ عبت ہے یا لہو و لعب ہے۔ اس لئے ایمان
 و عمل اگر بے نتیجہ ہوں تو عبت ہیں۔ اس لئے ہم ہر ایک عمل حکم یقین کے ساتھ
 کرتے ہیں اور نتیجہ کی قوی امید رکھتے ہیں قرآن میں "یوم آخرت" یہی نتیجہ اعمال
 ہے۔ اس لئے اس کا بھی پختہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ

(۴) یوم آخرت حق ہے۔

تفاز زانی نے خبر صحیح پر مفصل بحث کی ہے۔ ایسی خبر جسے ایک سے زیادہ بلکہ
 اکثر لوگ بیان کریں۔ اور ان کی نسبت یہ یقین بھی ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔
 تو اس کو تو اثر سے موسوم کرتے ہیں۔ اس سے ضروری علم حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً
 شاہان گزشتہ کا تذکرہ یا ان حوادث کے تاریخی واقعات جن سے انقلاب عظیم
 رونما ہوا۔ یہ اب دکھائے نہیں جاسکتے۔ مگر ان پر یقین کرنا واجب ہے اسی
 طرح وہ واقعات جو بطور پیش گوئی بیان کئے جاتے ہیں۔

ترتیب تصور ہائے معلوم

تشیو تصدیق نامعلوم مفہوم

ایک ہیئت دان ریاضی کی مدد سے بتاتا ہے کہ آئندہ سال کسوف و خسوف
 فلاں وقت ہوگا اور فلاں ساعت میں ہوگا۔ اسی طرح آئندہ زمانہ کے ہزار ہا سال
 کے کسوف و خسوف کا وقت بتا دے گا۔ اور اسی طرح گزشتہ ہزاروں سال کا
 بھی بتائے گا۔ اور اگر ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں تو جو عمل کرتے ہیں اسی آئندہ زمانہ

میں اس کے نتیجہ کی امید بھی کرتے ہیں۔ اگر ہمارا عمل صحیح ہو تو نتیجہ بھی خاطر خواہ ہوتا ہے۔

اگر ایک شخص بد پر مبنی ہے اور حفظانِ صحت کے قوانین کی پروا نہیں کرتا۔ ضرور ہے کہ وہ پر سویر بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ ان امور کا علم ہمیں تذکرے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور تفکر اور تدبیر سے ہم بہت کچھ آئندہ کا علم بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایسے امور ہیں جن کا انکار کوئی اہل علم نہیں کرتا، ظاہر ہے کہ آئندہ واقعات کی پیش گوئی ممکن ہے ہمارے تمام کاروبار اسی آئندہ کی توقع پر چل رہے ہیں۔ لیکن اہل مذہب بالخصوص مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو کچھ بذریعہ وحی انبیاء کو معلوم ہوا وہ خبر صحیح ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اس کی تصدیق اس وقت ہوگی جب واقعہ مسینہ آئندہ زمانہ میں رونما ہوگا۔ مثلاً توراہ میں بنی اسرائیل کے بارہ میں چند پیشگوئیاں ہیں۔ جن کا سوالہ قرآن (سورہ بنی اسرائیل) میں دیا گیا ہے۔ آخری پیش گوئی کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

”اور خداوند تجھے مصر میں پھر جہازوں پر اس راہ سے لائے گا جس کی نسبت میں نے تجھ سے کہا ہے کہ تو پھرتہ دیکھے گا اور یہاں تو اپنے دشمنوں کے ہاتھوں بطور لونڈی اور غلام بیچا جائے گا۔ اور تیرا کوئی خریدار نہ ہوگا۔“
(المثنیٰ ۲۸/۶۸)

المثنیٰ اسفارِ موسیٰ کی پانچویں کتاب ہے۔ قرآن میں بھی اس پیشگوئی کا ذکر ہے۔
”فاذا جاء وعدنا خیرة جتنا بکملیفا“ (۱۱۱)

جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو (اے بنی اسرائیل) ہم تم کو ہر ایک جگہ سے لپیٹ کر اس جگہ لے آئیں گے۔

حضرت موسیٰ نے یہ خبر صحیح تین ہزار سال سے زائد عرصہ گزر رہے دی تھی اور آں حضرت نے بھی تیرہ سو سال بیشتر سے دہرایا۔ ہم نے اپنے زمانہ میں دیکھ لیا کہ اعلانِ پالفور کے بعد یہود ارضِ معہودِ فلسطین میں کرہ ارض سے سمٹ سٹا کر

آ رہے ہیں۔ اس جگہ ان کا اجتماع حسب پیشگوئی پورا ہوا اور اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔ پیش گوئی کے آخری حصے کا انتظار ہے اور یہ بھی پوری ہو کر رہے گی۔ سب سے بڑھ کر تو اتر سے ثابت شدہ شہادت کل انبیاء اور رسل کی ہے جن کا بلا استثنا اتفاق توحید پر ہے اس لئے عقیدہ

(۵) توحید پر یا ایمان باللہ اصل اصول ایمان ہے۔

حکام کے نظریوں پر باہم اختلاف ہم یقین کرنے میں جہاں ایک کثیر جماعت کا اتفاق ہر ایک زمانہ میں ہو اس پر ایمان نہ لانا اصول شہادت کے خلاف ہے۔ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ عقلاً اہل علم بھی توحید کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

کائنات عالم کثرت ہے۔ کثرت اشیاء میں ہم مماثلت اور مشابہت اور بینیت اور تخالف اور تضاد مشاہدہ کرتے ہیں۔ انہی امور کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم اشیاء کو طبقات میں تقسیم کرتے ہیں۔ طبقہ جمادات و نباتات و حیوانات کی کثرت کو ہم اس طرح تین وحدتوں پر لاتے۔ اس کے بعد ہمارا ہی ذہنی موشش یہی ہوتی ہے کہ ان سب کو ایک نقطہ وحدت پر لائیں۔ اور اس کو "مادہ" سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی طرح مادہ کے اجزا کو "جوہر فردہ" میں تحلیل کرتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا مبلغ علم الاشیاء۔ ظاہر ہے کہ علم کا حصول توحید سے وابستہ ہے۔ ہمارے زمانہ میں اہل علم و حکمت نے کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے کی اصل ایک "قوت" (ENERGY) دریافت کی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں حقیقت واحدہ کا انکشاف ہوا۔ اس لئے تحقیق یہی ہے کہ ہستی کی گتھی کو سلجھانے والا عقیدہ توحید ہی ہے۔ اتنا عقلاً بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

عقاید تو یہی کچھ ہیں۔ باقی ہمہ افسوں و فسانہ۔

ارشاد قرآن ہے کہ

"یا مرہبہ بالمعروف وینہی عن المنکر ویحمل لہم الطیبیت و

يَحْتَمِ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةُ وَيُضَعُ عَنْهُمَا الصَّرْحُ وَالْغُلُّ الَّتِي كَانَتْ
عَلَيْهِمَا (۹)

”الرسول النبي الامي“ معقول باتوں کا امر اور نامتقول باتوں سے منع کرتا ہے۔ اور پاکیزہ چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام قرار دیتا ہے اور جس (رسول کے) بوجھ کے نیچے دیے ہوئے ہیں (جو ان کے خود ساختہ ہیں) ان سے سبکدوش کرتا ہے، اور وہ طوق (عقاید) جو ان کے نکلے کا ہار ہو رہے ہیں اتارنا ہے۔“

اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے جن عقاید میں اپنی اور لوگوں کی قوت دکر یہ کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور ناقابل پروا شدت تکالیف شرعیہ اختراع کیں۔ آنحضرت نے ان کی بے ہودگی واضح کرتے ہوئے انہیں یک قلم موقوف کر دیا۔ لیکن مسلمانوں میں اسی ذہنیت کے آدمی پیدا ہو گئے اور پھر سے لوگوں کو انہی رسوم مذہبی کی بھینچ میں جکڑوایا اور ایسے عقاید وضع کئے جن کی کوئی سند قرآن میں نہیں۔

علامہ نسفی اور شارح علامہ تفتازانی باہمہ علم و فضل عذاب قبر اور منکر نکیر کے سوال و جواب اور میزان اور پل صراط پر ایمان کو بھی عقاید میں شامل کرتے ہیں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں لفظ عقیدہ ہی اس معنی میں لغت سے مٹا دیتا۔ نہ معلوم یہ اصطلاح کب وضع کی گئی۔ ہمارے لئے لفظ ”ایمان“ ہی کافی ہے۔ عقائد کے معنی ہیں بانہ صنا، جکڑنا، گره ڈالنا۔ ایمان کا مفہوم ہے یقین علمی جو بصیرت و بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ ہیں تفاوت رہ از کجاست تا بحجاب

خوارج اور معتزلہ عذاب قبر و منکر نکیر کے منکر تھے۔

اگر میرا اختیار ہوتا۔ تو میں اس قسم کے عقاید کی جگہ اور ہی پیش کرتا اور اد

کو ”ایمانیات“ میں داخل کرتا۔ مثلاً

”سنت اللہ کبھی تبدیل و تحویل نہیں ہوتی“ اور سنداً نص قرآنی پیش کر

فلن تجد لسنت الله تبديلاً، ولن تجد لسنت الله تحويلاً (۱۱)

اور یہ عقلاً مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قوانین فطرت تبدیل و تحویل نہیں ہوتے۔ ہر ایک شے پر انہی کے تحت تغیرات واقع ہوتے ہیں لیکن یہ خود نہیں بولتے۔

۲۔ قانون خلقت اور اس کے عمل میں کبھی اور کہیں تفاوت نہیں۔ مخلوقات کی صورتوں میں اور ان کے اعمال میں اختلاف ہے۔ اور واجب ہے۔

۳۔ تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے پر تغیرات بلا وقفہ واقع ہو رہے ہیں۔ اور کائنات ہر آن "خلق جدید" میں رونما ہو رہی ہے اور وہ وقت بھی آنے والا ہے اور ایسے وقت کا آنا ان قوانین تبدیل و تجدید کے تحت آنا واجب ہے "یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات" (۱۳/۱۹)

۴۔ اس تجدید و امثال و خلق جدید میں قانون ارتقا عمل فرما رہے اس لئے ہمارا ایمان اس حقیقت پر پختہ ہونا چاہیے کہ "ان حرۃ خیر" قرابتی (۱۳/۱۹)

انہی امور پر ایمان ہو تو ان کے مناسب عمل اور ان نتائج پر ایمان بھی واجب ہے مثلاً

۱۔ تمام کائنات ایک پختہ نظام کے تحت قوانین فطرت کے حکم پر ہے۔ اس کو دین الشکر، دین الحق، دین الفطرت اسلام ہے موسم کیا گیا ہے۔ "افخیر دین اشمی یفون ولما سلم من فی السموات والارض طوعاً وکرہاً والیہ یرجعون" اس لئے "ومن یتبع غیرک سلام دیناً فلن یتقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخسیرین" (۳۳/۱۴)

۲۔ مسلمان وہ ہے جو اللہ والا ہو نہ کہ مخلوق کا بندہ۔ اللہ والا وہ ہے

جو اخلاق الہیہ میں رنگین ہونے کے مخلوق کے۔ صبیحة اللہ ومن احسن
من اللہ صبیحة (۱/۱۴)

۳۔ یہ میزان عدل جو اس عالم اصدا میں توازن قائم رکھتی ہے اخلاق
الہیہ میں داخل ہے۔ اس لئے اس کے مناسب ہماری خواہشات
اور اعمال میں بھی اعتدال واجب ہے۔

۴۔ اس لئے افراط و تفریط اعمال میں بدی سے موبسوم ہوتے ہیں اور
اعتدال تقوی سے: "من یعمل سورا یجزیہ ولا یجدلہ من دون
اللہ ولیا ولا نصیرا، ومن یعمل من المصلحت من ذکر او انشی
وھو موم فاولئک یدخلون الجنة ولا یظلمون نقیرا۔"

۵۔ اعمال کی جزا و سزا بدی امور میں اور بقدر بدی سزا بھی ہے لیکن
نیکی کا بدلہ بہت کچھ زیادہ ملتا ہے۔ "من جاء بالحسنة فله عشر
امثالها ومن جاء بالسيئة فلا یجزی الا مثلها وھو ان
یظلمون۔" (۱۷) بدی کی سزا بقدر بدی تقاضا عدل ہے اور نیکی کا
عوض دس گنا بخشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت بدی سے نفور
ہے اور اسے بڑھنے نہیں دیتی نیکی پسندیدہ ہے اس لئے اس میں
ارتقا ہے۔

علامہ نسفی نے معراج اور معجزات کو بھی عقاید میں شامل کیا ہے۔ معجزات
پر ہم بحث کر چکے ہیں کہ تمام کائنات معجزہ ہے۔ ذرہ ذرہ معجزہ ہے اور تمام امکانات
جو ذرہ ذرہ میں "الغیب" ہیں جب انکشاف اہل فکر پر ہوتا ہے تو ایسی ایجادات
کرتے ہیں کہ سچ معجزہ ہی ہیں اور ان کا منکر سحت کافر ہے۔ لیکن ایسے معجزات
اگر انہیں تسلیم کیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سنت اللہ تبدیل و تحویل ہوتی ہے
قابل قبول عقیدہ نہیں۔

معراج کے بارہ میں کچھ روایات ہیں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کریہ سب

ایرانی زرتشتی ہیں۔ معراج کا قصہ وہی کچھ ہے صرف نام بدل دئے گئے۔ "سروش" کی جگہ "جبرئیل" اور "پلصراط" اور "مینو" (بہشت) وغیرہ کا مفہوم ایک ہی ہے۔ واقعہ مؤلف ولہستان مذاہب نے زرتشتی مذاہب کے حالات کے تحتیوں بیان کیا ہے کہ

"اردشیر ایرانی شہنشاہ کو دوسرے عالم کے صحیح حالات معلوم کرنے کا شوق گدگدایا۔ پیشوایان مذاہب کو جمع کیا۔ انہوں نے کہا کہ کوئی ایسا آدمی ہونا چاہیے جس نے مدت العمر آئین زرتشتی کے مطابق کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ ایسے آدمی کی تلاش ہوتی تو ایک نوجوان دستیاب ہوا۔ آتش کدہ کے قریب ہی موبد وغیرہ اوستا کے پاٹھ میں مصروف ہوئے۔ نوجوان کو ایک چارپائی پر لٹایا گیا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی جو کئی دن رہی۔ اس عرصہ میں اوستا کے منتر موبد پڑھتے رہے آخر نوجوان ہوش میں آیا۔ اور کہا کہ دو آدمی زردو نویس لاؤ تاکہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ بیان کرتا جاؤں اور وہ لکھتے جائیں۔ نوجوان نے بیان کیا کہ اس کے پاس "سروش" (فرشتہ) آیا اور اس کو آسمان کی طرف لے گیا۔"

اس کے بعد "پل صراط" اور "دوزخ" اور "بہشت" کا مذکور ہے۔ یہ طویل داستان ہے۔ یہی قصہ مسلمانوں میں تبدیل نام کے بعد شائع ہوا۔ اور اس کو مستند بنانے کے لئے "احادیث" میں مذکور ہوا۔ معراج کے بارہ میں تمام احادیث زندلیقوں کی اختراع ہے۔

اعلام اسلام کو بجا خیال ہوا کہ معراج ایسے مہتمم بالشان واقعہ کا مذکور اسری قرآن میں ہونا چاہیے۔ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت سے معراج کی تصدیق کی۔

"سبحت الذی اسری بعبدہ لیک من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ"

الذی بلرکنا حولہ، لنزیرہ من ایتنا، اذہموا تسمیح البصیرہ (۱۵)

پاک ہے ذات اللہ تعالیٰ کی، اپنے بندے کو ایک رات مسجد الحرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کی طرف لے گیا۔ جس کے گرد (ہم نے برکت سے رکھی ہے۔ تاکہ اس کو اپنی کچھ آیات کا مشاہدہ کرا تیں۔ تحقیق وہ سمیع اور بصیر ہے۔ لیکن اس آیت سے تو مجھلاً اتنا ہی ثابت ہوا کہ ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ سے بیت المقدس تک سیر کی۔ قصہ معراج تو بہت طویل ہے۔ اس میں تو آسمانوں اور عرش بلکہ اس سے بھی اوپر تک سیر کا مذکور ہے۔ اس لئے تلاش کے بعد سورہ نجم کو بھی بغرض تصدیق شامل کر لیا۔

اب علماء میں بحث کا موضوع یہ تھا کہ معراج جسمانی تھا یا روحانی۔ چونکہ اسی سورہ بنی اسرائیل میں تشریح ہے کہ

”وما جعلنا الریاء لک الا لک اذ فتنتہ لکنا“ (۱۵)

اس لئے اکثر علماء نے معراج روایا ہی میں تسلیم کیا۔ لیکن بعض نے جسمانی ہی سمجھا۔ چنانچہ علامہ نسفی کی یہی رائے ہے۔

تفتازانی شرح میں لکھتا ہے کہ

”مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک تو سیر نص قرآنی سے ثابت شدہ

ہے۔ مگر زمین سے آسمانوں میں جانا مشہور حدیث سے ثابت ہوتی

ہے۔ اور آسمان سے جنت یا عرش عظیم یا دوسرے مقامات تک

جانا ”خبر احاد“ ہے۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو

الہی بصر سے نہیں بلکہ بصیرت دیدہ دل سے کی۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ احادیث ”خبر احاد“ حجت شرعی نہیں ہوتی۔

اور ایسی خبر پر یقین کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی آیات سے

جن کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ قصہ معراج کے بارہ میں کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا ہے آیت

زیر بحث سورہ ”اسری“ میں جن کا دوسرا نام سورہ بنی اسرائیل ہے واقع ہوتی

ہے۔ اس آیت کے الفاظ میں تدبر کرنا چاہیے۔

۱۔ "اسرئیل" کے معنی ہیں رات کا سفر۔ یہ لفظ قرآن کی دیگر آیات میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ اس کے ساتھ "لیل" بھی آیا ہے۔ اس لئے اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ لیل و نهار میں بہت فرق ہے۔ چنانچہ انہی آیات زیر بحث کے آگے ارشاد ہے کہ "وجعلنا لیل و النهار آیتین، فجعلنا لیل و النهار آیتاً، النهار مبصرٌ لیل و نهار آیتین، فجعلنا لیل و النهار آیتاً" (۱۵)

رات خواہ کتنی ہی چاندنی ہو دن کی طرح "مبصرہ" نہیں ہوتی۔ اس لئے جن آیات کا مشاہدہ آنحضرتؐ کو رات کے وقت کرایا گیا وہ رات ہی کے مناسب آیات تھیں۔

۲۔ مسجد الحرام پر بحث تحصیل حاصل ہے کیونکہ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ کعبہ ہے اور قرآن کی دیگر آیات میں بھی اس سے کعبہ ہی مراد ہے۔ یہ بھی قابل انکار حقیقت ہے کہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے پلوٹھے بیٹے اسمعیل نے کی۔ کیونکہ قرآن ہی میں اس کا مذکور ہے۔ اور یہ کہ ملت ابراہیمی کا یہ مرکزی مقام ہے۔ چونکہ اس کی تولد حضرت اسمعیلؑ کے حصہ میں آئی۔ اس لئے ذریت ابراہیم بنی اسماعیل کا یہ قومی اور مذہبی یا ملی مقام رہا۔

مسجد الحرام کی نسبت ارشاد ہے کہ

"ان اول بیت وضع للناس للذي ببكة، مبارکاً وهدى للعلمین"

فہا آیت بیت مقام ابراہیم و من دخلہ کان امناء (۱۶)

۳۔ مسجد الاقصیٰ پر بھی بحث تحصیل حاصل ہے کیونکہ اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ بیت المقدس ہے جو کسی وقت بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کا مرکزی قومی اور مذہبی مقام تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اس کی تعمیر شروع کی۔ غرض یہ تھی

نماز کی توجہ کا مرکزی مقام ہوتا کہ آپس میں پھوٹ نہ پڑے۔ بارہ قبائل میں سے
دس قبائل بغاوت پر آمادہ تھے۔ بیت المقدس کی تکمیل حضرت سلیمان ابن
داؤد نے کی۔

قرآن میں بھی اس کی تعمیر کا یہی مقصد بیان کیا گیا ہے جو داؤد علیہ السلام
کے پیش نظر تھا۔

”وما جعلنا القبلة التي كنت عليها الا لنعلم من يتبع الرسول
ممت يتقلب على عقبيه“ (۳)

اور ہم نے (اس عمارت کو جو داؤد نے تعمیر کی) قبلہ (نی الحقیقت) قرار نہیں
دیا تھا۔ جس پر تو پہلے تھا۔ غرض اس سے یہ کلمی کہ ہم چاہیں کون رسول
(داؤد) کا اتباع کرتا ہے۔ ان میں سے جو اپنے پاؤں پر الٹا پھر جاتا ہے۔
قرآن میں بوجہ مسجد الحرام مکہ کو مبارک اور ہدی للعالمین کہا گیا ہے مگر
مسجد اقصیٰ کو مبارک نہیں کہا گیا۔ مبارک اس زمین کو کہا گیا جس میں یہ واقعہ (جولہ)
اس کی وجہ ہے یہ کہ اس زمین کو ارض معہود کہتے ہیں۔ جس سے عہد برکت والیستہ
ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے باندھا تھا کہ

”میں یہ زمین (ارض شام) قیری ذریت کو ہمیشہ کے لئے دوں گا۔“

اس کو اصطلاح اہل کتاب میں ”عہد برکت“ سے موسوم کیا گیا ہے اور اسی عہد
کی طرف اکثر اشارہ آیات قرآن میں ہے۔

او فو لعہدی اعد بعہدکم (۴)

یہ وعدہ مشروط ہے۔ قرآن میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم
کو بشارت دی کہ

”انی جا علیک للناس اماما، قال ومن ذریعتی، قال لا ینال

عہدی النطالین“ (۵)

”میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ غرض کی اور میری ذریت بھی۔ فرمایا کہ میرا

عہد ظالموں تک نہیں پہنچتا۔

بیت المقدس کی مختصر تاریخ جیسا کہ صحت انبیاء میں مذکور ہے یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس کی تعمیر شروع کی اور اس کو "خدا کا اور سلطنت کا گھر" سے موسوم کیا۔ اس سے پیشتر تابوت سکینہ جس میں الواح توراہ اور دیگر تبرکات موسوی تھے مقدس خیمہ میں تھے اس عمارت میں منتقل کئے گئے۔ حضرت سلیمان نے اس کی تکمیل کی۔ اس شان کا معبد آج تک تعمیر نہیں ہوا۔ حضرت سلیمان کی وفات تک دس قبائل دبے رہے۔ لیکن وفات کے بعد جب ان پر منکشف ہوا کہ بنیاد حکومت کھوکھلی ہو چکی ہے اور عصا سیاست کو گھن کھا چکا ہے تو علم بناوٹ بلند کر دیا۔ اور سامریہ میں اپنا علیحدہ دارالحکومت اور معبد تعمیر کیا۔ یہ اسرائیلیوں کا قبلہ اور بیت المقدس یہودیوں کا قبلہ قرار پایا۔ سامریہ میں "اسرائیلیہ" اور یروشلم میں "یہودیہ" سلطنت ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ حضرت یعقوب کا دوسرا نام اسرائیل ہے۔ آپ کے بارہ بیٹوں کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی۔ چوتھا بیٹا "یہودا" تھا۔ اس کی اولاد یہودی کہلاتی۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ اور حضرت مسیحؑ یہودی تھے۔ دونوں حریف سلطنتوں میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہیں اور دونوں کمزور ہو گئیں۔ شیشک نے اسے تباہ کیا۔

(۱) شاہان ۲۱ - ۲ - تواریخ ۳۳)

یوآش شاہ یہودیہ نے مرمت کی (۲) شاہان ۱۶ - ۲ - تواریخ ۲۲)

باپلی بادشاہوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی اور جلا کر خاک سیاہ

کر دیا (۲) شاہان ۲۵ - ۲ - تواریخ ۳۶) پھر از سر نو تعمیر ہوئی -

(عزرا ۳) یہ واقعہ اسیری بابل کے بعد ہے۔ رومیوں نے اسے جلا کر خاک

کے برابر کر دیا اور تمام تبرکات بھی ضائع ہو گئے۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں رومی اس پر قابض تھے۔ اور یہودی بے جا نماں آوارہ
گردھے۔

ان واقعات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ بیت المقدس بنی اسرائیل کا تھوڑے
عرصہ کے لئے وہ بھی جبراً قبضہ رہا۔ اور یہ کہ کبھی مبارک ثابت نہیں ہوا۔ لیکن
مسجد الحرام آج بھی حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے مبارک اور "ہدی للعلین"
ہے۔

آیات زیر بحث میں اس سیر کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ کچھ آیات کا مشابہ
کرایا جائے۔ یہ آیات ظاہر ہے کہ ایسی ہی ہو سکتی ہیں جن کا تعلق ان دونوں
مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ سے ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مسجد الحرام کی
تعمیر خود بانی ملت حضرت ابراہیمؑ نے کی۔ اور یہ کہ بیت المقدس کی حیثیت قبلہ کی
نہ تھی بلکہ بنی اسرائیل کی قومیت کا مرکز حضرت داؤدؑ نے قرار دیا۔ پھر حال یہ دو
مرکز حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کے تھے جو بعد میں بنی اسمعیل اور بنی اسرائیل کہلائے
بنی اسرائیل کے حق میں عہد برکت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے
باندھا پورا نہ ہوا۔ جب تک توراہ کا نزول نہ ہوا۔ ان کو ارض شام جس کو توراہ میں
جنت ارضی کہا گیا ہے ملنے والی تھی۔ جہاں ان کی ملوکیت قائم ہونے والی تھی
اس کے انتظام کے لئے ایک ضابطہ آئین و قوانین کی بھی ضرورت تھی۔ اس لئے
آیات زیر بحث کے بعد ارشاد ہے کہ

"وَاتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ أَخَذُوا
مِن دُونِي وَعِيْدَةً (۱۵)

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی اور اسے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت
(نامہ) بنایا یہ کہ میرے سوا تم کسی میرے غیر کو اپنا کارساز نہ بناؤ۔"
اس کے بعد ارشاد ہے کہ

"وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ -
(۱۵)

”اور ہم نے کتاب (صحف موسیٰ) میں قلمی فیصلہ کر دیا تھا کہ تم ضرور روزِ وفات
ارض (معهود) میں فساد برپا کرو گے۔ اور اس کی پاداش میں تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے
اور تمہیں پیش از وقت آگاہ کر دیا گیا تھا کہ“

”فاذا جاء وعدنا لعننا علیکم عبادنا اولی باسین شداید

فجاسوا حلال الدیار وکان وعدنا مقعولاً“ (۱۵)

”جب پہلے وعدے کے پورے ہونے کا وقت آیا۔ ہم نے تمہارے خلاف
اپنے ایسے بندے اٹھا کھڑے کئے جو (اس وعدہ کی تکمیل کریں اور) سخت جنگجو تھے
پس وہ تمہارے گھروں میں گھس گئے۔“

یہ واقعہ بطور پیش گوئی تورات (المثنیٰ ۲۷-۲۸) میں کہا گیا ہے۔ یہ وعدہ اس وقت
پورا ہوا جب بابلیوں نے یروشلم پر حملہ کیا۔ اس وقت شاہ یہودیہ صدقیہ تھا۔ شاہ
بابل بخت نصر نے یروشلم کو محاصرہ میں لے لیا۔ اور تسخیر شہر کے بعد تمام باشندوں
کو اسیر کر کے بابل لے گیا۔ شاہ یہودیہ کے لڑکوں کو اس کے سامنے قتل کیا اور شاہ
کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اور باندھ کر بابل میں لے گیا۔ اس واقعہ کے چند سال بعد بابلی
پھر یروشلم میں آئے۔ اور بیت المقدس اور امران کے تمام محلات کو آگ لگا کر تباہ
کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۔ شاہان ۲۵ میں مفصل مذکور ہے۔

بنی اسرائیل ستر سال بابل میں اسیری کچن بسر کرتے اور اکثر گریہ و زاری اور
توبہ کرتے رہے۔ آخر ان کے دن پھرے۔ کینخسر و شاہ ایران نے بابل پر حملہ کیا۔
اسرائیلیوں نے بھی اس سے ساز باز کر رکھی تھی۔ اس لئے تسخیر بابل کے بعد ان
کو بھی آزادی ملی اور پھر سے ارض معہود میں آباد ہوئے اور پھر سے بیت المقدس
کی تعمیر کی۔

دوسرے وعدہ کے متعلق ارشاد قرآن ہے کہ

”فاذا جاء وعد الاخرى لیسورا و جوھلک و لیدخلوا المسجد کما دخلوا

اول مرۃ و لیتبروا ما علوا تتبیراً“ (۱۶)

”پس جب آیا دوسرے وعدہ کے پورے ہونے کا وقت تو (رومیوں نے) تمہارا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اور جس طرح پہلی دفعہ مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہوتے ہو اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اسی طرح دوسری دفعہ داخل ہو کر سب کچھ تہس نہس کر دیا۔“

اس واقعہ کا مذکور بطور پیش گوئی توراہ (المثانی باب ۲۸) میں مذکور ہے۔

”تیرا خداوند خدا تیرے خلاف ایک قوم دور سے زمین کے دوسرے

کنارہ سے اس تیری سے لائے گا۔ جیسے عقاب بھپٹتا ہے۔ ایک قوم

جس کی بولی سے تو بالکل ناواقف ہوگا۔ ایک قوم جو درشت رو ہوگی

جو بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر رحم کرنا نہیں جانتی۔“ (المثانی ۲۸)

بابی اسرائیلیوں کے ہم نسل ام سامیہ تھے اور ان کی زبان سے اسرائیلی واقف

تھے۔ بلکہ حضرت ابراہیم کی زبان یہی تھی جو بابلی بولتے اور یہاں سے آپ نے ہجرت

ارض کنعان (فلسطین) کی طرف کی۔ لیکن رومی زبان (لاطینی) سے اسرائیلی واقف

نہ تھے۔ رومیوں کے علم پر عقاب کا نشان بھی تھا۔ رومیوں نے اسرائیلیوں کو

ارض مقدس سے بالکل بے دخل کر دیا اور یہ کرہ ارض پر آوارہ گرد ہوتے۔ المثانی

باب ۲۸ میں ان تمام مصائب کا بیان ہے جو ان حالات میں اسرائیلیوں کو

برداشت کرنی تھیں اور کہیں۔ ان حالات میں ان کا واحد چارہ کار ”البتی“ تھا۔

جس کا مذکور المثانی ۱۸ میں ہے۔

”خداوند خدا نے فرمایا کہ میں تیرے بھائیوں (بنی اسمعیل) سے ایک

بنی تیری مثل مبعوث فرماؤں گا۔ اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں

گا اور وہ بلفظ من وعین ان سے وہی کچھ کہے گا جو میں اسے امر (وحی)

کروں گا اور ایسا ہوگا جو کوئی میرے کلام پر جو وہ (البتی) میرے نام

پر کہے گا۔ کان نہ دھرے گا۔ تو اس کا حساب میں اس سے لوں گا۔

(ان علینا حسابہما) لیکن بنی اسرائیلی بات میرے نام سے کہے

جو میں نے امر نہیں کی اور دوسرے مسبو ووں کے نام پر بات کہے
 تو یہ نبی مارا جاتے گا۔ (ولو تقول علينا بعض الاقاويل لاخذنا
 منه باليمين ۵ ثم لقطعنا منه الوتين ۵ فما منكم من
 احد عنه حاجزين ۵ وانه لتذكرن ۵ التتقين ۵ ۲۹)۔ اور اگر
 تو اپنے دل میں کہے کہ ہم کیسے جانیں کہ وہ کلام خداوند خدا کا نہیں ہے۔
 جب نبی خداوند خدا کے نام پر کوئی بات کہے اور وہ پوری نہ ہو تو وہ وہی
 بات ہے جو خداوند خدا نے نہیں کہی۔ نبی نے اپنی طرف سے کہی ہے
 تو اس سے مت ڈرو۔ (المثانی ۱۸)

نبی اسرائیل کو بخوبی علم تھا کہ مثیل موسیٰ ہی ان کا واحد چارہ کار ہے۔ اور
 جب ارض مقدسہ سے بے دخل ہو گئے بلکہ محکومی کی حالت میں اس کا بیہیری
 سے انتظار کر رہے تھے۔ مگر مسیح کے زمانہ میں غلط فہمی سے یہ سمجھتے رہے کہ
 مثیل موسیٰ ہم ہی سے مبعوث ہو گا۔ لیکن مسیح نے واضح الفاظ میں کہ دیا کہ
 تم مسیح کی نسبت یہ کس طرح کہتے ہو کہ وہ داؤد کی نسل سے
 ہو گا جب کہ خود داؤد و جیاس کو اپنا سردار کہتا ہے۔ (زبور ۱۳۱)
 زبور کے الفاظ یہ ہیں کہ

خداوند خدا نے میرے سردار کو لیا کہ میرے واسطے ہاتھ پر بیٹھ تاکہ میں
 تیرے دشمنوں کو تیرے پاؤں کی چوکی بناؤں گا۔ جب داؤد اس کو
 اپنا سردار کہتا ہے تو اس کا بیٹھا کیسے ہو گا۔ (متی ۲۲)

اہل کتاب کی اصطلاح کے مطابق ہر ایک نبی مسیح تھا۔ اور خدا کا مسح
 کہلانا اور واجب الاحترام تھا۔ (زبور ۱۰۵) مسیح کے متعلق تو بیت (احبار
 ۱۴ وغیرہ) میں مفصل ہدایات ہیں۔ مسیح صرف نبی ہی نہ تھا بلکہ ہر ایک شے
 مثلاً بیت المقدس کے برتن وغیرہ اور مقدس مقامات اور جو شے ان سے وابستہ
 ہو۔ انہی کو لسان قرآن میں شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ جن کا احترام واجب ہے لیکن

جس مسیح (النبی) کا انتظار یہود کو تھا وہ عیسے نہ تھے۔
 اسی غلط فہمی کی وجہ تھی کہ یہودیوں نے حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ سے سوال
 کیا کہ آیا تو وہ "النبی" ہے جس کا انتظار حسب پیشگوئی موسیٰ ہو رہا ہے۔ دونوں نے
 انکار کیا۔

حضرت یحییٰ سے سوال کیا گیا کہ کیا تو الیاس ہے؟ آپ نے انکار کیا، پھر
 پوچھا کہ کیا تو النبی ہے؟ آپ نے انکار کیا۔ اور "المسیح" کے بارہ میں سوال کیا گیا
 تو فرمایا کہ میں نہیں ہوں (یوحنا ۱: ۲۰)۔
 پیشگوئی جو صحت انبیاء (ملاکی ۳: ۱، یوحنا ۱: ۲۱) میں مذکور ہے اس کے
 رو سے یروشلم کی تباہی سے پہلے جس کا مذکور تورات میں ہے الیاس اور مسیح کا آنا
 ضروری تھا۔

حضرت عیسے سے جب یہ سوال ہوا تو آپ نے کہا کہ مجھے الیاس ہے۔ اور
 آپ یہود مسیح تھے۔ آپ کی بعثت کے بعد یروشلم تباہ ہوا۔ اب صرف النبی کا انتظار
 باقی رہ گیا۔ تورات کی پیشگوئی (امثانی ۲۳: ۱۸) کے مطابق النبی امی ہوگا۔ اہل کتاب
 یعنی اسمعیل کو "امی" کہتے کیونکہ وہ غیر اہل کتاب تھے۔ اور ان میں کوئی بنی مبعوث
 نہ ہوا تھا۔ یا اس لئے کہ "مکہ" ام القریٰ ہے۔ اور اس لئے بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 پر صنانہ جانتے تھے۔ اس انتظار میں یہود مدینہ منورہ کے نواح میں آباد ہو گئے
 تھے۔ جسے اب مدینہ کہتے ہیں اس کا پرانا نام "یثرب" تھا۔ اور اسی جگہ حضرت موسیٰ
 مصر سے فرار کے بعد پناہ گزین ہوئے اور یہاں دس سال رہائش رکھی۔ مثیل موسیٰ
 بھی ہجرت کے بعد اسی جگہ دس سال قیام ضرور تھا۔

جب آنحضرت نے یہود کو دعوت اتحاد دی تو وہ فراموش کر چکے تھے کہ ان
 کے بزرگوں کو کس کا انتظار تھا۔ ان پر پھر قومی تعصب کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔
 جب آنحضرت نے یہ بتایا کہ اگر وہ بات جو میں وحیا کہہ رہا ہوں ایسی بات ہے
 کہ میں اپنی طرف سے کہتا تو ضرور تھا کہ وہ پوری نہ ہوتی اور میں مارا جاتا تو یہوش

جواب دیا کہ موسیٰ ہمیں پہلے ہی متنبہ کر چکا ہے کہ سناحروں کی بات بھی پوری ہو جایا کرتی ہے۔ یہ اشارہ توراہ (المثنیٰ ۱۳۱) کی طرف ہے۔

”اگر تم میں کوئی مدعی نبوت مبعوث ہو یا رویا کا دیکھنے والا اور تمہیں کوئی نشان دکھائے اور وہ پورا بھی ہو جائے اور تمہیں کہے کہ غیر اللہ کا اتباع کرو جن کو تو نہیں جانتا اور اس کی بندگی کریں تو اس کی بات نہ سن..... اور یہ مدعی نبوت یا رویا دیکھنے والے کو قتل کیا جائیگا“

آنحضرتؐ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ

”اگر میں جھوٹا بنی ہوتا تو ضرور تھا کہ تمہیں غیر اللہ کی طرف دعوت دیتا۔

میں تمہیں تمہارے آبائی دین ملت ابراہیم اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ یہ سحر ہے۔ تم کہتے ظالم ہو۔ موسیٰ کی پیشگوئی اور عیسیٰ کی بشارت کے مطابق میں بیانات کے ساتھ مبعوث ہوا

”قالوا هذا سحر صبین، ومن الظالمون، افترى على الله الكذب

وهو يدعى الى الاسلام، والله يهدي القوم الظالمين“ (۲۸/۹)

آنحضرتؐ کے عہد میں ارض شام پر رومیوں کا قبضہ تھا۔ اب وہ وقت آگیا تھا

کہ ”تمہاری برکت بنی اسماعیل کے حق میں پورا ہو۔ اور یہ نزول قرآن کے بعد ہی پورا

ہونا تھا جیسے اسرائیلیوں کے حق میں نزول توراہ کے بعد پورا ہوا۔ خہار برکت

صرف ارض فلسطین کے متعلق نہ تھا۔ بلکہ اس میں وہ تمام زمین شامل تھی جو دریائے

نیل سے فرات اور دجلہ تک تھی۔

توراہ کتاب نکوین ۱۵۱ میں اس کے حدود بیان کیے گئے ہیں بنی اسماعیل

کو عرب کا ایک حصہ ارض حجاز و حجر پہلے ہی مل چکا تھا۔ بنی اسماعیل کو نزول توراہ

کے بعد ارض فلسطین ملی اب عہد برکت کا تمام علاقہ دریائے نیل سے و جدہ تک

بنی اسماعیل کو ملنا تھا۔ نزول قرآن کے بعد یہ وہاں بھی پورا ہوا۔ آیات حواریہ کے

کے بعد ارشاد ہے کہ

انّ هذ القرات یهدی لقی ہی اقوم ویبشرا المؤمنین (۱۱)
تحقیق یہ قرآن راہ دکھاتا ہے جو راست ترین ہے اور بشارت دیتا ہے ایمان
والوں کو (کہ عہد برکت ان کے حق میں پورا ہوگا)

حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد آپ کا خلیفہ لشوع ارض فلسطین پر قابض
ہو گئے۔ اُن حضرت کی وفات کے بعد آپ کا خلیفہ صدیق اکبر قابض ہو گئے۔
یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ آنحضرت کی مماثلت حضرت موسیٰ سے بلحاظ
عہد برکت ہے۔ بحیثیت رسول اور نبی تو ہر ایک رسول اور نبی کے مثل تھے۔

غرض یہ ایک روایا تھا جو حضرت موسیٰ کو آپ کی قوم بنی اسرائیل کے آئندہ

حالات کے بارہ میں دکھایا گیا۔ اور یہی روایا آنحضرت کو بھی دکھایا گیا جس میں آپ
کی قوم بنی اسمعیل اور اہل اسلام بالخصوص اور کل عالم انسانی کے حالات دکھائے
گئے۔ جاوید راجل

یہ ایک مستقل موضوع ہے اس پر مفصل بحث کی گنجائش اس مقام پر نہیں۔

سورہ بنی اسرائیل اول سے آخر تک پڑھ جاؤ کسی آیت میں قصہ معراج موضوع

مبیینہ کی نسبت اشارہ بعید بھی نہیں۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ یہ روایات زرتشتی
ہیں۔ جس کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ اس لئے اس کو عقیدہ میں داخل کرنا بے معنی
ہے۔

۵۔ خلافت اور امامت پر بھی علامہ نسفی اور علامہ تفتازانی نے ان کو عقیدہ میں

داخل کرتے ہوئے بحث کی ہے۔ خلافت اور امامت دراصل ایک ہی

حقیقت ہے۔ امامت کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب بنو ہاشم

خلافت کے دعویٰ سے یا یوسانہ دست بردار ہو گئے تھے۔ ہم اس موضوع

پر بحث کر چکے ہیں۔

مذاہب اسلامیہ میں سے خوارج یہ کہتے ہیں کہ خلافت شرعاً جائز مگر واجب

نہیں اور خلیفہ ہر ایک مومن مسلمان ہو سکتا ہے۔ ضرور نہیں کہ قریش سے ہو۔ امامیہ اور

اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ خلافت اور امامت کا تقرر بذریعہ "نص" واجب ہے۔
 "نص" سے ان کی یہ مراد ہے کہ یا تو نص قرآنی سے کوئی خلیفہ یا امام مقرر ہو
 یا اس طرح مقرر شدہ خلیفہ یا امام اپنے جانشین کے حق میں تقرر کی وصیت کرے
 تاکہ امت میں تنازعہ واقع نہ ہو۔

معتزہ کہتے ہیں خلیفہ معقول و جود پر منتخب ہونا چاہیے۔ اکثر زیدہ بھی
 یہی کہتے ہیں۔ ان کی مراد یہ ہے کہ خلیفہ یا امام میں خاص خاص اوصاف نسبتاً بڑھ
 چڑھ کر ہونی چاہئیں۔ ان کا مذکور ہم کر چکے ہیں۔

اہل سنت و الجماعت کہتے ہیں کہ خلیفہ یا امام قریش سے ہو مگر اس کا تقرر
 مسلمانوں کی اکثریت کر سکتی ہے جیسے صدیق اکبر کا انتخاب ہوا۔ یا خود خلیفہ مقرر
 شدہ اپنے جانشین کے حق میں وصیت کرے۔ جیسے فاروق اعظم کے حق میں
 صدیق اکبر نے کی یا شوری انتخاب کرے جیسے حضرت عثمان منتخب ہوئے۔
 علامہ تفتازانی اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

یہ کیوں جائز نہیں کہ ہر ایک ملک میں ایک ایک صاحب اقتدار
 جماعت اپنے اپنے ملک کا نظم و نسق خود کریں اور اس طرح تمام
 جماعتوں پر واحد شخصیت کی حکومت کی ضرورت نہ رہے۔
 اس کے جواب میں آپ کا ارشاد ہے کہ اس طرح تنازعات جنگ و جدل کی
 صورت دینی اور دنیوی امور میں پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ اور ہم اپنے زمانہ میں یہی
 صورت دیکھ رہے ہیں اور اس کا نتیجہ بھی مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ جو غرض و غایت خلافت یا امامت کی ہے وہ ویسے بھی
 کسی صاحب حکومت کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے۔ خواہ اسے ہم خلیفہ یا امام
 نہ بھی کہیں۔ تو علامہ کا جواب یہ ہے کہ یہ صورت موجودہ ترک کی حکومت کے مشابہ
 ہوگی۔

علامہ اتنا تسلیم کرتا ہے کہ جہاں تک دنیوی امور کا تعلق ہے کام اس طرح

بھی بخوبی چل سکتا ہے۔ لیکن دینی امور جن کی اہمیت بڑھ چڑھ کر رہے درست حالت میں نہیں رہ سکتے۔ ان میں بد نظمی اور خرابی واقع ہوگی۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ خلافت تو صرف عام عقیدہ کے مطابق صرف تیس برس بعد وفات آنحضرتؐ رہی۔ اور خلیفہ اور امام ایک ہی شخصیت تھی اس لئے اگر بطور عقیدہ یہ واجب امر ہے تو آج تک اس کا وجود عملاً ثابت نہ ہوا۔ اور اس طرح تمام دنیا پر اسلام گنہگار ٹھہرے گی۔

اس کا جواب علامہ یہ دیتا ہے کہ امام میں یہ نسبت خلیفہ عمومی کا مفہوم ہے۔ اس لئے خواہ خلافت ختم ہو گئی مگر یہ ضرور نہیں کہ اس کے ساتھ امامت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

علامہ تفتازانی کا یہ مطلب ہے کہ فرائض امامت میں فرائض خلافت بھی شامل ہیں۔ اور ایک ہی شخص کا فرض ہے کہ دونوں فرائض سرانجام دے۔ اگر ایک ادا نہیں کر سکتا تو دوسرا ہی سہی۔ اس لئے کہتا ہے کہ سوائے فرقہ شیعہ کے کوئی فرقہ ان اصطلاحات میں خلافت کو عمومی نہیں دیتا۔ اس لئے وہ خلافت کو اماموں میں محدود سمجھتے ہیں۔ چونکہ تفتازانی خلافت عباسیہ پر حق سمجھتا ہے۔ اس لئے ان کے بعد مسئلہ خلافت کی نسبت لکھتا ہے کہ اس میں اشکال ہے (PROBLEM) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ تفتازانی ایک عقیدہ کی وجہ سے مغالطہ میں الجھ پڑے۔ بارت یہ ہے کہ ہر ایک فرقہ نے اپنے اپنے عقیدہ کی تائید میں ایک دو حدیثیں کہیں سے نکال ہی لیں۔ یہ بھی ایک حدیث ہے کہ خلافت تیس برس رہے گی۔ اس کے بعد طو کیت ہوگی۔ اس حدیث کی زد خلافت بنو امیہ پر پڑتی ہے لیکن جب خلافت امویہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور خلافت بنو ہاشم (عباسیہ) قائم ہو گئی تو ایک اور حدیث شائع ہوئی۔ یہ ایک طولانی دعا ہے جو آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ کے حق میں کی۔ اس کا ایک ٹکڑہ یہ ہے کہ واپحل الخلافت باقیہ عقبہ یعنی خلافت اولاد عباس میں باقی رہے۔

ظاہر ہے کہ اگر خلافت صرف تیس برس رہی اور اس کے بعد ملوکیہ کا دور شروع ہوا تو بنو امیہ کی طرح بنو عباس بھی ملوک ہی تھے۔ دونوں حدیثوں میں مطالبقت پیدا کرنے کے لئے تیس سالہ خلافت کو "راشدہ" سے موسوم کیا گیا اور بنو عباس کو بھی خلافت ہی ملی مگر وہ شانِ رشد اس میں نہ تھی چونکہ بنو امیہ کے چالیسین بنو ہاشم ہوئے اس لئے بنو امیہ ملوک ہی رہے اور انہی کو خلافت سے خارج کرنے کے لئے یہ حدیث وضع ہوئی۔

ابو منصور بغدادی اپنی کتاب "فرق بین الفرق" میں جن فرقوں کو ہمارے خارج از اسلام قرار دینا ہے تائید میں ایک دو حدیثیں بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً فرقہ قدریہ اور مرجئیہ کے بارہ میں یہ حدیث ہے کہ دونوں پر لاکھ لعنت بھیجتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ "مرجئیہ پر سترائے لعنت کرتے ہیں"۔ اصحاب نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ مرجئیہ کون ہے؟" فرمایا کہ "وہ جو ایمان صرف اقرار باللسان کہتے ہیں"۔ ابن تیمیہ نے پوری حدیث روایت کی ہے اس میں مورد لعنت مرجئیہ اور قدریہ دونوں ہیں۔ ان کے پاس بھی جو اب میں احادیث تھیں۔ لیکن یہ بحث سروسٹ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

تفتازانی کے عقائد میں سے قابل توجہ یہ ہے کہ خلیفہ یا امام ایک ہی تمام دنیا اسلام میں ہونا چاہیے۔ تاریخی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ صورت بہت تھوڑے عرصے تک رہی جو بات ناممکن العمل ہو وہ خلاف فطرت ہے اس لئے اسلامی عقیدہ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں قرآن کی شہادت اس مسئلہ کے بارہ میں بالکل صاف ہے۔

وان طایفتن من المؤمنین اقتتوا فاصلحو بینہما فان بغت احدہما علی الاخری فقاتلوا الّتی تبغی حتی تفرّی الی امر اللہ فان فاءت فاصلحو بینہما بالعدل واقسطوا ان اللہ مع المتقین ۵ انما المرسلون اخوة فاصلحو بینکم انذرتکم انفسکم ترحمون ۵ (۲۶)

”اور اگر مومنوں کی دو جماعتوں میں لڑائی پھڑ جائے تو ان میں صلح کرادو اور اگر ایک جماعت دوسرے پر (شرائط صلح ٹھکر کرے) چڑھ آئے تو اس سرکشی کرنے والے سے مل کر لڑو یہاں تک کہ وہ حکم الہی (دوبارہ صلح) کو مان لے۔ پس اگر مان لے دونوں میں عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو۔ اللہ انصاف کرنے والے کو پسند فرماتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں تو بھائیوں میں صلح کرادو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔“

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ حکومت کسی ایک شخص کے ہاتھ میں جبکہ جماعت میں الوان و لسان و نسل کا امتیاز ہو۔ نہیں رہنی چاہیے۔ اور عقلاً بھی مذموم ہے۔ ایرانی کب عرب کی سیادت تسلیم کریں گے اور افغان کب ایران کے تحت رہنا پسند کریں گے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہر ایک ملک اور قوم کی علیحدہ علیحدہ خود مختار حکومت ہو۔ لیکن ان سب کو ایک رشتہ اخوت میں منسلک رہنا چاہیے۔ ان کی ایک بین الاقوامی مجلس ہو جو ان کے تنازعات کا عدل و انصاف سے فیصلہ کرے۔

علامہ تفتازانی نے اسی بات کہی ہے کہ اگر علیحدہ علیحدہ حکومت ہوگی تو باہم لڑیں گے۔ کچھ شک نہیں کہ لڑائی کی صورت بھی ان میں پیدا ہوگی مگر اس کا سدباب آیات محولہ بالا میں کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ایک ہی حکومت ہو تو ضرور ہے کہ ملک کے طول و عرض میں عام بغاوت ہو۔ چنانچہ خلافت عباسیہ کے دور دورہ میں ایسا ہی ہوتا رہا۔ اور اب بھی بعض قوموں کے سر میں سودائے ملک گیری سمایا ہوا ہے۔ اور وہ تمام کرہ ارض پر کم از کم اپنا اقتدار جمانا چاہتی ہیں اور کبھی نہ خود چین سے بیٹھیں اور نہ کسی کو چین لینے دیا۔ اول تو نظریہ حکومت جیسا کہ قوموں کے ذہن میں ہے قطعاً غیر اسلامی ہے۔ خوارج نے اتنا تو سمجھ لیا کہ ”الحکما للہ“ اور آیات قرآن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کا حق صرف ذات الہیہ کو ہے۔ ارشاد قرآن ہے کہ

”الدلائل الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین ؕ (۱۱۶)“

”سُن رکھو کہ بند کرنا اور پیدا آتش کا مقصد ٹھہرانا صرف اللہ کے لئے جو تمام کائنات کی ربوبیت برکات سے فرماتا ہے۔“

انسان تو ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کر سکتا اور نہ اس کی ربوبیت کر سکتا ہے اس لئے اس کو حق حکومت بھی حاصل نہیں۔ انسان کسی دوسرے انسان پر حکومت کرتا ہے تو اپنے فائدہ کے لئے۔ اللہ تعالیٰ حکومت فرماتا ہے تو مخلوق کے فائدہ کے لئے اور برکات سے مستفیض فرماتا ہے۔ حکومت کا حق اس کو ہے جو قادر مطلق ہو جو چاہے کرے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

”لو کان فیہا الہوتہ الا اللہ لفسدتا فسبحن اللہ رب العرش

عما یصفون ؕ لا یستل عما یفعل و ہما یستلون ؕ (۱۱۷)“

”اگر آسمانوں اور زمین میں اور بھی کوئی اللہ کے سوا ہوتا تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ پس اللہ صاحب تخت حکومت اس شرک سے پاک ہے جو اس سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ چاہے کرے کوئی پوچھنے والا نہیں اور یہ اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں۔“

حکومت کا حق اسے ہے جو آئین و قوانین سے بالاتر ہو۔ اس لئے اس کے افعال کی پریشانی نہ ہو۔ کتنی فرعون و عویٰ انار جبکہ الہ علیٰ کرتے رہے۔ اور ہلاک ہوئے۔ یہ بھی حکومت صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حکومت کی کوئی صورت ہو جو انسان وضع کرتے ہیں۔ اس میں ایک شخصیت ہمیشہ ممتاز نظر آئے گی۔ مگر وہ قانون سے بالاتر نہیں اور نہ اسے اپنے لئے کوئی خاص امتیاز پیدا کرنا چاہیے وہ ایسا ہی ایک فرد قوم ہے جیسے اور ہیں۔ قوم میں علویا برتری کی خواہش موجب فساد ہے۔ نظام معاشرت رکھنے کے لئے انتظامیہ حکومت اس وقت تک واجب ہے۔ جب تک عالم انسانی کی ذہنیت اتنی بلند نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعمال کا آپ ہی واحد ذمہ دار

سمجھے اور علو اور برتری کو مکروہ یقین کرے۔ نہ حاکم نہ ہونہ محکوم ہو۔ آیات قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب ہر ایک قسم کی حکومت ختم ہو جائے گی اور ایک اکیلے اللہ واحد القہار کی ہوگی اور اگر مسلمان سمجھیں تو ہر ایک حکومت کا خواہ یہ دینی ہے یا دنیوی خاتمہ تو خاتم النبیین نے کر دیا۔ یہ انتہائی ذلت انسانیت ہے کہ ایک حاکم اور دوسرا محکوم ہو۔

بیدل بحصول رزق آمادہ بسر
از مخترعات کارگاہ امکان
سنگ چاکر سنگ نگشت و خربندہ خنر
این سنگ شعور نیست جز صنع بشر
وہ قوم کتنی ذلیل ہے کہ حیوانوں کی طرح بھی ایک جگہ امن سے نہیں رہ سکتے۔

بر عیب خلق خوردہ نگیند محرمات

اے بخیر من و تو خدا نیست بندہ است

مذہب اسلامیہ کی مختصر تاریخ ہم نے بیان کی ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اپنے زمانہ کے مذاہب کے حالات لکھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کی خدمت میں یہ بھی گزارش کریں کہ ان مذاہب اور ان کے بانیوں اور ان مذاہب والوں کو چشم حقارت سے نہ دیکھیں۔

”فکر ہر کس بقدر ہمت اوست“

ہر ایک شخص صداقت کی تلاش میں تھا۔ اور جو کچھ اپنی بصیرت سے معلوم ہوا اس نے چھپا کر نہ رکھا۔ بعض نے قبول کیا اور بعض نے انکار کیا۔ یہی کیفیت تمام علمی اکتشافات کی ہے۔ نظریوں میں اختلاف ناگزیر امر ہے۔ لیکن اس اختلاف میں ارتقا کا راز بھی مضمر ہے۔ انسان ہر ایک زمانہ میں کیا کچھ نہیں کرتا رہا۔ مگر ذہنی اور مادی ترقی بھی مسلسل کر رہا ہے اس لئے تقاضا عقل یہ ہے کہ ہم انسانی غلطیوں کو نظر انداز کریں اور جو بہتر بات ہے تسلیم کریں اور فائدہ اٹھائیں۔

مذہب اسلامیہ میں ہمیں بعض باتیں ایسی بھی ملیں گی۔ جو حق یا حق کے اقرب ہیں۔ ہم سر و دست عقلی فلسفیانہ بحث میں نہ خود دلچستے ہیں اور نہ قارئین کو الجھانا چاہتے ہیں۔ ہر ایک مسلمان کا خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو قرآن عظیم پر

پختہ ایمان ہے۔ اور تمام ائمہ دین بھی یہی کہتے رہے کہ ہر ایک قول اور ہر ایک حدیث کی صحت قرآن پر پرکھی جاسکتی ہے۔ ہم نے جہاں مختلف مذاہب کے عقاید کا ذکر کیا ہے۔ آیات قرآن کی روشنی میں اس پر بحث بھی کی ہے لیکن اسے صرف آخر نہ سمجھا جائے۔ قارئین ممکن ہے کہ بہتر تفسیر یا توجیہ کر سکیں۔ لیکن ہماری عرض صرف اتنی ہے کہ اس اصل اصول کو نہ بھولیں کہ ہمارے پاس قرآن ہی واحد معیار صداقت ہے۔ لیکن قرآن تذکر و تدبر و تفکر کا بھی ہم سے مطالبہ کرتا ہے مثلاً

”اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا“ (پہ)

”کیا یہ قرآن میں تدبیر نہیں کرتے کہ اگر یہ غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں (اور کتاب فطرت میں) اختلاف کثیر پاتے۔“

ہم بحث کر چکے ہیں کہ انسان کے کلام اور انسانی علوم میں واجب ہے کہ اختلاف ہو۔ واجب ہے کہ حکماء کے نظریوں میں اختلاف ہو اگر نہ ہو تو ذہنی ارتقا ختم ہو جاتے گا۔ اس حقیقت پر کل حکماء کا اتفاق ہے کہ یہ قوانین فطرت ہی ہیں جو تبدیل و تحویل نہیں ہوتے۔ لہذا قرآن میں انہیں ”سنت اللہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے مذاہب اسلامیہ میں جو اختلاف ہے وہ آخر انسانی رائے پر مبنی ہے اور اس میں اختلاف واجب ہے۔ جب ہمارے علوم میں بھی اختلاف ہے اور اختلاف واجب ہے تو کوئی شخص اپنی تحقیق کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتا کہ حرف آخر ہے۔

قرآن حکیم کی جو تفسیر بھی لکھی گئی وہ مفسر کے اپنے زمانہ کے علوم اور حالات کے زیر اثر لکھی گئی اور وہی اپنے زمانہ کی بہترین تفسیر بھی ہو سکتی ہے جو مفسر اپنے زمانہ کے حالات کے تقاضا کو سمجھتے ہوئے اس کی گتھی کو سلجھائے۔ اگر کسی کو یہ دعویٰ ہو کہ وہ آئندہ ہر ایک زمانہ کے حالات پر بھی حاوی ہے۔ یا کوئی خوش عقیدہ کسی تفسیر کی نسبت یہ دعویٰ کرے تو خود زمانہ کے حالات جو ہمیشہ بدلتے ہیں اس کی صداقت تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن قرآن ”بلاغ“ اور ”بلغ“ کلام ہے اور

ہر ایک زمانہ کے ذہن پست و بلند تک رسا ہے۔ اس لئے محققین کو آسمان پر بلند پروازی سے پیشتر "کارزمین" کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینا چاہیے۔ آئندہ نسلیں اپنے زمانہ کے حالات سے ہم سے بہتر واقف ہوں گی اور نسبتاً ہم سے ان کے ذہنی درجات بھی بلند تر ہوں گے۔

خوش قسمتی سے مجھے ابتدائی عمر میں بعض اہل اللہ کی صحبت بھی نصیب ہوئی اور میں نے بچپن خود ان کے ایسے حالات بھی مشاہدہ کئے جن کے لئے موزوں لفظ "کرامت" ہی ہے۔ لیکن مجھے ان کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی وہ یہ کہ سنت اللہ تو کبھی تبدیل و تحویل نہیں ہوتی خواہ ہم انہیں "خرق عادت" سے موسوم کریں مگر قوانین فطرت کے تحت ہی ان کا امکان ہے۔ اور بہت کچھ کسب حاصل ہو سکتا ہے کرامات و معجزات کو عقاید میں جگہ دینا مجھے عجیب ہی معلوم ہوتا ہے۔ بعض ائمہ دین نے صاف صاف لفظوں میں کہا کہ "معجزات کا اقرار یا انکار کوئی جزو دین نہیں"۔ معتزلہ نے بلاشبہ تذکر و تفکر سے کام لیا۔ اور یہ تحریک بلاشبہ لائق صد تحسین ہے۔ لیکن عقل سے انسان اتنا ہی کام لے سکتا ہے۔ جہاں تک اس کی رسائی ہے ایسے امور میں جہاں عقل عاجز ہو وہاں عقل ہی کا فتویٰ ہے کہ کوئی رہبر تلاش کرو۔

لیکن

عاقلاً از وضع ضلالت آگہی از کف نداد

بے خبر از کفر ہم بگذشتت و اہل دین نشد

کہتے ہیں کہ ایک گدھا اندھیری رات میں کسی جنگل میں چلا رہا تھا۔ قریب ہی ایک درخت پر آٹو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا کہ میاں گدھے کیوں چھتے چلاتے ہو؟ گدھے نے کہا کہ رات اندھیری ہے۔ مجھے راستہ سو جھاتی نہیں دیتا اور میں نے اپنے گھر پہنچنا ہے۔ آٹو نے کہا کہ چھتے چلانے کی کوئی بات نہیں میں تمہاری رہنمائی منزل مقصود تک کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس کے سر پر آ بیٹھا اور کہا کہ جس طرف کہو ادھر چلو۔ چنانچہ گدھے نے تعمیل کی۔ چلتے چلتے پو پھٹی اور تھوڑی دیر بعد سو درج

افق مشرق سے نمودار ہوا۔ آلو کی آنکھیں چندھیانگتیں۔ اب مناسب توبہ تھا کہ آلو
 میاں اپنی بے بسی کا اظہار کرتے مگر اپنی بسکی محسوس کی کہ رات بہتر رہنمائی کرتا رہا
 اب اگر کہوں کہ آگے راستہ مجھے بھی نہیں سوچھتا تو گدھے کی نظروں میں ذلیل ٹھہروں
 گا۔ اس لئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کسی طرف اندھیرا نظر آئے
 ایک غار منہ کھولے ہوئے دیکھی بدھو میاں کی رہنمائی اسی طرف کی۔ گدھے کو تو تجربہ
 سے یقین تھا کہ آلو ہمہ دان ہے اس لئے اندھا و صند اسی کا کہنا مانا جس اندھیرے
 سے گھبرا کر بچنا چاہتا تھا آخر اسی میں گھر گیا۔
 استدلال عقلیہ عصائے کور ہے۔

چون یقین منحرف افتاد دلائل بالید

راستی رفت کہ ممنون عصایم کروند

"اللہ نور السموات والارضی" اس نور الہی نے کائنات کو جو بذاتہ تاریک ہے
 روشن کر دیا۔ عقل کا کام یہ ہے کہ کائنات کو اسی روشنی میں دیکھے اور اہل عقل و فکر دیکھ
 رہے ہیں۔ ان پر اس کے امکانات جو "الغیب" ہیں منکشف ہو رہے ہیں۔ لیکن عقل
 میں یہ تاب و طاقت نہیں کہ اسے "نور" کا احساس ہو۔

ہمہ عالم بنور اوست پیدا

کجا او گزود از عالم ہویدا

رہا کن عقل را با حق ہی باش

کہ تاب نور ندارد و چشم نحاش

در اں موضع کہ نور حق دلیل است

چہ جائے گفت و گوئے جبریل است

فرشتہ گر چہ دارد قرب در گاہ

نگزود و در مقام لی مع اللہ

بود نور خرو، در ذات انور، بسان چشم سرد چشمہ نور

چو مبصر با مبصر نزدیک گزود بصر ز ادراک او تاریک گزود

چو می گویم کہ هست این نکتہ باریک :

شب روشن میان روز تاریک

”مستزله“ کے عقاید پر ہم مختصر بحث کر چکے ہیں۔ اگر وہ نور خرد سے کائنات

کے پوشیدہ امکات کی تلاش کرتے تو ان پر اس کا انکشاف اسی طرح ہوتا جس

طرح ہمارے زمانہ میں اہل علم و حکمت پر ہو رہا ہے مگر

زہے ناداں کہ او خورشید تابان،

بنور شمع بھوید در سیا بان

انہوں نے ذات و صفات الہیہ کو اپنی بحث کا موضوع بنایا۔

خرد را نیست تاب نور آن رو

برو از بہر خود چشمے و گر جو

اسی استدلال عقیدہ کا کرشمہ تھا کہ نیکے شد فلسفی دیگر حلولی۔ ان فرقوں کے حالات

بھی ہم بیان کر چکے ہیں وہی شہر کوراں اور حدیث فیل کی مثل ان پر صادق آتی ہے

از تعصب جاہلاں وین ہدی را دشمن اند

عاقبت در جنگ این کوراں عصا خواہد شکست

دین کی غرض تو ہدایت ہے۔ اس کو اپنی اغراض کی تکمیل کا آلہ کار بنانا کہاں

کی عقل مندی ہے۔ غرض ہدایت ہے تو ہر ایک شخص اس سے حاصل کر سکتا ہے

کسی اچھے بھلے مسلمان کو کافر اور مرد قرار دینا اس مفروضہ پر کہ وہ کسی کافر کے

خود ساختہ عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتا، غیر اسلامی روش ہے۔ اس گمراہ کن نفسانی

جذبہ سے علیحدہ ہو کر اگر ہم عقاید کا جائزہ لیں تو ان میں کچھ اچھی باتیں بھی ملیں گی

ویسے ولاتل کا میدان وسیع ہے۔

عقل ہر چند جز فضائل نیست

جہل ہم خالی از ولاتل نیست

الحمد للہ کہ اب ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں کہ عقاید کی باہمی
 لڑائی اگرچہ ختم نہیں ہوتی۔ مگر اس میں وہ اگلی شدت نہیں اور آثار پائے جاتے
 ہیں کہ یہ قریب تر زمانہ میں ختم ہو جائیں گے۔
 اب ہم اپنے زمانہ کے مذاہب اسلامیہ کا تذکرہ لکھتے ہیں۔

مذہب اسلام پر حاضرہ

ہمارے زمانہ میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی ہیں۔ معتزلہ بھی اور خوارج بھی۔ لیکن اپنی اپنی جگہ امن سے بیٹھے ہیں۔ البتہ یہ پیشوایان دین، جن کا روزگار ہی یہ ہے۔ کبھی کبھی اپنے متبعین میں سہان پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کا بازار سر و نہ پڑ جائے۔ اس حقیقت میں سنی اور شیعہ پیش پیش ہیں۔ معتزلہ اہل عقل و حکمت ہیں۔ ان میں سے بعض تو سرے سے مذاہب سے بیزار ہیں۔ اور اس کو کارہ بیکاراں سمجھ کر کسی سے نہیں اٹھتے۔ بعض "علم کلام" سے وہی کام لے رہے ہیں۔ جو ابوالحسن اشعری اور غزالی نے لیا۔ اگرچہ ان کے عقاید معتزلہ سے مختلف ہیں مگر تریہ وہی ہے جو شروع میں معتزلہ نے استعمال کیا۔ بد اپنے آپ کو اہل سنت و الجماعت کہتے ہیں۔ ان کے دو فرقے ہیں۔ ایک تو وہ جو چار اماموں میں سے کسی ایک کا اتباع کرتے ہیں۔ ان میں سے حنفی امام ابو حنیفہ کا اتباع کرتے ہیں اور انہی کی اکثریت ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو "اہل حدیث" سے موسوم ہیں۔ یہ کسی امام کا اتباع نہیں کرتے۔ یہ احادیث جیسی کہ "صحاح ستہ" میں مذکور ہیں تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان کی ترجمانی اور شرح آخر کو قی اہل دین ہی کرے گا۔ یہ کسی ایک امام کو تو نہیں مانتے مگر تحت شعور ماننا ہی پڑتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابتدا میں اہل حجاز اہل حدیث اور اہل عراق اہل الرائے سے موسوم تھے۔ امام مالک اور امام احمد بن حنبل اور امام شافعی سب اہل حدیث ہی تھے۔ امام ابو حنیفہ اہل الرائے تھے وہ نغمہ فی الدین آیات قرآن سے اکثر

اور احادیث سے بھی کہتے۔ اس لئے یہ کوئی نیا فرقہ نہیں اور نہ صنفی اہل حدیث سے بلکہ غلط عقائد مختلف ہیں۔ اہل حدیث کو ہمارے زمانہ میں "عبدالوہاب" کے نمایاں کیا۔ اس لئے صنفی ان کو طنزاً "وہابی" اور "نجدی" کہتے۔ کیونکہ عبدالوہاب نجد کا باشندہ تھا۔ سلطان ابن سعود جس کی حکومت آج عرب کے اکثر حصوں پر ہے اور ارض حجاز بھی اس میں شامل ہے اس مذہب پر ہے۔

ہم نے اس فرقہ اور ان کے حالات "خلافت اسلامیہ" میں لکھے ہیں اس لئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ اور آپ کی اولاد نے اس مذہب کو شائع کیا۔ سلطنت مغلیہ سرعت سے پستی کی طرف جا رہی تھی۔ عملی قوت مفلوج ہو چکی تھی۔ طبقہ امراء عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور عوام تو ہم پرست پیروں اور فقیروں اور مزاروں کی پوجا کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے جو تحریک شروع کی اس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا۔ دشمنان دین کے خلاف جہاد اس فرقہ کا طبعی امتیاز تھا اور یہ لوگ عموماً سپاہیانہ لباس میں مسلح نظر آتے۔

پنجاب میں سکھوں کی چیرہ دستی نے مسلمانوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ یوپی محمد اسماعیل اسی خاندان کے رکن تھے۔ سید احمد بریلوی اسی خاندان کے فیض یافتہ تھے۔ دونوں نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ یہ تاریخی واقعات ہیں۔ عقیدہ جہاد میں شدت عبدالوہاب نے خوارج سے اخذ کی۔ گورنمنٹ برطانیہ نے وہابی فرقہ کو باغی قرار دیا اور کئی عالم دین گرفتار ہوئے اور کچھ پھانسی پائے اور کچھ جلاوطن پورٹ بلیئر واقع جزیرہ اندیمان میں ہوئے۔

سر سید احمد خاں نے گورنمنٹ کو متنبہ کیا کہ "ایک غلط سیاسی عقیدہ کی بنا پر جو گورنمنٹ کے ذہن میں تھا۔ یہ

روشن جو گورنمنٹ نے وفا دار رعایا کے خلاف اختیار کی، سخت

مذموم ہے۔"

اور اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ میں خود بلحاظ عقاید وہابی ہوں۔
چونکہ سید کی خدمات جو دورانِ غدر میں سرانجام دی تھیں۔ گورنمنٹ برطانیہ
اس تحسان کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس لئے یہ طوفان بے تیزی تھم گیا۔ اور الحدیث
لے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ یہ فرقہ پیر اور قبر پرستی کے سخت خلاف ہے۔
چونکہ احادیث پر سخت ایمان ہے اس لئے مسیح و مہدی کا آمد ثانی کا بھی منظر ہے۔

سید احمد خاں غفرلہ | لیکن اتنا ضرور کہتا ہے کہ اگر اہلسنت والجماعت
سید اگرچہ مسیح و مہدی کی آمد ثانی کا قائل نہیں۔

کا عقیدہ دوبارہ توحید وہابیوں کا ہو اور وہابیوں کا دل سننیوں کا ہو تو ایسے شخص
میں مسلمان کی شان نظر آتی ہے۔ شیعہ کو کہتا ہے کہ خلافت کے بارہ میں تمہاری
دلائل بہت مضبوط ہی تھی۔ مانا کہ خلفائے ثلاثہ نے حضرت علیؑ کا حق غصب کیا
یہ کہو کہ اب تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ نہ ہم اور نہ تم حضرت علیؑ کو خلافت واپس
دلا سکتے ہیں اور نہ کسی طرح واقعات گزشتہ واپس لا سکتے ہیں۔ البتہ ایک
بدمزگی اور افتراق مسلمانوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ہوا۔

سید کسی فرقہ کا بانی نہیں ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ جب دین ایک ہے اور
اللہ ایک ہے اور رسول ایک اور کتاب ایک ہے اور اس پر سب مسلمانوں
کا اتفاق ہے تو محض فرعی مسائل میں جو دین میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں بشر
انگیزہ فرقہ کیوں پیدا کیا جائے۔

جب گورنمنٹ برطانیہ نے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر
آخری مغل تاجدار کے آخری ایام سید نے دیکھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے حالات
بچشم خود مشاہدہ کئے۔ انگریزوں نے اکثر علماء کرام کو پھانسی اور جلا وطنی کی سزا دی
اور عام مسلمانوں پر عتاب نازل ہوا۔ ہندوؤں کو ابھارا۔ اب مسلمانوں کو یہ حالت
تھی کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی ہم وطن اقوام سے بہت پیچھے رہ گئے۔ بالخصوص
تعلیم میں جس کی اس وقت ضرورت تھی۔ یعنی انگریزی زبان وغیرہ سے تقویر

اور انگریزوں سے دور دور رہنے لگے۔ سید نے سمجھ لیا تھا کہ اگر یہی لیل و نہار رہیں تو مسلمان قریباً تیرہ ماہ میں من حیث القوم ~~مہم~~ ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ بحیثیت مصلح مسلمانوں کے سامنے آیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ انگریز تفرقہ جو فرقہ بندی نے پیدا کر رکھا ہے مسلمانان ہند میں ختم ہو جائے۔ اس لئے اس نے دارالعلوم قائم کیا اور شیعہ اور سنی مسلمانوں کی اولاد کو ایک جگہ ملا دیا اسے بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ اور شاید خاطر خواہ ہوتی مگر پیشوایان دین اس کے مذہبی عقاید کے خلاف تھے۔

سید نے بھانپ لیا تھا کہ انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کا اثر مذہب اسلام پر بھی وہی ہوگا جو یورپ میں علوم جدیدہ کا بحیثیت پر ہوا۔ وہاں مذہب اور سائنس کا مقابلہ رہا۔ اور مذہب شکست کھا گیا۔ ویسویں پہاں بھی ہوگا۔ اس کے لئے مسلمان علماء کو تیار رہنا چاہیے۔ مسلمانوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی ہم معتزلہ کے حالات میں بیان کر چکے ہیں کہ یونانی فلسفہ کا مقابلہ انہوں نے کیا اور انبیاء پر بہت کچھ مویشگافی کی۔ اشعری نے ٹھیٹھ اسلام کی حمایت میں علم کلام سے کام لیا۔ لیکن اب یونانی فلسفہ تقویم پارینہ ہو چکا تھا۔ وہ آخر نظری علم تھا۔ اب سائنس (حکمت) کا دور دورہ تھا۔ حقایق جو سائنس سے ثابت شدہ تھے ناقابل انکار تھے۔ عرض سرسید نے بھی قرآن کی تفسیر میں معقولات کی نمائش اسی طرح کی جس طرح رازی وغزالی وغیرہ کر چکے تھے۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ "اسلام دین الفطرت ہے۔ اس لئے علماء اسلام اس کو طنزاً "نیجری" کہنے لگے اور کفر کافری تو ان کے جاتیں ہاتھ لگا کر تپ تھا۔ اس کی زور سے آئمہ دین بھی نہ بچے۔

چوں کہ سرسید کے در نظر ایک اور مقصد عظیم تھا۔ اس لئے علماء سے منظرہ میں نہ الجھا۔ رفتہ رفتہ علماء کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں "نیجری" تعلیم یافتہ طبقہ میں شائع نہ ہو۔ مولوی شبلی نعمانی اور ان کے رفقاء کار نے "ندوة العلماء"

کی طرح ڈالی۔ دیوبند میں وہی پرانی روش پر وینیات کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔

میں نے سرسید کو اپنے طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا جب آخری دفعہ امرتسر شریف لائے۔ مولوی نذیر احمد ہمراہ تھے۔ مولوی صاحب کا اردو میں با محاورہ ترجمہ قرآن شریف ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔ سید کسی نئے مذہب کا یافی نہ تھا۔ مولوی شبلی نعمانی بھی ابتدا میں سید کے رفقا کار میں تھے۔ سید کے فقا کار میں بعض کو سید کے مذہبی عقاید سے اختلاف رہا۔ لیکن سید جس مقصد کو لے کر اٹھا تھا۔ اس سے اتفاق کل مسلمانوں کو تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ نہ سید ہوتا اور نہ پاکستان بنتا۔

سید غفرلہ کی تصانیف میں سے تفسیر قرآن سولہ سپارہ تک ہے۔ افسوس ہے کہ مکمل نہ لکھ سکے۔ تعجب ہے کہ سید "نچری" کو ملایا لیکن شروع تفسیر میں "ذات الکتب لاریب فیہ"۔ "الکتب سے مراد قرآن ہی سمجھی۔ بات یہ ہے کہ اس طرف ذہن منتقل نہ ہو کہ یہ "کتاب فطرت" ہے۔ چونکہ تمام مفسرین قرآن ہی سمجھتے رہے۔ سید بھی تقلید ہی کچھ سمجھتا رہا۔ انسان کا خواہ کتنا ہی مرتبہ ذہنی درجات کے لحاظ سے ہو۔ دانستہ یا نادانستہ ایسی غلطی تقلید کرتا ہے۔

اس موضوع پر میں نے علیحدہ بحث کی ہے۔ تفسیر پر ہمارے علماء کرام نے بہت کچھ مخافتانہ لکھا۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم دیوبند بہت بڑے پایہ کے عالم تھے۔ "تفسیر حقانی" میں سید کی تفسیر پر ان کی خاص نظر عنایت ہے۔ دونوں تفسیر میں میرے مطالعہ میں رہی ہیں۔ سید بعض عقاید میں معتزلہ کا ہمنوا ہے۔ معجزات کا منکر نہیں مگر خلاف قوانین فطرت نہیں سمجھتا۔ جو توجیہ سید نے ان میں معجزات کی کی ہے۔ جو قرآن میں مذکور ہیں کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ یہ آیات "مشاہدات" ہیں ان کی تاویل قرآن حکیم کی "محکمات" سے کرنی چاہیے تھی۔ میں نے اس کو خطوط پر بھی علیحدہ مفصل بحث کی ہے۔

”سید نے علما کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ
 ”میں نے یہ تفسیر ان لوگوں کے لئے لکھی ہے جو سائنس سے مرعوب
 ہو کر شہات میں الجھتے ہیں۔ علماء اور عامۃ المسلمین کا بلحاظ عقاید
 ایمان پختہ ہے۔ انہیں کوئی تذبذب دینی امور میں نہیں اور میں اسے
 واجب الاحترام سمجھتا ہوں۔“

سید یہ بھی کہتا تھا کہ

”آج سے پچاس برس بعد اگر یہ تفسیر لکھی جاتی تو اس پر یہ لے دے نہ
 ہوتی۔“

سید کا ذہن بلاشبہ اپنے زمانہ کے ذہن سے بلند تر تھا۔ عام فہم اس کی تفسیر کی خوبیوں
 کو بوجہ پستی ذہن نہ پاسکا۔ اب جبکہ ذہن انسانی سید کی سطح پر آچکے تو یہ توقع یہ تھی
 کہ اس کی خوبیوں کا انکشاف ہم پر ہوتا۔ بلاشبہ اس میں خوبیاں بھی ہیں۔ لیکن
 جہاں تک میں نے غور کیا ہے مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ان مولویوں کی ذہنیت کتنی
 پست تھی کہ سید کے عقاید کو کفر و الحاد سے موسوم کیا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے
 کہ یہ تفسیر بھی ایک ”ملائے“ ہی لکھی ہے جس کے ذہن سے پرانے خیالات باوجود
 کوشش محو نہیں ہوتے۔

سید کی تصانیف میں ”خطبات احمدیہ“ نہایت قابل قدر ہے۔ یہ کتاب
 سید نے ”سر ولیم میور“ کی کتاب کے جواب میں لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ لندن
 میں انگریزی زبان میں ایک انگریزی موفت کرایا گیا۔ سید کو زکریا اس پر صرف
 کرنا پڑا۔ آپ اس وقت لندن میں تھے۔ اپنے دوست نواب محسن الملک سے
 روپیہ طلب کرتے رہے۔ نواب نے تنگ آکر لکھا کہ

”سیدی! آپ جو روپے کا مطالبہ بار بار کرتے ہیں یہ بھی تو سوچو کہ

روپیہ کہاں سے آئے گا۔“

جواب میں سید نے لکھا کہ

”میراجہدی مکان دہلی میں ہے بیچ دو۔ کل بروز قیامت اپنے ناناسے
 نہوں گا کہ تیرے عشق میں میں نے سب کچھ ٹٹا دیا۔“
 سید پر کفر کے فتوے علماء کرام شائع کر رہے تھے۔ بلکہ ایک مولوی حج کو گئے اور
 وہاں سے کفر سا نڈلائے۔ سید ایک مقالہ میں لکھتا ہے کہ
 ”سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیسا ہے کسی کو حاجی اور کسی کو ناجی بنا دیا۔“
 سید کبھی کبھی فکر شعر بھی کرتا تھا۔ غالب مرحوم اور امام بخش صہبائی وغیرہ کی صحبت
 میں غالباً شعر و شاعری سے ذائقہ شناس ہوا۔ مغلیہ شہنشاہیت کے آخری تاجدار
 کا دور شاعری کا دور تھا۔ ظفر خود بھی شاعر تھا۔ چار دیوان لکھے جو موجود ہیں۔
 سید کی ایک غزل کے دو شعر ہیں۔

ز جبریل امین قرآن بی بیچانے نمی خواہم
 ہمہ گفتار معشوق است قرآن کہ من دارم
 خدا دارم دل بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم
 نذر بیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
 ہندوستان میں سید پر کٹر کا اتہام تھا مگر ”پنجاب“ اور صرف پنجاب کی حمایت
 پر کمر بستہ ہو گیا۔ آپ کے رفقاء کار میں خواجہ الطاف حسین حالی غالب مرحوم کے
 شاگرد تھے۔ ایک قصیدہ میں سید کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں۔
 خدا کی برکتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر
 جنہوں نے ہر سفر میں تجھ کو آنکھوں پر بٹھایا ہے

سید بھی اہل پنجاب کو ”زندہ دلان پنجاب“ سے مخاطب کرتا رہا۔ کاش
 پاکستان کے ارباب عمل و عقد اس راز کو سمجھیں کہ پاکستان کا قیام اور استحکام
 اور ہر ممکن ترقی پنجاب سے وابستہ ہے جو صوبائی تعصب کی گندگی سے پاک
 ہے۔ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اسلام کی شان اسی صوبہ میں نظر آتی ہے
 فہل انتقام مسلمانوں“

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے سید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح حیات اپنی کتاب "حیات جاوید" میں مفصل قلمبند کئے ہیں۔ ہم نے یہ تعلق پاکستان، اپنی کتاب "خلافت اسلامیہ" میں بھی خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں "دو قوموں کا نظریہ" سب سے پہلے سید کے ذہن کا صحیح تصور ہے اور یہی پاکستان کا سنگ بنیاد ہے۔ کاش یہ تصور پاکستانیوں بالخصوص صاحبانِ نظم و نسق کے بھی پیش نظر ہے۔

سید نے نہ کسی نئے فرقہ کی طرح ڈالی اور نہ دعویٰ امامت کیا۔ لیکن بعض مسائل کو اپنی بحث کا موضوع بنایا جس پر علماء اسلام مسیح یا ہونے۔ ان میں سے معرکہ الآراء مسئلہ حیات مسیح اور آپ کی آمد ثانی کا ہے۔ سید کا عقیدہ یہ تھا کہ

حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے ہیں اور آپ کی ولادت بھی بلا باپ نہ تھی اور یہ کہ آمد ثانی کا عقیدہ مسلمانوں نے مسیحی پادریوں سے لیا ہے۔ یہ مسئلہ بھی کچھ نیا نہ تھا مگر انسانی طبیعت عجائب پسند واقع ہوتی ہے اور جب معجزات اور عجیب عجیب باتیں انبیاء اور اہل اللہ سے منسوب کی جائیں تو خوش عقیدہ فوراً بلا چون و چرا مان لیتے ہیں۔ سید نے معجزات کا انکار اس معنی میں کیا جو حوام کے ذہن میں ہیں۔ اور لکھا کہ

"سنت اللہ کبھی تبدیل و تحویل نہیں ہوتی۔ واضح قوانین کی یہ کمزوری سمجھی جائے گی کہ ایک کام جو اپنے وضع کردہ قوانین کے تحت نہیں کر سکتا ان قوانین کو توڑ کر کرے۔ معجزات برحق لیکن خلاف قوانین فطرت نہیں۔"

سید نے انجیل حسب روایت مقدس متی کی بھی تفسیر لکھی۔ اس کا اثر تنازور ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ نے تسلیم کر لیا کہ مسیح فوت ہو چکے ہیں۔ اور یہ کہ آپ کی ولادت اعجازی نہ تھی اور یہ کہ آمد ثانی کا عقیدہ غیر اسلامی ہے۔ ضمناً مہدی اور مہدی کی آمد ثانی کا عقیدہ بھی زیر بحث آگیا۔ سید نے تمام احادیث جو مہدی کے بارہ

میں ہیں پیش نظر رکھتے ہوتے ان پر سخت جرح کی۔ ان احادیث کا اختلاف بلکہ تضاد واضح کرتے ہوتے اسناد کا بھی پودا پن ثابت کیا اور لکھا کہ

”ایک ایسے زمانہ میں جب کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں سیاسی کشمکش تھی۔ احادیث کا اشارہ دربارہ مہدی بنو ہاشم کی طرف ہے جب اموی حکومت کا تختہ الٹ گیا تو بنو ہاشم کے دو قبائل بنو فاطمہ اور بنو عباس کے داعی مہدی کا ظہور اس قبیلہ میں بتاتے جس کے وہ طرف دار تھے جب بنو عباس غالب آئے تو محمد المہدی ابن ابوجعفر منصور خلیفہ عباسی اور منصور کا براہِ زورہ عیسیٰ ابن موسیٰ سپہ سالار افواج عباسیہ کی شخصیتوں میں بیک وقت عیسیٰ و مہدی کا ظہور ہوا۔ ایرانی اپنی کھوئی ہوئی عظمت و شان بحال کرنا چاہتے تھے ایسی احادیث بھی وضع ہوئیں جن کی رو سے مہدی کا ظہور مسلمان فادسی کی قوم سے ہوگا چنانچہ ان میں بھی مدعی مہدویت پیدا ہوتے۔ جب شمالی افریقہ میں بنو فاطمہ نے اپنی خلافت قائم کر لی تو اول خلیفہ فاطمی عبید اللہ

المہدی ہوا۔ غرض مسیح و مہدی کے بارہ میں تمام احادیث مسیحی نوشتہ عقیدت سے یا سیاسی اغراض سے وضع کیں۔ اور ضرورہ ان کو اتنی شہرت دیا کہ مسلمانوں میں ایک عقیدہ کی صورت اختیار کر گئی۔ اہل سنت و الجماعت اتنا تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی جزو دین نہیں۔ لیکن شیعہ مذاہب میں امام مہدی ابن امام حسن عسکری کا اب تک انتظار ہے۔ جو خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے عہد میں سامرد (سمرقند) کی غار میں روپوش ہو گئے۔ اس عقیدہ کا فائدہ و عویداران خلافت نے ہر ایک زمانہ میں خاطر خواہ اٹھایا اکثر مارے گئے اور جو مارے گئے ان کے متبعین تسلیم نہیں کرتے کہ فوت ہوئے۔ ابھی تک زندہ روپوش ہیں کسی مناسب وقت پر ان کا ظہور ہوگا۔

ان مہدیوں کا تذکرہ ہم نے اپنی کتاب "خلافت اسلامیہ" میں کیا ہے اس لئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔

دوسرا مسئلہ جو سید کی بحث کا موضوع رہا "جبرئیل امین" کی حقیقت تھی یہ بھی کوئی نیا مسئلہ نہ تھا۔ سید نے پیشتر بھی بعض صوفیاء محققین نے یہی کچھ لکھا تھا کہ جبرئیل یا وحی انبیاء کی قوت نبوت ہے۔ چنانچہ مغلیہ شہنشاہ غازی عالمگیر کے عہد میں ایک بزرگ نے عربی میں رسالہ "تسویہ لکھا اور یہی کچھ لکھا۔ علمائے محسب عادت شہور چچا اور شہنشاہ کو توجہ والا لکھا۔ یہ بزرگ قوفت ہو چکے تھے آپ کے ایک خلیفہ کی شامت آئی۔ شاہ نے لکھا کہ

"یا تو علماء نے اس مسئلہ پر بحث کرو یا رجوع کرو اور تمام نسخے جلا دو۔"
جواب دیا کہ

"میرے شیخ نے جس حال اور مقام پر بحث کی مجھے حاصل نہیں اس لئے بحث سے تو معذور ہی سمجھیں۔ شاہ کے مطمحہ میں آگ کی کمی نہیں اور ویش کا چو لھا تو اکثر سرو ہی رہتا ہے۔"

چونکہ مسئلہ "وحی" اہم ہے اور اکثر مذاہب اسلامیہ مختلف حقائق پر اس لئے ہم اس موضوع پر کسی قدر تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں۔

یا وہ ہے کہ جو کچھ میں اس موضوع پر لکھ رہا ہوں وہ میری اپنی تحقیق ہے اور حوت آخر نہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے اس کا اختیار ہے۔ یہ کہتی ایسا مسئلہ نہیں کہ اس کے انکار پر دین میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔

قرآن میں دو قسم کی آیات ہیں۔ ایک متشابہات اور "دوسری" محکمات۔ متشابہات آیات کتب مقدسہ سابقہ کی ہیں۔ مثلاً توراہ و انجیل و صحف انبیاء اور یہ تاویل کی محتاج ہیں۔ "وما یعلم تاویلہ الا اللہ" (۲۰) اور اللہ کی تاویل محکمات قرآنی سے فرماتا ہے۔ یہ آیات متشابہات کچھ تو احکام ہیں، کچھ قصص اور

کچھ اصطلاحات اہل کتاب جو کتب سابقہ میں مذکور ہیں ان میں سے سر دست زیر بحث ہی اصطلاحات ہیں۔ یہ ملائکہ اور روح اور جبرئیل اور وحی وغیرہم ہیں۔
 قرآن کتب سابقہ کا مصدق ہے (مصدقاً لما بین یدینہ) بغرض تصدیق آیات کتب سابقہ کا حوالہ انہی کتب کے الفاظ میں یا ان الفاظ کی ترجمانی عربی میں فرماتا ہے۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ الفاظ تو کتب سابقہ کے ہیں اور تاویل قرآن کی تاویل کے بعد یہ آیات متشابہات بھی محکمات کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں قرآن خود محکمات ہے (یس، والقرآن الحکیم) یہی متشابہات ہیں جن کی تاویل اپنے اپنے فہم کے مطابق تمام اسلامی مذاہب کرتے رہے۔

ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ

”فرقہ بندی کے اسباب میں سے یہ سب سے بڑا سبب ہے جو متزلزل اور باطنیہ نے اپنے اپنے اصول موضوعہ کے مطابق تاویل کی۔

بچوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زوندہ

اگر تاویل محکمات قرآنی سے کرتے تو اختلاف بھی نہ ہوتا۔

سر دست ہمارے زیر بحث اصطلاح جبرئیل ہے۔ یہ عبرانی لفظ ہے۔ مرکب ہے ”جبر“ اور ”ایل“ سے۔ عربی میں لفظ ”جبر“ بھی قوت کے معنی میں عبرانی کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ ”ایل“ اور ”اللہ“ ایک ہی لفظ ہے۔ جبرئیل کے معنی ”قدرت اللہ“

توراة میں یہ اصطلاح استعمال نہیں ہوئی۔ صحف انبیاء میں سے پہلی دفعہ صحیفہ دانیال نبی میں جبرئیل کا ذکر آتا ہے۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل اس اصطلاح سے واقف نہ تھے۔ دانیال نبی مدت العمر بابل میں رہے۔ جہاں شاہ بابل سروپیوں کو اسیر کر کے لے گیا تھا۔ یہاں وہ ستر سال رہے اور یہ اصطلاح بھی یہاں وضع ہوئی۔ دانیال نبی ایک رویا کا ذکر کرتا ہے (دانیال ۱۰) اور اسی رویا میں ایک غیبی آواز سننے جو جبرئیل کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ ”دانیال کو اس رویا کی تعبیر

بتا دے: آپ نے جبرئیل کو ایک آدمی کی صورت میں دیکھا۔ انجیل حسب روایت مقدس موات (۱۷، ۱۸)، میں جبرئیل کا ذکر آتا ہے۔ جبرئیل حضرت زکریا کو ولادت بخشی کی اور مریم صدیقہ کو ولادت عیسیٰ کی بشارت دیتا ہے۔ یہودی روایات کے مطابق چار سردار ملائکہ ہیں: (۱) جبرئیل (۲) میکائیل (۳) عزرائیل (۴) اسرافیل۔ قرآن میں میکائیل کا نام ایک دفعہ اور جبرئیل کا دو آیات میں آیا ہے۔

”قل من كان عدو لجبريل فانه نزله على قلبك باذن الله مصدقا لما بين يديه وهدى وبشرى للمؤمنين ۵ من كان عدوا لله وملائكته ورسوله وجبريل وميكائيل فانه الله عدو للكافرين ۶ (۱۷)“
 ”کہو کہ جبرئیل کا دشمن جو ہوتا ہے ہوتا ہو حقیقت یہی ہے کہ اسی نے اللہ کے اذن سے تیرے قلب پر (قرآن) نازل کیا جو مصدق ہے کتب سابقہ کا اور ہدایت اور بشارت مومنوں کے لئے۔ جو بھی خدا کا ملائکہ اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ کافروں کا دشمن ہے۔“

”فان الله خص مولاه وجبريل وصالح المؤمنين والملائكة

بعد ذلك ظهير ۶ (۱۷)“

”تحقیق اس رسول کا اللہ دوست ہے اور جبرئیل اور مومن صالحین اور ان کے بعد ملائکہ اس کے مددگار ہیں۔“

”وان الله لتنزيل رب العالمين ۵ نزل به الروح الامين ۶ على

قلبك لتكون من المذنبين ۶ بلسان عربي مبين ۷ (۱۹)“

”تحقیق یہ قرآن نازل کیا گیا ہے دنیا جہاں کے پروردگار کی طرف سے، اس کے

ساتھ الروح الامین تیرے قلب پر نازل ہوا ہے۔ عربی مبین کی زبان میں تاکہ تو عذاب (الٹی) سے ڈرانے والوں میں سے ہو۔“

آیات ۱۷ اور ۱۹ سے ثابت ہوتا ہے کہ حال قرآن یا وحی جبرئیل ہے

جو اصطلاح اہل کتاب کی ہے اور الروح الامین اس کو قرآنی حکمات میں

موسوم کیا گیا ہے۔ اس لئے روح اور جبرئیل ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا روح اور ملائکہ ایک ہی شے ہیں؟ آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جب آدم میں نفخ روح ہوتا ہے تو ملائکہ سجدہ میں گرتے ہیں۔ آدم تو ایک خاک پتلا تھا روح کا نفخ ہوا تو مسجود ملائکہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ روح مخدوم اور ملائکہ خادم ہیں۔ دیگر آیات میں بھی روح کو ملائکہ سے الگ بیان کیا گیا ہے

"يَنْزِلُ الْمَلَائِكَةُ بِالرُّوحِ" (۱۲)

نازل فرماتا ہے ملائکہ کو روح کیساتھ

"تَنْزِيلُ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ" (۱۳)

نازل ہوتے ہیں ملائکہ اور روح

اس لئے ثابت ہوا کہ جبرئیل "الروح" ہے۔ ملائکہ میں داخل نہیں۔ روح کا اطلاق صرف آدم اور بنی آدم پر ہوتا ہے۔ اور نفخ روح کے بعد ہی آدم انسان بنتا ہے۔ اس لئے روح انسان سے کوئی علیحدہ شے نہیں۔ اگر سید یا سید سے پیشتر کسی محقق نے اس کو ایک قوت انسانی سے تعبیر کیا تو کیا غلطی کی۔ روح کلام الہی ہے اور کلام الہی حقیقت مجرودہ ہے۔ جب یہ کسی صورت میں نمودار ہو گا یا اس کا تمثیل ہو گا تو وہ انسانی صورت ہی ہوگی۔ تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے "کلمات ربی" ہیں۔ انسان بھی ان میں سے ایک ہے۔ یہ بھی ایک کلمہ ہے۔ اور یہی حقیقت انسانی ہے۔ یہی کلمہ روح انسانی ارتقائی مرتبہ پر ہے۔

"فَارْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَمَثَلْ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا" (۱۴)

"مریم صدیقہ کی طرف ہم نے اپنا ایک روح بھیجا جو (جیسی جاگتی) پوسے

بشر کی صورت میں اس پر نمودار ہوئی۔"

ظاہر ہے کہ یہ روح فرشتہ تو نہیں انسان ہی ہے اور اسی سے صدیقہ حاملہ بھی ہوئی۔ (فصلتہ ۱۴) اور یہ آپ کا خاوند ہی تھا۔ جس کو انجیل میں یوسف نجار لکھا ہے اور وہ حضرت داؤد کی نسل سے تھا۔ سورہ مریم میں قصہ ولادت مسیح انجیل کے لفظوں

میں بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ آیات متشابہات ہیں۔ عیسیٰ ابن مریم کلمہ بھی ہے اور روح بھی اور رسول بھی۔

انما المرسلون من عند ربهم رسول الله و كلمته انزلنا الى مريم و روح
منه فامنوا بالله و رسوله و لا تقولوا ثلثه (۱۰۰)

مسح عیسیٰ مریم کا بیٹا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ کا رسول ہے اور اس کا
کلمہ ہے جو مریم کی طرف ڈالا گیا اور اس کی روح ہے۔ تو اللہ اس کے رسولوں پر
ایمان لاؤ اور تین مت کہو۔

عیسیٰ بحیثیت کلمہ دیگر اشیاء کائنات میں ممتاز نہیں بحیثیت روح دیگر
بنی آدم سے ممتاز نہیں۔ البتہ بحیثیت رسول اس کو خاص امتیاز حاصل ہے
مگر رسولوں میں امتیاز نہیں۔ (لا نفرق بین احد منہم) (۱۰۱)

”روح“ تو ہر ایک انسان ہے۔ ”روح القدس“ نفوس قدسیہ انبیاء و رسل
میں۔ ”الروح الامین“ صرف آنحضرت ہیں۔ اس لئے آپ کا ”مقام محمود“ آپ
ہی کے لئے خاص ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پنجاب کی تعریف میں مولانا غنیمت ساکن کنجاہ واقع ضلع گجرات
پنجاب | پنجابی شاعر جو مولانا نظامی گنجوی سے کم نہیں لکھتا ہے

ندیدم کسٹوری غارتگر سے تاب بخوپہانی حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور قسم خور وہ بخاکش آب کوثر

ز شوق آن کہ تا آید بہ پنجاب

دل کشمیر صدرہ پیشود آب

زندہ دلان پنجاب کی زندگی کا نشان ایک یہ بھی ہے کہ دین سے ان کا
شغف دوسرے صوبوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مجھے اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد ہے
اپن جدیدیت اور حنفیوں میں مناظرے، طرفین کے علماء کے خطبے ایک دوسرے
کی ترویج میں حنفیوں کی مسجدوں میں دیباچوں کا داخلہ بند، غرض گھروں، دکانوں،

بازاروں میں اختلافی مسائل ہی کا پھر چا تھا۔ "آمین باللہ" اور "رفع یدین" خاص موضوع بحث کا تھا۔ آج جب میں گذشتہ واقعات کو دیدہ تصور کے سامنے لاتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ بھلا یہ بھی ایسے اہم مسائل تھے کہ اگر کوئی وہابی کسی حنفی مسجد میں غلطی سے آجاتا اور حنفیوں کو پتہ لگ جاتا تو جو کچھ اس کی درگت ہوتی وہ تو اس کا دل ہی جانتا ہوگا۔ صحن مسجد بھی ناپاک ہو جاتا، دھویا جاتا۔ اور بعض اوقات اکھڑوا کر نیا بنایا جاتا۔ وہابیوں کی اپنی کوئی مسجد نہ تھی جب رفتہ رفتہ زور پکڑ گئے تو کئی مسجدوں پر قبضہ بھی جمایا اور نئی بھی تعمیر ہو گئیں۔

میرے خاندان کے سب بزرگ تسلیم یافتہ تھے اور وہابی تھے۔ ان سے تو پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی کہ یہ آمین باللہ اور رفع یدین کیا بلا ہے کہ جس پر اتنا فساد ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ جب صلوٰۃ فرض ہوتی تو بعض منافق بھی بظاہر مسلمان ہو گئے۔ بغل میں بت دباتے مسجد میں شامل جماعت تو ہو جاتے۔ مگر نیت یہ ہوتی کہ ہم اپنے ٹھاکروں کی بندگی کرتے ہیں۔ جب آنحضرتؐ پر یہ حال کسی طرح منکشف ہوا تو آپ نے رفع یدین کا حکم دیا۔ اسی طرح ان مشرک منافقوں کا پول کھل گیا۔ بت بغل سے گرے اور فرش مسجد پر گر کر چور چور ہو گئے۔ آمین باللہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کفار مرعوب ہوں۔ جب مسلمان صفا باندھے ہوئے زور سے آمین بیک وقت کہتے، کفار جو بدراوہ سے آتے ان کے دل دہل جاتے۔

اہل قرآن

یہ دور گزر گیا۔ اہل حدیث کا اکثر مناظرہ آریا سماج والوں سے ہوا کرتا۔ مخالف ہمیشہ احادیث ہی پیش کرتا۔ صحاح ستہ میں احادیث ایسی بھی ہیں کہ اگر ان کی صحت تسلیم کی جائے تو قرآن کا دعویٰ کہ "انما نوحیٰ لانا الذکر و انما انزلنا لظہورۃ" (۱۲) ثابت نہیں ہوتا اور جو ہدایت آنحضرت کے "اسوہ حسنہ" کے بارہ میں کی گئی ہے اس پر بھی حرف آتا ہے۔ مسیحی یا داریوں نے بھی اسی قسم کے اعتراض کئے ہیں۔ اب اہل حدیث کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو احادیث کو "وحی نخی" کا درجہ نہ دیں اور نہ انہیں حجت شرعی سمجھیں یا مخالف فریق کا اعتراض تسلیم کریں۔ اہل حدیث نے ایک اور روش اختیار کی جب مسیحیوں یا آریاؤں سے مباحثہ کی ٹھہرتی تو یہ شرط پہلے منوالیتے کہ صرف قرآن کی آیات ہی زیر بحث رہیں گی۔

ان مناظروں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بعض مفکرین کی توجہ احادیث کے صحیح مقام و دریافت کرنے پر مبذول ہو گئی۔ اہل حدیث ایک عقیدہ پختہ کر چکے تھے۔ وہ تو احادیث کو قرآن کی طرح "وحی" مگر غیر "متلو" اور "مثلمہ" ہی کہتے رہے۔ بلکہ بعض اس حد تک غلو کرتے کہ احادیث کو قرآن پر قاضی اور حکم تسلیم کرتے۔ مگر ان مفکرین نے اتنا معلوم کر لیا کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی اور تفرقہ کی بنیاد ہی احادیث ہیں۔ ابتدا میں ان کا انکار تو کیا گیا مگر اکثر احادیث جن کو قابل قبول عقلاً نہ سمجھا اور نصوص قرآنی کے خلاف پایا سخت مجروح کیا لیکن رفتہ رفتہ

جب ان کا احترام ویسا نہ رہا جیسا اہل حدیث کے نزدیک تھا تو ان کی صحت اور صداقت کا بالکل انکار کر دیا۔ آیہ مبارکہ سے تمسک کیا کہ

”تلك آیت اللہ، نتلوها علیک بالحق فی ایت حدیث بعد اللہ وایتہ
یومنونہ“ (۲۵)

”یہ عظمت والی آیات ہیں جو ہم تجھ پر پڑھتے ہیں تو اللہ اور اس کی آیات کے بعد کس حدیث پر ایمان لائیں گے۔“

اس مذہب کا بانی پنجاب میں مولوی عبداللہ چکڑالوی تھا۔ اس نے نہایت جرات سے احادیث کا واضح الفاظ میں انکار کر دیا۔ مجھے بھی مولوی صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تقریب یہ ہوتی کہ میں لاہور میں ایک بزرگ کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا ایک دوست بھی اتفاق سے ملنے کے لئے آنکلا۔ یہ مولوی عبداللہ کے متبعین میں سے تھا۔ لاہور میں مولوی صاحب اور ان کے عقائد کا بہت چرچا تھا۔ اور آپ کے متبعین بھی سرگرمی سے آپ کا پر اپا غنڈا کر رہے تھے باتوں باتوں میں اس شخص نے آنحضرتؐ کی نسبت کہا کہ

”یہ جو عام عقیدہ ہے کہ آنحضرتؐ پر ٹھہنا لکھنا جلتے تھے۔ غلط ہے اور آل حضرتؐ کی توہین ہے۔“

اگرچہ میں مخاطب نہ تھا مگر جب دیکھا کہ میرا بزرگ خاموش ہے تو رہ نہ سکا اور کہا کہ قرآن کے ارشاد کے بارہ میں آپ کیلئے ہیں۔

”وما کنت لتلوامن قبلہ من صلیب ولا تخطہ بمینلت

اذا لارتاب المبطونہ“ (۲۱)

”تو اس سے پہلے کچھ بھی لکھا ہوا نہیں پڑھتا تھا اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ (اگر ایسا ہوتا تو) یہ جھوٹے البتہ دھوکا کرتے۔“

میں نے قرآن ہی کی آیت پیش کی تھی جو اب بن نہ آیا تو کہا کہ مہربانی ہوگی اگر ہمارے امام صاحب کے پاس چلیں وہ آپ کی تشفی کر دیں گے۔ میں اس کے

ساتھ امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

موسم گرما تھا۔ مولوی صاحب ایک معمولی چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ مسجد بھی مگر اس کی تعمیر ابھی شروع ہوئی تھی۔ رنگ سا نولا تھا، قد متوسط سے کچھ اونچا۔ ایک کرتہ اور نیلا تہ بند۔ وضع درویشانہ۔ میرے ہمراہی نے تعارف کے بعد بحث کا موضوع بتایا تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ

”اقرءوا ربك الاكرامه الادی علم بالقلمه علم الانسان ما لم

يعلمه (۱۳۳)

”پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے سکھایا قلم کے ساتھ سکھایا آدمی کو جو کچھ نہ جانتا تھا۔“

میں نے عرض کی کہ صحیح، مگر اس آیت میں تو عام حکم انسانوں کے لئے ہے کہ ان کو قلم کے ذریعہ سکھایا گیا۔ اس آیت سے اس کی نفی تو نہیں ہوتی کہ اور کوئی ذریعہ حصول علم کا نہیں اور یہ کہ آنحضرتؐ کو بھی قلم ہی کے ذریعہ سکھایا گیا جب کہ نص موجود ہے کہ آپ لکھنا جانتے ہی نہ تھے؟

بحث یہیں ختم ہو گئی۔ کیوں کہ نماز شام کا وقت ہو گیا تھا۔ اذان ہو رہی تھی اور لوگ مسجد میں جمع ہو رہے تھے۔ مولوی صاحب اٹھے۔ میں نے بھی وضو کیا۔ مولوی صاحب نے نماز شروع کر دی تھی۔ میں وضو سے فارغ ہوا تو دیکھا کہ مولوی صاحب فرائض امامت مقتدیوں کی صف اول میں کھڑے ادا کر رہے ہیں۔ میرے لئے یہ نئی بات تھی۔ مولوی صاحب رکوع میں جاتے ہوئے بھی آیا پڑھ رہے تھے۔ مسجد میں کافی گنجائش تھی۔ میں نے علیحدہ اکیلے ہی نماز پڑھ لی نماز سے فارغ ہو کر پھر سلسلہ بحث جاری ہو گیا۔

میں نے کہا کہ اگر کوئی عیسائی آپ کے نظریہ کی بنا پر یہ کہے کہ آنحضرتؐ اچھے خاصے لکھے پڑھے تھے۔ اور قرآن بھی آپ ہی کا بنایا ہوا ہے تو آپ کیا جواب دیں گے۔

فرمایا "میں آپ کو کیسے فرض کر لوں کہ آپ عیسائی ہیں۔ آپ نے ابھی میرے سامنے نماز پڑھی ہے" میں نے کہا کہ "میں کب کہتا ہوں کہ میں عیسائی ہوں اور اس حیثیت میں اعتراض کر رہا ہوں۔"

فرمایا "جب آپ عیسائیوں کی نمائندگی کر رہے ہیں تو یا کہیں کہ میں عیسائی ہوں تو آپ کو جواب بھی اسی مناسبت سے دیا جائے گا۔" میں نے کہا کہ "میں عیسائی تو نہیں مسلمان ہوں مگر بغرض بحث آپ پھرتی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ایک عیسائی یہ اعتراض کر رہا ہے۔"

فرمایا کہ "میں ہرگز ایسا فرض نہیں کر سکتا جو بد اہت کے خلاف ہو۔" میں نے سمجھ لیا کہ مولوی صاحب کے پاس کوئی جواب نہیں جس سے میری تشفی ہو۔ سلام کیا اور چلا آیا۔ ابھی میری طالب علمی کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ آج اس مسئلہ کی تحقیق کا خیال مجھے ہوا تو سمجھ میں آ گیا کہ مولوی صاحب نے کیوں بحث سے پہلو تہی کی۔

احادیث میں صلح حدیبیہ کے ضمن میں مذکور ہے کہ "عہد نامہ صلح لکھا گیا تو اس کے پہلے فقرہ "میں محمد رسول اللہ پر کفایت نے اعتراض کیا کہ اگر ہم آپ کو رسول اللہ تسلیم کرتے تو جھگڑا کس بات کا ہے۔ اس لئے الفاظ رسول اللہ قلمزن کہتے جاتیں۔ کاتب عہد نامہ حضرت علیؑ تھے آپ نے انکار کر دیا۔ آنحضرت نے خود اپنے ہاتھ سے الفاظ "ابن عبد اللہ" پہلے الفاظ قلم زن کر کے لکھ دئے۔"

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات پڑھنا لکھنا جانتے تھے مگر مولوی صاحب تو احادیث کے بالکل منکر تھے۔ اس لئے اس حدیث سے استدلال بھی نہ کر سکتے تھے مولوی صاحب مجھے میری پیش کردہ آیات سے بھی قائل کر سکتے تھے کہ اس آیت میں الفاظ "من قبلہ" کی تخصیص ہے یعنی نزول قرآن یا دعوی نبوت یا بعثت سے

پیشتر بلاشبہ اُن حضرت م لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے مگر اس کے بعد رسم الخط مروجہ سے واقف ہو گئے تھے اور یہ کوئی مشکل بات کسی اہل زبان کے لئے نہ تھی۔ ایک اور روز میں ہر ایک اہل زبان حرف شناس ہو سکتا ہے۔ مگر خوش خط تو مشق سے ہی ہو سکتا ہے۔ اُن حضرت نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جو کچھ کاتبان وحی لکھتے آپ بھی پڑھ کر اطمینان کر لیتے۔ مگر مولوی صاحب کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہوا۔

جو شخص احادیث کا مطلق انکار کر دے۔ اس کے لئے مشکل یہ ہے کہ مروجہ نماز کو اگر وہ اسے صحیح سمجھتا ہے یا تو قرآن سے ثابت کرے یا قرآن سے کسی اور صورت کی نماز پیدا کرے۔ مولوی صاحب نے آخری روش اختیار کی اور قرآنی نماز بھی اختراع کی۔ مولوی صاحب کو اتنا خیال نہ آیا کہ سلوٰۃ کی تشکیل اُن حضرت کی دی ہوئی ہے جس طرح مولوی صاحب نے تشکیل آیات قرآن کی رو سے دی۔ اسی طرح اُن حضرت نے بھی دی اور اُن حضرت کا "تفقہ" مولوی صاحب کے تفقہ سے زیادہ معتبر ہے۔ یہ امر کہ آنحضرت نماز میں آیات قرآن ہی تلاوت فرمایا کرتے۔ صحیح ہے لیکن ایسے فقرات بھی استعمال کئے جائیں جو مروجہ ہیں تو کون سا شرک لازم آتا ہے۔ مگر ہم سخن فہم میں کسی کے طرف دار نہیں نہ مخالف ہیں۔ قرآن میں جو دعائیں انبیاء کی مذکور ہیں وہ آخر انبیاء کی احادیث ہی ہیں اور جو دعائیں سکھائی گئی ہیں وہی ہی اور یہی بہتر ہیں۔ غرض تو اللہ کی حمد و ثنا اقرار عبودیت و عجز ہے۔ اللہ تو دونوں کو دیکھتا ہے اور اس کو جو دل کسب کرتے ہیں۔ سلوٰۃ پر ہم نے علیحدہ بحث کی ہے۔

امرت مسلمہ | امت مسلمہ کی طرح تو حضرت ابراہیم نے ڈالی تھی۔

”ربنا واجعلنا مسلمین لك ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ“ (۱۵)

”اے پروردگار تو ہمیں اپنا ہی فرمان بردار بنا اور میری اولاد سے (جو میرا اتباع

کرنے) ایک امت اپنی فرمان بردار بنا۔“

امرت سر میں چند زندہ دلوں نے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام امت مسلمہ رکھا

ان ایام میں امرت سرمد بھی مناظرات کا اگھاڑہ تھا۔ آریوں نے آریں ڈیٹنگ کلب قائم کی ہوئی تھی۔ اور مسلمانوں کو بھی دعوت مناظرہ دیتے۔ مجھے بھی کبھی کبھی شرکت کا اتفاق ہوتا۔ علماء اسلام بھی بحث میں حصہ لیتے مولانا ابوالکلام آزاد ان ایام میں دفتر وکیل امرتسر سے منسلک تھے۔ ایک دن میں آپ کو بھی اس کلب کے جلسہ میں لے گیا۔ آپ نے موضوع زیر بحث پر برہنہ تقریر کی۔ اردو ٹیکسالی زبان اور آپ کی روانی کا وہ رعب چھایا کہ پنجابی آریوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ لیکن یہ گفت و شنید اغیار کے ہاں ہوتی تھی۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی تقلیداً ایک محفل مناظرہ کی طرح ڈالی۔ اس کے بعد چند مفکرین نے ادارہ "امت مسلمہ" قائم کیا۔ غرض یہ تھی کہ ہر ایک فرقہ اور عقیدہ کا مسلمان اس میں شامل ہو بخواہ وہ اپنے عقیدہ پر ہی قائم ہو مگر "مسلم" ہو۔ اور اسلام کا بول بالا چاہتا ہو نہ کہ اپنے فرقہ کا۔ اس ادارہ کی قیادت مولوی احمد دین صاحب فرما رہے تھے۔

ان ایام میں اہل حدیث کا زور تھا۔ امرتسر میں اہل حدیث کے تین بڑے پایہ کے عالم گزرے ہیں۔ ایک مولوی عبداللہ غزنوی اور دوسرے مولوی غلام علی صاحب قصوری اور تیسرے مولوی حاجی احمد اللہ صاحب۔ اول الذکر دو غالباً میری پیدائش سے پہلے یا میرے بچپن میں فوت ہو چکے تھے۔ آخر الذکر مولوی میر احمد اللہ صاحب امرتسر کے روسا میں سے تھے۔ تلمذ کا فخر لڑکپن میں مجھے بھی حاصل رہا۔ ان ہی کا شاگرد مولوی ثناء اللہ تھا جو بعد میں امیر جماعت اہل حدیث تسلیم کیا گیا۔ اس وقت مولوی صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔

ادارہ امت مسلمہ کے بانی نو مولوی احمد الدین اور ان کے رفقا کلام میاں مولانا بخش سوداگر صاحبوں اور دیگر اصحاب تھے۔ یہ شرکت کی ہندیا زیادہ دیر کا راند نہ رہی بلکہ آخر چوراہے میں پھوٹی۔ اہل حدیث سے ٹکری لینی پڑی۔ امت مسلمہ کا عقیدہ تھا کہ احادیث صحیحہ سے واجب فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ان حضرات

کا بشری کلام ہے اور "حجت شرعی" نہیں۔ اہل حدیث اسے "وحی" کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر مولوی ثناء اللہ اور مولوی احمد الدین میں تحریری مناظرہ ہوا۔ مولوی ثناء اللہ بہت بلند پایہ مناظر تھے مگر شکست کھا گئے۔ مناظرہ شائع ہو چکا ہے۔ مولوی احمد الدین مرحوم سے میرے مراسم بھی دوستانہ تھے اور مولوی ثناء اللہ صاحب سے بھی۔

مولوی احمد الدین صاحب کی سادگی لباس اور عام معاشری امور میں اور اور تقویٰ اور سستی پرستی کی مثال اس زمانہ میں مشکل ملے گی۔ ایک ماہانہ "البلاغ" حکیم شہاب الدین کے زیر ادارت شائع ہونے لگا جس میں مولوی صاحب کی تفسیر بیان للناس بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ علاوہ انہیں اور بھی موضوع تھے جس پر مولوی صاحب واہ تحقیق دیتے رہے۔

مولوی صاحب کی تفسیر پر میں نے بھی تنقید کی۔ آپ نے سر سید احمد خاں کی طرح "ذلت الکتب لا ریب فیہ" کی تفسیر کرتے ہوئے "الکتب سے مراد قرآن ہی ہے۔"

میری تنقید بلاغ میں شائع ہوئی۔ کتاب حق پرست، طالب حق یہ شخص تھا کہ تسلیم کر لیا کہ "الکتب" کتاب فطرت ہے۔ اس کے بعد آپ نے تفسیر میں کتاب فطرت ہی معنی مراد لئے۔

امت مسلمہ یہ جانتی تھی کہ جب قرآن میں ہمارا نام "مسلمین" ہی مقرر ہو چکا ہے اور اسلام دین اللہ ہے تو ہر ایک مسلمان کو اللہ ہی کے نام سے وابستہ رہنا چاہئے۔ بشری شخصیت سے وابستگی اگر جائز ہوتی تو ان حضرات کا زیادہ حق کہ ہم "محدی" کہلاتے جیسا کہ نامسلمان ہمیں کہتے ہیں۔ اس لئے کسی بشری شخصیت سے کسی مسلمان کا اپنے آپ کو وابستہ کرنا نہایت ناواجب ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ بشری شخصیت سے کوئی اپنے آپ کو وابستہ کر لیتا ہے تو وہ اس کا نام کا پوجاری بن کر رہ جاتا ہے۔ کسی شخص کے علم و فضل اور تحقیق سے فائدہ اٹھانے

تبصرہ

در مشرب زین و از قریب مذاہب بگریز
افیت نیست در آن بزم کہ سازش جنگ است

ان اوراق کے مطالبہ کے بعد غالباً ہر ایک طالب حق کے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہونا چاہیے کہ جس شخص کی نظر شروع سے آخر تک تمام مذاہب اسلامیہ پر ہے اسے یہ بھی بتانا چاہیے کہ ان میں سے حق پر کون ہے۔ یہ منصب میرا نہیں میں تو ایک مورخ ہوں۔ لیکن جہاں تک میری ذاتی شخصی رائے ہے وہ یہی ہے کہ ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو حق پرست ہی یقین کرتا رہا اور کرتا ہے۔ اگر اس پر اس کا یقین نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ دیدہ و ناشدہ باطل پرست نہ ہوتا۔ اس لئے ہر ایک شخص خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے تھا یا ہے نیک نیتی سے یہی سمجھتا رہا اور سمجھتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ اور اگر ہم ذرا ان مذاہب سے الگ ہو کر ان کے دلوں کو ٹٹولیں تو جو تصویق ان کے ذہن میں ہے وہ ان کے عقائد کے عین مطابق ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آیا یہ تصور صحیح بھی ہے کہ نہیں؟ سخن دہیں است۔

”حق“ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مستقل، اور دوسری غیر مستقل۔ یاد رہے لفظوں میں جو زیادہ مناسب ہیں یوں کہتے کہ ”حق“ جو ہر ذاتی ہے۔ اور بعض جواہر یا وصف اضافی بھی ہیں جو غیر مستقل ہیں۔ اس کی مثال خود قرآن ہے ”شجرہ طیبہ“ میں دی ہے کہ اس کی اصل ثابت اور فرع آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے اور ایک

موسم پر اپنی بہار دکھانا اور پھل لاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اصل تو ہمیشہ ثابت ہی ہے لیکن فرع، شاخیں اور پتے اور پھول اور پھل ^{طریقہ} لومی اور جھڑتے اور گرتے رہتے ہیں۔ یہ غیر مستقل شے ہے۔ یہ ہیں وہ مذاہب یا فرقے جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔

”اسلام“ اصل ہے۔ باقی سب فروع۔ یہ فرقے اپنے اپنے وقت پر بہار دکھا گئے۔ ان میں سے اکثر ختم ہو گئے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی پہلی سی رنگینی کے ساتھ جلوہ نما نہیں۔ جو طبائع تقلیداً رجعت پسند پرانی لکیر پیٹ رہی ہیں ان کی توجیہ نفسیات میں تلاش کرنی چاہیے۔

اہل تحقیق کو چاہیے کہ ان کو حال پر چھوڑ دیں۔ اگر وہ دیدہ بصیرت سے اس حقیقت کو نہیں دیکھتے کہ ان کا مذہب مٹ چکا ہے تو وہ رفتہ رفتہ خود مٹ جائیں گے اور قومیں اسی طرح مٹتی رہی ہیں۔ ایک کہنہ شاخ خزان دیدہ و بریدہ و فرسودہ کو زمین میں گاڑنے سے سرسبز و رخت نہیں بن سکتا۔

لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ ہمیں اصل درخت سے وابستگی کے بعد انہی شاخوں اور پتوں اور پھولوں اور پھلوں سے سروکار ہے۔ اصل تو غیر مرنی شے ایک ذہنی حقیقت ہے۔ لیکن جو کچھ محسوس ہو رہا ہے وہ اس کی فروع ہی ہیں اور اصل کا مقصد بھی یہی ہے۔ اصل کا ظہور انہی فروع میں ہوتا ہے اور ہمارا اصل کا شعور بھی اسی ظہور پر منحصر ہے۔ اس لئے اصل سے وابستگی اس کے فروع سے وابستگی ہے۔ مگر سوال وہی مستقل اور غیر مستقل کا ہے۔ جب اصل کسی شاخ یا پتے یا پھول کو اپنے آپ سے جدا کر دیتا ہے تو ہماری ہزار صنعت بھی پیوستہ نہیں کر سکتی اگر ہم ”لا احب الالفین“ کے مفہوم کو ذہن نشین کر لیں تو یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ معیار صداقت کیا ہے۔

ارشاد قرآن ہے کہ

”اللہ تعالیٰ کسی قوم کے معاملات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی

ذہنیت کو خارجی حالات کے مناسب، نہ بدلے:

یہ ناقابل تغیر و تبدیل قانون فطرت یا سنت اللہ ہے۔ خارجی حالات کا تقاضا اہل عقل و فکر پر منکشف ہوتا ہے۔ جن کا ذہن ہوا و ہوس سے پاک ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہمیں بدلے ہوئے حالات خارجی کے ساتھ اپنی ذہنیت کو بھی بدلنا چاہیے۔ یہ مطالبہ دین اسلام کا ہے جس کے تحت حالات بدلتے ہیں۔ لہذا اسلمن فی السموات والارض مزید بحث ہم اس کتاب کے خاتمہ پر کریں گے۔

سروست ہمیں مذاہب اسلامیہ پر تبصرہ کرنا ہے۔ ان میں خاص خاص امتیازی باتیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) بانی مذہب کے نام سے وابستگی

اس نام سے وابستگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا۔ مان لو کہ جو کچھ اس شخص نے کہا صحیح تھا۔ اگر یہ اس کی ذاتی اختراع یا صنعت تھی۔ جسے لسان قرآن میں "من دون اللہ" کہا گیا ہے۔ تو قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن کوئی فرقہ یہ نہیں کہتا بلکہ اس کے اقوال کی سند قرآن و حدیث پیش کرتا ہے۔ مان لو کہ یہ صحیح ہے لیکن جو کچھ اس نے کہا یا کیا اپنے خارجی حالات کے تقاضا کے تحت کہا یا کیا حالات بدلے تو وہ تقویم پارینہ ہیں۔ اس کے ساتھ نام بھی مٹنا چاہیے۔

(۲) بانی مذہب سے الوہیت کا درجہ منسوب کرنا۔

یہ متعدی مرض عام و بابے۔ حقیقت یہ ہے کہ بشری نام "من دون اللہ" سے وابستگی کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بانی مذہب کو خدائی درجہ دیا جائے۔ اور اس نام کی پوجا کی جائے۔ مسلمانوں کے بعض فرقوں کا یہ عقیدہ ان کی اپنی اختراع نہیں مسیحی دنیا مسیح کو یہی درجہ دیتی ہے۔ اور اگرنا مسلمانوں کے مذاہب کا جائزہ لیا جائے تو یہی عقیدہ ان کے مذاہب کی بنیاد ہے۔ ہر ایک پست ذہنیت ہو محکوم و مغلوب و مقهور رہنا چاہتی ہے، تنگ انسانیت ہے۔ اسی عبودیت و عبدیت "من

دون اللہا نے شجر و حجر اور اب بشر کی پوجا پر ترغیب دی۔ اور اسی کے خلاف قرآن کا فتویٰ ناطق ہے کہ یہ شرک ناقابل معافی گناہ ہے۔ تمام فتنہ و شر اور جنگ و جدل اور عذاب انہی ناموں اور اسی عبدیت میں دون اللہ کا پیدا کردہ ہے۔
 "فهل انتم مسلمون"

(۳) یہی دو باتیں ہیں جو غیر اسلامی ہیں۔ باقی رہا سوال فقہی احکام شریعت کا رہنما کا اس میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہی واضح دلیل ہے کہ
 "عرض شیشہ تھی نیست نسخہ تحقیق"
 "تو آنچہ کردہ از خویش انتخاب شک است"

ہر ایک فقیر نے تاحد نظر خارجی حالات کا جو ہمیشہ بدلتے ہیں جائزہ لیا۔ اور کوشش کی کہ اپنے زمانہ کی ذہنیت کو اس کے مطابق ڈھالے۔ یہ اس کے اپنے اجتہادات عقلیہ ہیں۔ یہ کوشش بھی مستحسن اور عجاہت و ادوات بھی صحیح لیکن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں سب تقویم پارینہ ہیں۔

"گر بو حنیفہ در زمان ما بودے فقہ دیگر می نوشت"

یہ اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ قرآن نے ہمیں نبوت یعنی دینی حکومت اور ملوکیت یعنی دنیوی حکومت سے آزادی کی سند من جانب اللہ عطا کی ہے اور احکام کا وضع کرنا جو ایام جاہلیت میں انبیاء کا کام تھا اب "شوری" کا فرض ہے ترقی یافتہ قومیں "پارلیمنٹ" اور "مجالس و اصحاب قوانین" میں یوں خدمت سر انجام دے رہی ہیں۔ اور یہ عین ارشادات قرآن عظیم کے مطابق ہے۔ اس موضوع پر بھی ہم بحث کر چکے ہیں۔

عالم انسانی کا اترہ مذہب

تا دیریں محفل تامل بر بساطِ حال ریخت
 سراغِ ماضی بگروش رنگ استقبال ریخت
 ورنہ این تباہ حال کو مستقبل و ماضی کدام
 قلقل و ہمہ پست کزینا فی قریل و قال ریخت

ہم نے مذاہبِ اسلامیہ کے گذشتہ و حاضرہ حالات بالا اختصار قلم بند کئے
 ہیں۔ مورخ جو واقعات کی رفتار دیکھتا ہے اترہ زمانہ کے متعلق بے پیشگونی کر سکتا
 ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ہم مذاہبِ یا مذہب کو دنیا سے اسلام میں محدود رکھتے
 لیکن اسلام عالمگیر دینِ الفطرت ہے۔ اور آج بھی تمام عالم انسانی اس کے زیر اثر
 ہے خواہ کوئی قوم اس کا واسطہ یا نادانستہ اعتراف نہ کرے۔ ہم واضح کر چکے کہ
 "ان العزیز عند اللہ الاسلام" یہ کسی بشری شخصیت کی اختراع نہیں بلکہ
 اسلام من فی السموات والارض تمام کائنات کا نظم و نظام اسی سے قائم
 ہے۔ اس لئے اسلام نہ صرف عالم انسانی بلکہ کل کائنات کا دینِ الفطرت ہے۔
 چونکہ اُن حضرت کا خطاب بحیثیتِ رسولِ کل عالم انسانی سے ہے۔ دیکھنا یہ
 ہے کہ اس دین کی حقیقت کیا ہے جسے عالم انسانی کو طوعاً و کرہاً قبول کرنا
 پڑے گا۔

ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ کائنات پر ہر آن تغیرات واقع ہوتے ہیں اور

ذہن انسانی پر انہی کے مناسب تبدیلی ہو رہی ہے۔ خارجی اور ذہنی حالات کے تغیرات ارتقا کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ کی نسبت محققین یورپ کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ اس کامیاب شخصیت کی نظیر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن عظیم تو "بلاغ" ہر ایک زمانہ کے ذہن بلند و پست تک رسا ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنے زمانہ کے ذہنی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اصلاح اسی حد تک کی جس حد تک ان حالات نے اجازت دی جو مصلح اپنے زمانہ کا ساتھ دیتا ہے زمانہ اس کو پہچانتا ہے جو اپنے زمانہ سے آگے بڑھا ہوا ہو۔ اپنے زمانہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جب زمانہ آگے چل کر اس کی ذہنی سطح پر آتا ہے تو وہ پہچانا جاتا ہے۔ مصلحان کی ذہنیت کا درجہ اپنے زمانہ کے عام فہم ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔ مصلحان کی ناکامیابی کا سبب ایک "تعالیٰ" ہے جس پر ہم بحث کر چکے ہیں اور قرآن حکیم نے اس کی مذمت فرمائی ہے۔ لوگ اپنے آبا و اجداد کی روش بدلنا نہیں چاہتے۔ لیکن خارجی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور کوئی شخص کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اپنی ذہنیت کو ان کے مناسب نہ بدلے۔ یہ ناطق قوی قرآن حکیم کا ہے۔ جس کا حوالہ ہم دے چکے ہیں اور کل اہل علم و حکمت کا متفقہ فیصلہ بھی یہی ہے۔

خیر یہ تو وقتی کامیابی تھی اور بلاشبہ عظیم الشان کامیابی تھی۔ وقتی کامیابی کئی ایک کو حاصل ہوتی لیکن ان کی وفات کے بعد

"زمانہ و گروں آئیں نہاد"

اں حضرتؐ کی دائمی کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپؐ نے بحیثیت بشر رسول اپنے آپ کو پیش کیا۔ "قل انما انا بشر مثکم"۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپؐ سے پیشتر جتنے بھی انبیاء و رسول اور رشی مئی اور اوتار جن کو مشرکین خدا اور خدا زادے سمجھ کر پوجتے تھے سب بشر ہی تھے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو کل عالم انسانی میں اہل علم و حکمت نے تو اعتقاداً تسلیم کر لیا خواہ ان کا قومی مذہب غیر اسلام ہے

”کارلائل“ نے مشاہیر اور مشاہیر پرستی (ہیر و اینڈ ہیر وورشپ) میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

”آن حضرت کی بعثت کے بعد کون یقین کرے گا کہ جو بعد میں خدا اور خدا زادے سمجھے گئے ان کے ہم عصراں کو ایسا ہی سمجھتے تھے؟ اور آئندہ تو کوئی شخص کسی بشر سے الوہیت منسوب نہ کرے گا۔“

غالباً کارلائل کا اشارہ اہل عقل کی طرف ہے۔ لیکن جو پست ذہنیت رکھتے ہیں اور ان کی کمی عوام کا لانعام میں نہیں وہ ابھی تک ایام جاہلیت کی خصوصیات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ مگر زمانہ بہت کچھ ذہنی ترقی کر چکا ہے اور اس ارتقا کے ساتھ یہ پست فطرت مٹتے جا رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جائے گی کہ

چہ ممکن است رد ذواغ بندگی ز جبین
ز میں فلک شود و آدمی خدا نشود

عالم انسانی اس دعویٰ کا کہ ”انا بشرٌ مثکم“ کبھی انکار نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں تو کوئی شخص جس میں تقوٰی سی عقل ہو کبھی تسلیم نہیں کرے گا۔ لیکن اس دعویٰ کے نتائج بہت دور رس ہیں۔ جب ایک شخص ہماری ہی مثل ایک بشر ہے تو اس کا کیا حق ہے۔ کہ اپنے ہی ہم جنس انسانوں میں علو اور برتری کی خواہش کرے۔ اور کیا تمام کائنات میں کوئی اپنے ہم جنس کو برتر سمجھتا ہے؟

بیدل بحصول رفق آنا وہ بسر
سگ چا کر سگ نکشت و خربندہ آخر

از مختراعات کار گاہ امکان
این تنگ شعور نیست جز صنع بشر

قرآن میں ان ایام کو ”جاہلیت“ سے موسوم کیا گیا ہے جو آنحضرت کی بعثت سے پیشتر عالم انسانی پر گزرے۔

ارشاد ہے کہ

”افحک الجاهلیۃ یتبعون ومن احسن من اللہ لقرم

یوقنون“ (۱۱)

”تو کیا یہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور کون ہے جو اللہ سے حکم میں بہتر ہے
اہل یقین کے لئے“

یہی اعلیٰ و ادنیٰ کا تصور تھا جو عوام الناس کے دماغ میں بطور مذہبی عقیدہ
ٹھونس گیا اور یہ ایک خصوصیت ایام ”جاہلیت“ کی تھی۔ کئی فرعون اور کئی چندرا اور
سورج بنسی دیوتاؤں کی اولاد ہوئے جن کا تذکرہ تاریخ کے صفحات پر موجود ہے
اسی پست ذہنیت نے اہم میں آبا و اجداد پرستی جاری رکھی۔ ہر ایک قوم میں اونچ
نیچ کے علاوہ ہر ایک قوم ہمسایہ قوم کو ملیچھ، اور ایسے ہی ناپاک المقاب سے تعبیر کرتی،
ارشاد قرآن ہے کہ

”تلك الدار الاخرة جعلها للذین لا یریدون علوٰ فی الارض ولا فسادا

والواقبة للمتقین“ (۱۲)

”وہ دار آخرت ہم نے ان لوگوں کے لئے بنایا ہے جو زمین میں نہ تو برتری چاہتے

ہیں اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اور انجام نیک راستیازوں ہی کا ہے“

یہ آیت حضرت موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل کے ایک فرد کے حالات میں واقع

ہوتی ہے۔ جس کا نام فارون تھا۔ یہ ایک امیر کبیر آدمی تھا اور اب ضرب المثل ہو گیا

ہے۔ کسی بہت بڑے سرمایہ دار کو اسی نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اسے کہا جاتا کہ

”اللہ نے تجھے یہ دولت و ثروت دے رکھی ہے۔ اس میں سے اپنی قوم کے مفلس طبقہ

کی بہتری کے لئے بھی کچھ فی سبیل اللہ خرچ کر“ تو جواب یہ دیتا کہ

”انما اوتیتہ علی علم عندی“ (۱۳)

”یہ مال و دولت تو مجھے ذہنی تفوق کی وجہ سے ملا ہے“

اگرچہ اب لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ عالم انسانی میں اعلیٰ و ادنیٰ ذاتوں کا امتیاز

بالکل غیر فطری ہے۔ لیکن ”علی علیہ عندی“ کی رٹ سرمایہ دار اب بھی لگا رہے ہیں اور

اقتصادیات کے عالم بھی یہی کچھ کہتے ہیں کہ جن کے ذہنی درجات بلند ہیں۔ اور جو ماہرین فن ہیں ان کا حق ہے کہ بہ نسبت ان اشخاص کے جو پست ذہن ہیں زیادہ مال حاصل کریں۔ یہ ان کے علم و ہنر کی کمائی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ نظریہ باطل ہے۔ تمام کائنات مفت انعام اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم کا ہے۔ اور تمام امکانات جو ذرہ ذرہ میں پوشیدہ ہیں اگر ان کا انکشاف کسی اہل حکمت پر ہوتا تو یہ بھی ایک فضل ہے جو اللہ ہی کا عنایت کیا ہوا ہے اور اہل علم تو اس میں بخل نہیں کرتے۔ اور اگر کریں تو ارشاد قرآن ہے کہ

وَالَّذِينَ يَخْلُونُ بِمَا نَهَى اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ سَخِرَ لَهُم مِّنْهُم مَّا يَشَاءُونَ
 وَشَرُّ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ مَا تَلَوْنَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
 (۴۰)

”اور نہ گمان کریں وہ لوگ جو اللہ کے فضل سے وٹے ہوتے ہیں بخل کرتے ہیں کہ ان کے واسطے خیر ہے بلکہ شر ہے۔ یہی جس میں بخل کرتے ہیں قیامت کے روز ان کے گلے کا ہار ہو جائے گا اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔“
 نیز ارشاد ہے کہ

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادَى رِزْقِهِمْ
 عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهَا سَوَاءٌ أَفَبِعَنَتِ اللَّهُ سِجْدُونَ“ (۱۱۶)
 ”اور اللہ نے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دے رکھی ہے تو وہ یہ قاضی رزق (جو ان کی اپنی ضروریات سے زائد ہے) لوٹا کر ان کو نہیں دیتے جو ان کے زیر دست ہیں (یہ امر واقعہ ہے اور انہی زیر دستوں کی محنت کی کمائی یہ رزق ہے) تاکہ اس میں دونوں میں مساوات ہو جائے۔ تو کیا اللہ کی نعمت کا (جو مفت ہے) انکار کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔“

امام رابعی مفردات میں لکھتا ہے کہ

”رزق ہر ایک شے میں ہے جو نفعہ ہو سکے اس میں مال و دولت و علم

وغیر ہم سب داخل ہیں۔

اگرچہ عالم انسانی نے قرآنی آیات محولہ کی صداقت اعتقاد تسلیم کر لی ہے مگر عملاً سرمایہ داری اسی جاہلی غلو کی ولادہ ہے جو فساد کا واحد سبب ہے۔ ہمارے زمانہ میں اشتراکیت جس کی ارتقائی صورت "کیونززم" ہے اتنی طاقت ور ہو چکی ہے کہ اس کی آغوش میں عالم انسانی کی اکثریت آ رہی ہے۔

"کارل مارکس" خود زیت حضرت ابراہیمؑ سے تھا۔ اور قرآن اور حکماء اسلام غزالی وغیرہ کے فلسفہ سے بھی واقف تھا۔ وہ اپنے ایک عقیدت مند کو متنبہ کرتا ہے جس نے اس کے نظریہ کی حمایت میں مضامین لکھے تھے کہ

"نظریہ کیونززم کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے۔ یہ تو سرمایہ داری کے خلاف

ایک موثر حربہ ہے اور سرمایہ داری کو تباہ کر کے رہے گا۔ لیکن سرمایہ داری

کے خاتمہ پر خود بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد کسی اور ہی "ازم" کا ظہور

ہوگا۔ اور آئندہ زمانہ کے مفکرین ہی بتائیں گے کہ وہ کیا ہے؟"

لیکن وہ اور اس کا رفیق کار انگریز اتنا اشارہ کرتا ہے کہ

"عالمگیریت و مساوات کا دور دورہ ہوگا اور انسان کی توجہ تسخیر کائنات

کی طرف لگ جائے گی۔ اور ذہنی اور مادی ارتقاء کے ساتھ انسانی معیاری

زندگی بلند تر ہو جائے گی۔"

ارشاد قرآن ہے کہ

"سارعوا الی مغفرة من ربکم وجنتہا عرضھا السموات والارض اعدت

للمتقین" (۲۰)

"اس اونی زندگی کی لوٹ کھسوٹ پر کیا لڑتے جھگڑتے مرتے ہو تیزی سے

بڑھو اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین

کا ہے۔ راست بازوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔"

نیز ارشاد ہے کہ

”سخر لکما ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذلک
 لآیت لِّقوم یتفکرون“

”اس نے اپنی رحمت سے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب
 کچھ تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں اہل
 فکر کے لئے۔“

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت کے بعد ہی اہل ذکر و فکر کی توجہ کتاب
 کائنات کے مطالعہ میں لگی اور جو کچھ عالم انسانی نے ذہنی اور مادی ترقی اب تک کی
 ہے۔ وہ اس تذکر و تدبیر و تفکر کا نتیجہ ہے جس کی طرف قرآن بار بار توجہ دلا رہا ہے۔ بلاشبہ
 آنحضرتؐ سے پیشتر بھی صحیفہ فطرت کا مشاہدہ اہل وحکمت کرتے رہے لیکن ارشاد
 قرآن ہے

”وما تستلمہ علیہ من اجیران ہوا ذکراً للعلیین“ وکاین من آیۃ
 فی السموات والارض یمون علیہا ”معرضون“ وما یؤمن اکثرہم باللہ
 الا وہم مشرکون۔ (۱۳)

”اور تو ان سے تبلیغ کا کچھ اجر تو مانگتا نہیں۔ یہ تمام عالم انسانی کے لئے ہر زمانہ
 میں ایک یاد دہانی ہے اور کتنی آیات آسمانوں اور زمین میں ہیں جن پر رآنکھیں رکھتے
 ہوئے (یونہی گزر جاتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور اگر مشاہدہ کرتے بھی ہیں تو ان میں
 سے اکثر خالص توحید الہی پر ایمان نہیں لانے شرک بھی کرتے ہیں۔“

یونان اور روم اور ایران اور ہندوستان میں بلند پایہ فلسفی اور اہل علم گزرے ہیں
 ان کے افکار سے ہم واقف ہیں۔ لیکن انہوں نے دنیا کے سامنے صنمیات
 (MYTHOLOGY) ہی پیش کی۔ وہ اجرام سماوی اور ارضی کو دیوتا اور دیویاں سمجھ کر پوجتے
 رہے جن کی نسبت قرآن کا ارشاد ہے کہ

”سورج ہو کہ چاند غرض سب کچھ جو کائنات میں ہے۔ انسان ہی کا
 خادم ہے۔“

انسان کہ فلک ہاں است ہر اقلندہ او در حیرت او گم است و اندہ او

فاروخا صیتے کہ در خارج و ذہن

ہر چیز کہ آفریدہ شد بندہ او :

قرآن نے انسان کے صحیح مقام سے ہمیں پہلی دفعہ روشناس کیا۔ اور مقام پر پہنچنے کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا۔ انسان اب دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا نہیں کرتا۔ مگر ہمارے زمانہ میں بعض سرمایہ دار قومیں "انارکھیا اڈ علی" کا دم بھری ہیں۔ وہ وقت دور نہیں کہ یہ اپنا انجام اپنے پیشرو فرعون کی طرح دیکھ لیں گی۔

غرض اس اعلان نے کہ "انا بشر مثکم" ایک انقلاب عظیم عالم انسانی میں پیدا کر دیا۔ سارے تیرہ سو سال کا عرصہ عالم انسانی کی تاریخ میں کچھ طویل نہیں۔ اس عرصہ میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اور جو کچھ متوقع ہے وہ اہل بینش سے پوشیدہ نہیں۔ اس اعلان میں انسانیت کا روح بول رہا ہے۔ جب ہم اس کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر لیں گے "ورنہ ستانی بہ ستم می رسد" اگر بخوشی خاطر اعتقاد اور عمل نہ سمجھیں تو بعد از ہزار سو سال خود بخود سمجھ لیں گے۔ اس وقت انسان اپنے مقام انسانیت کو پہچان لے گا۔ اور ہر ایک قسم کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

نا قابل انکار دعویٰ بشریت کے بعد دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ

"یوحی الی انما اللہکما اللہ واحد" فن کان یرجو القام ربہ فلیعلن علی صالی

ولایشرک بعبادۃ ربہ احد" (۱۶)

"مجھے وحی ہوئی ہے کہ تم سب کا اللہ ایک ہی ہے۔ تو جو بھی اپنے پروردگار کی ملاقات کا آرزو مند ہے تو چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اس کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔ یہ دعویٰ پہلے دعویٰ بشریت کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔

انسان کی فطرت میں "عبدیت" اور "عبودیت" ودیعت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو

کبھی شجر و حجر کو نہ پوجتا۔

"وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون"

"اور ہم نے جنت و ارض کو اپنی ہی عبادت کیلئے خلق فرمایا ہے"

کائنات میں بشمول انسان کوئی شے، احتیاج سے بے نیاز نہیں۔ انسان کو اپنی زندگی کے لئے ان تمام اشیاء کی حاجت ہے جو خارج میں موجود ہیں اور اس کی پیدا کردہ نہیں۔ اور اگر ذرا سوچے تو اس کی اپنی خواہشات، بھی اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں کوئی بھوکا اور پیاسا رہنا پسند کرنے کا جس کی شدت کا احساس ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے۔ ہماری خواہشات فی النفس اور اشیاء فی الافاق میں ایک فطری تعلق ہے جن سے ہمارے معدے اور قلب کو تسکین ہوتی ہے۔ فطرۃ اور عقلا تذکر اور تدبر اور تفکر سے ہم ان اشیاء کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور بقدر سعی و عمل حاصل کرتے ہیں تاکہ ہماری تسکین خاطر ہو۔ جس طرح انسان خود اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوا اسی طرح کوئی شے نہیں ہوتی اور سب محتاج ہیں۔ اس لئے بندگی بھی تحت المشعر حاجت نہ والی کہتا ہے۔

پست ہمت جاہل آدمی انہی اشیاء کی بندگی کرتے ہیں۔ ارض و سما میں ان کو دیوتا اور دیویاں نظر آتی ہیں حالانکہ یہ سب بے شعور اشیاء ہیں۔ ان دیوتا اور دیویوں کی حکومت تو ختم ہو گئی۔ اب ننگ شعور انسانوں کی حکومت رہ گئی۔ ایام جاہلیت میں یہ بھی راجے اور ملوک اور بادشاہ اور دیوتا اور اوتار ہی تھے۔ او حقیقت یہ ہے کہ

آنانا کہ غنی تراند محتاج تراند

سرباہ واد مزدور کی محنت کا محتاج ہے۔ اور مزدور نہ باہ واد کی سرمایہ داری کو اپنا سرپرست یقین کرتے ہوتے اس کا دست نگر ہے۔

غرض یہ عبودیت اور عبودیت ہوتی ہے فطرت انسانی ہے اور احساس احتیاج ہی ہے جو ہمیں بندگی کے دائرہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور انسان سے کسی صورت میں بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم نے یہ حقیقت واضح کرتے ہوئے انسان کا شرف اور فضیلت، کل اشیاء کائنات پر بالبداهت ثابت کی ہے۔ اہل فکر و ادب کائنات کی تسخیر میں لگے ہوئے ہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف مختاروں کی بندگی سے آزادی بلکہ کائنات کی تسخیر ممکن نہیں ہے۔ جب تک ہم ایک ذات یا ایتھائی کی عبادت یا شائبہ شرک نہ کریں۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ عہدہ ہیں اور ہر ایک شے کے محتاج ہیں۔ اس کی اب وہ ہی عورتیں ہیں کہ یا تو ہم خود اشیاء کو ایسا حاجت روا سمجھ کر ان کی پوجا کریں جیسا کہ

ایام واپسیت میں کرتے رہے۔
مان لو کہ اشیاء ہماری حاجت روائی کرتی ہیں۔ لیکن سورج جو صنمیاں میں سے ہے براہ یوں تسلیم کیا گیا ہے اسے کیا پڑی ہے کہ ہمیں حرارت پہنچائے اور روشنی دے۔ ہوا کو کس لئے مجبور کیا کہ ہم سے رشتہ تنفس جوڑے۔ پانی جو ہمارا مایہ زندگی ہے ہمارے پاس کیوں کھایا ہے۔ یہ ریشہ اشیاء خود بے شعور ہیں اور ہماری پیدا کردہ بھی نہیں اور سے تھاج میں موجود ہیں۔ یہ تعلق ہم سے ان اشیاء نے اپنی مرضی سے نہیں جوڑا کہ ایسی ہستی ضرور ہے اور واجب ہے کہ ہر جو مسخر کرتی ہے۔ جس نے یہ نظام کائنات رکھنا ہے۔ ہر حال ایسے وجود کی ہستی واجب ہے جو خود احتیاج سے بالاتر ہو۔ اشیاء میں خواص ہماری خواہشات کی طرح خود اشیاء کے پیدا کردہ نہیں۔ ہماری طرح محتاج ہیں۔

انسان بلکہ کائنات کی ہر ایک شے بوجہ احتیاج "عبدت ہے۔ اس لئے کسی نہ رنگ میں اور اپنے طور طریقہ پر ہر ایک شے بتوں انسان فطرتاً عبودیت کا طوعاً یا کرہاً کر رہی ہے۔ اس لئے ان میں سے کوئی ایک یا سب مل کر بھی مجبور نہیں ہو سکتے۔ حکماء کا ایک فرقہ وہ ہے جو دوسرے یا "ناستک" یا "ایتھی ایسٹ" کہلاتا ہے۔ یہ کسی ایسی ہستی کا قائل نہیں ہے اور مذہب "استد" پر مایسور گوڑے میں کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ان حکماء کا نظریہ صحیح ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ جو موجود ہے وہی کائنات ہے جو مشاہدہ ہو رہی ہے۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ کائنات کی ہر شے محتاج ہے اور انہی اشیاء کا مجموعہ کائنات ہے۔ اس لئے کائنات محتاج ہے۔ اگرچہ اشیاء کا احتیاج اشیاء ہی رفع کرتی ہیں۔ اس لئے ہم بھی

تسلیم کر لیتے ہیں کہ اگرچہ کائنات محتاج ہے مگر اپنی ضروریات زندگی بھی خود ہی پوری کرتی ہیں یعنی خود ہی عباد اور خود ہی مسبب ہے۔ اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان باہر عقل و دانش اور ذہنی ارتقا پھر سے ایام جاہلیت کی طرف رجعت کرتا ہے۔ اور مخلوق پرستی میں الجھ کر رہ جائے گا۔ جس حد تک وہ عابد ہے وہ اشیاء کا محتاج ہے۔ بلکہ اشیاء سے بڑھ کر محتاج ہے۔ اشیاء ہمیں کچھ نہ کچھ دیتی ہیں۔ یہ اشیاء کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ صرف لینا ہی جانتا ہے۔ اس کی احتیاج ہر ایک شے سے بڑھی ہوئی ہے۔ اگر ہوا ہم سے رشتہ متفق توڑے، پانی ہماری پیاس نہ بجھائے تو ہمانہی زندگی ناممکن ہو جائے۔ انسان مجسم احتیاج ہے۔ اس لئے "عبدیت" کا بھی مجسمہ ہے۔ تو انسان اور صرف انسان ہی ایک ایسی ذلیل ہستی ہے جو کائنات میں بوجہ احتیاج ہر ایک شے کی عابد ہے۔ لیکن ذہنی ارتقا رکھنے والے ساتھ انسان ان کی بندگی سے آزاد ہو چکا ہے۔ وہ ان میں تصرف کرتا ہے۔ وہ ان کو پوجتا نہیں ان کو اپنے کام میں لاتا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ انسان ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ پیدا کرنا تو ورکنار معدوم بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی ہی خواہشات نفس محو نہیں کر سکتا۔ کائنات پر تو اس کا کچھ بس نہیں چلتا۔ اپنے ہم جنس انسانوں پر اس کا زور چلتا ہے اور خواہش "علو کی وجہ سے جو فساد بھرو بریں برپا کرتا ہے وہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اس لئے اس کے اعمال کی پرکھش نہ ہو اور کائنات میں تو ایسی کوئی شے نہیں جو پرکھش کرنے والی ہو تو وہ کون سا عمل ہے جسے عرف عام میں گناہ یا جرم کہتے ہیں جو ان سے اولاد نہ زد نہ ہو جس میں حیلہ نفس اور زنجبوی فائدہ اسے زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔ اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ نظام معاشرت قائم نہیں رہ سکتا کہ انسان اتنا بے لگام ہو کہ دوسروں کے حقوق شہریت کا پاس نہ کرے اور یہ کہ اگر وہ ان کا پاس نہ کرے تو اس کے اپنے بھی حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے پسندیدہ نظام معاشرت کے قیام اور استحکام کے لئے ان آئین و قوانین کی پابندی واجب ہے جو وہ خود ہی بہ تقاضا سے حالات خارجی وضع کرنے پر مجبور ہے۔ حکما کا عام عقیدہ ہمارے زمانہ میں یہ ہے کہ ریاست (STATE) میں رہتے ہوئے اس کے

آئین و قوانین کے آگے تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ یاد دہانی سے نفلوں میں یہ کہو کہ

”سٹیٹ“ بمنزلہ معبود ہے اور تم سب اس کے ”عبد“ ہو۔

انسان غلط فہمی سے یہ سمجھتا ہے کہ میں آئین و قوانین وضع کرتا ہوں

”دماغ بہر وہ پخت و خیال باطل نسبت“

یہ آئین و قوانین بہ تقاضائے حالات خارجی وہ تنظیم و تشبیح کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ظاہر

ہے کہ یہ حالات خارجی ہی ہیں جو محرک ہیں اور یہ محرک ایسی زبردست ہے کہ اس کے

سوا چارہ نہیں کہ ان سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ہم آئین و قوانین کو آگے روڑ بدلیں

اور اگر ان کے مناسب نہ بدلیں تو ہم پر زہری جمود چھا جائے گا اور ہم دیر سویر منت جائیں گے

جیسا کہ قومیں مٹتی رہیں۔

ارشاد قرآن ہے کہ

ان اللہک یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم واذا اراد اللہ بقوم شیئ

فلا منور لہ وما لہم من دونہ من وال (۱۳)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے معاملات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت

کو خارجی حالات کے مناسب نہ بدلے۔ اور جب نہیں بدلتی تو اس قوم کے برے دن

حسب ارادہ الہی (اس کے قوانین فطرت یا سنت اللہ کے تحت) آجاتے ہیں اور اس سے

نہیں ٹلے اور اس کے سوا اور کوئی کار ساز بھی نہیں رہو بگڑی بناوے۔

اس لئے ظاہر ہے کہ یہ قوانین فطرت ہیں جنہیں لسان قرآن میں ”سنت اللہ سے موسوم

کیا گیا ہے جو کبھی تبدیل و تحول نہیں ہوتے۔ اور انہیں کے تحت تمام کائنات پر تغیرات واقع

ہوتے ہیں۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس پر کل حکماء کا اتفاق ہے۔ ان کا بھی جو واضح

قوانین انکار کرتے ہیں۔ اور انہی کی کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے طوعاً حکم و اراداً ہے

”لہ اسئل من فی السموات والارض طوعاً و کرہاً“

اسی اللہ کی حکم و ارادہ ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے جو شے خاطر یا ناخوشی سے

مشاہدہ ہو رہا ہے کہ ماسوی انسان ہر ایک شے اتباع قوانین فطرت طوعاً ہی کرتی

ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو اکثر کرنا تسلیم کرتا ہے اور عذاب کے منہ آتا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ انسان بھی طوعاً اسی طرح کرتا جس طرح دیگر اشیاء کر رہی ہیں۔ لیکن پھر وہ انسان نہ ہوتا۔ دیگر اشیاء کی طرح ہوتا۔

ان آئین و قوانین فطرت کو جس سے نظام عالم قائم ہے لسان قرآن میں "اسلام" سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کل کائنات کا دین ہے کوئی انسانی اختراع نہیں۔ اسی کو دین اللہ اور دین الفطرت بھی کہا گیا ہے۔

"فَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَخَافُونَ حَيْفًا فَبِطَرْتِ اللَّهُ الَّذِي فِطَرَ النَّاسَ عَلَيْهِمْ لَاتُتَّبِعُونَ لِحَقِّ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيُّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ" (۲۱)

"اپنی تمام تر توجہ ایک سو ہو کر اسی دین کی طرف لگا جو اللہ کی پیداوار میں مشابہ ہو رہا ہے جس پر انسان کی فطرت واقع ہوئی ہے۔ اللہ کا قانون فطرت کبھی نہیں بدلتا۔ یہ ہے دین درست و استوار۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

یہی دین القیم اسلام ہے۔ "ان الدین عننا شذوذ اسلام"۔ جو عالم اسلام انسانی کا آئینہ مذہب ہوگا۔ اور غیر اسلام کوئی اور مذہب قبول نہ ہوگا۔

"وَمَنْ يَتَّبِعْ آخِرَ الْإِسْلَامِ سَلَامًا يَكُنْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَخْرُجَ مِنَ الدِّينِ حَيْثُ أَصَابَ" (۲۲)

"اور جو بھی غیر اسلام کوئی اور دین چاہے تو اس سے تسلیم نہ کیا جائے گا اور وہ آخر کار خسارہ میں رہے گا۔"

اس حد تک کل حکم الہیات و طبیعات کا اتفاق ہے اور یہی دین الحق آنحضرت ص پر مکمل منکشف ہوا۔

"هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَجَعَلَ الْإِسْلَامَ شَرِيحَ الْوَسْطَىٰ" (۲۳)

"وہی اللہ ہے جس نے اپنا رسول عالم انسانی کی ہدایت کے لئے دین الحق کے ساتھ پہنچا دیا تاکہ اس پر (اور اس کے ذریعہ کل عالم انسانی پر) دین حق واضح ہو جائے اور

اس پر اللہ کی شہادت کافی ہے۔ حکما و طبیبات قساوون فطرت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن واضح قوانین کے بارے میں مذہب میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی دلیل انکار و اقرار کی تائید میں نہیں۔ انکار و اقرار دونوں بدلائل ثبوت کے محتاج ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ آئندہ ذہنی ارتقا کے ساتھ کوئی شہادت مل جائے۔ ان کو "لا ادریہ" (AGNOSTICS) کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر ان کی توجہ کا انہماک اس حقیقت میں ہوتا تو آئندہ زمانہ پر التوا کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا انکشاف گزشتہ ازمینہ میں کل انبیاء و رسل پر ہوتا رہا۔ جو اہل علم تھے اور اب بھی ہو سکتا ہے۔ اور اب تو سہل ہے کہ ان نفوس قدسیہ کی شہادت علمی بھی موجود ہے۔ بہر حال ذہنی ارتقا کا مذکور قرآن میں اس طرح ہے کہ

"فکیف تعقون ان کفرتم ایوماً یجعل الوالدان شیبا السماء منقلبہا" (۱۹)

وعدہ مفعول ان ہذا تذکرہ ثمن شہادت الخذالی زینہ سبیلہ (۱۹)

اب تو تم انکار کر رہے ہو اس دن تو تقویٰ کرتے ہی بنے گی۔ جب طفلان (کتب بھی) بڑے بوڑھے ہوں گی طرح باتیں کرتے ہوں گے۔ جب (اس ذہنی ارتقا کے ساتھ) آسمان کے حالات پوست کمدہ منکشف ہوں گے۔ اس دن کا وعدہ ہو چکے اور آکر رہے گا۔ یہ (قرآن) تو اسی دن کا تذکرہ ہے۔ تو جو بھی چاہے اپنے پروردگار کی طرف سیدھا راستہ اختیار کرے۔

قرآن بخلاف ان مذاہب کے جو راجح الوقت ہیں اور مسیحی و غیرہ ناموں سے

موسوم ہیں اور مخلوق سے وابستہ ہیں۔ عالم انسانی کو محمدی یا احمدی بنانے کے لئے نازل نہیں ہوا۔

ولیکن کوازابانین" (۲۰)

اس لئے نازل ہوا کہ تم اللہ والے بن جاؤ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کل انبیاء و رسل لوگوں کو اللہ والے ہی بنانے کے لئے مبعوث ہوتے رہے۔ لیکن عوام کی پست ذہنیت کا فائدہ اکثر اہل ہوا و ہوس نے اٹھایا خود تو گمراہ تھے لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

خلیقیت دین جنوں ہرگز نیرنگ زندگی امتزاع چندیں فرہنگ

من بندہ آن کہ در اوب گاہ شبسات

جو عشق مجنوں نساہ و وسیری رنگ

المختصر یہ قومی تعصب اور قومیت کا احساس مٹ جائے گا۔ اور باہم اختلاف

الوان و لسان جو فطری ہے انسان اپنے مقام "انسانیت" سے روشناس ہو گا۔ اور

حق یہ ہے کہ اب بھی اہل بندش سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں۔ لیکن جہاں طوفان تیز کی

برپا ہوا ان کی سفاکوں ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب یہ طوفان ختم جائے گا اور طبائع

میں ایک گونہ سکون پیدا ہو گا تو لوگ عقل و فکر سے کام لیں گے۔

یہی احتیاج جس نے فطری پاکیزہ جذبہ عبودیت کو ابداہل ہوا و ہوس کا آئہ کار

بنار کھا ہے اپنا صحیح مقام پہچان لے گا۔

ارشاد قرآن ہے کہ

ان یشاید ہیکم ویات بخلق جدید وما ذلک

علی اللہ لعزیز، ولا تنزدوا ذرۃ ذرۃ من الخوی۔ وان

تدع متقلدۃ الی حلدھا لا یجمل منہ شیء ولو کان ذا قوۃ دینا

"اگر اللہ چاہے تو در تمہاری امثال بدل کرے تم کو نئی پیدائش میں لے آئے

اور یہ اللہ پر کچھ مشکل نہیں اور اس خلق جدید میں اکوی ایک دوسرے کا بوجھ

نہ اٹھائے گا اور اگر کوئی کسی کو خواہ وہ اس کا قریبی ہی کیوں نہ ہو اپنا بوجھ اٹھانے

کے لئے کہے تو وہ کچھ بھی نہ اٹھائے گا"

ہر ایک شخص کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے اپنے کندھوں پر ہو گا اور اس سے

وہ کسی صورت میں سبک دوش نہ ہو گا۔ اور اس کی ایک ہی صورت ممکنہ ہے کہ

احساس "احتیاج" ختم ہو جائے گا۔ جس نے بندگان خدا کو بندوں کا بندہ

بنار کھا ہے۔ لیکن جب تک انسان "عبد" ہے اور واجب ہے کہ عید ہی رہے

اس لئے احتیاج بھی باقی رہے گا۔ اس کا بوجھ حقیقی حاجت روا کی طرف

ہو گا۔

دونوں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہوگا۔ اگرچہ اس حالت کا صحیح تصور صاف صاف اور ہمیز موجودہ ماحول میں مشکل ہے۔ لیکن قرآن حکیم اکثر آیات میں یہ حقیقت بیان فرما رہا ہے کہ

”بندوں کی بندوں پر ہر ایک قسم کی حکومت ختم ہو جائے گی اور

ایک ”اعدواحد العباد“ کی بلا واسطہ ہوگی۔ بلا واسطہ تو اب بھی

ہے۔ واسطے خود اہل و ہوس نے پیدا کر رکھے ہیں۔ انہی کا خاتمہ

ہو جائے گا۔“

انسان کے تعلقات انفرادی جنسیت میں ایک تو اس کے ہم جنس

انسانوں سے دوسرے کائنات سے تیسرے خالق کائنات سے ہیں اور

تمام مذاہب کا موضوع بحث بھی یہی ہے کہ یہ تعلقات انسان کن طرح

خوش اسلوبی سے نباہ سکتا ہے، اور یہی موضوع ہمارے تمام علوم و فنون

کا ہے۔ یہ اہم مستقل موضوع ہے۔ اس کتاب میں تفصیلی بحث کی گئی

نہیں۔ قرآن عظیم خود کتاب علوم نہیں کتاب اصول علوم ہے۔ انسانی

علوم کبھی کبھی حاصل نہیں ہو سکتے، ہمیشہ تغیرات ان پر واقع ہوتے رہتے ہیں۔

اور ان تغیرات کے محرک قوانین الہیہ ہیں جو خود تبدیل و تجویز نہیں ہوتے

یہ اصول علوم ہیں اور انہی کی تفصیل اور بیان قرآن عظیم ہے

تفصیل ”الکتاب الاریب فیہ من رب العالمین“ اور

”ہذا بیان لنا میں“

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ”الکتاب“ صحیفہ فطرت ہے۔ اور ہمارے ہاں

یہ واحد معیار صداقت ہے۔ جس میں کوئی شک و ریب نہیں۔ اسی پر کھونا

کھراہ کھایا سکتا ہے۔ اسی کو قرآن میں ”ام الکتاب“ سے موسوم کیا گیا ہے

”بمجرأ اللہ ما یشاء و یشئ و عندہ ام الکتاب (۱۱۱)

احم۔ و الکتاب المبین۔ انا جعلناہ فینا ناً عربیاً

لعلکم تفقون ، وانہ فی امر الکتب لعلنا لعلی
حکیم (۲۵)

” جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور ثابت رکھتا ہے اور اس کے
پس ام کتاب ہے۔ قسم ہے کتاب مبین کی، ہم نے ہی اسے عربی
زبان میں قرآن بنایا تاکہ تم سمجھ سکو۔ اور تحقیق وہ ہمارے پاس ام
کتاب میں ہے۔ جو بلند مرتبہ حکمت سے معمور ہے۔“
اسی کو ”کتاب مکنون“ بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے حقائق پوشیدہ

”الغیب“ میں۔

”انہ لقرآن کریم، فی کتب مکنون، لا یسہ الا
المطہرون، تنزیل من رب العلمین (۲۶)“
”تحقیق یہ قرآن کریم کتاب مکنون میں ہے جسے پاک نفوس ہی چھو
سکتے ہیں تمام کائنات کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔“

اسی کو کتاب مبین بھی کہا گیا ہے۔

”قلین۔ قلت آیات الکتب وقرآن مبین ہدی و

بشر للمؤمنین (۱۹)“

”یہ ہیں آیات قرآن کی اور کتاب مبین کی، ہدایت اور بشارت
اہل ایمان کے لیے۔“

چونکہ قرآن اسی کتاب کا بیان ہے۔ اس لیے قرآن بھی مبین ہے۔
اور قلت آیت الکتب وقرآن مبین (۲۷) وہ آیات ہیں کتاب کی اور قرآن مبین کی۔
”و اللہ تعالیٰ اسی کتاب کے ذریعے نفوس قدسیہ سے کلام وحیا یا

من وراء حجاب فرماتا ہے۔“

”و اتل ما ادھی الیک من الکتب (۲۸)“

”پڑھ جو کچھ تجھے کتاب سے بھی کیا جاتا ہے۔“

تمام پوشیدہ حقائق اسی "کتاب مبین میں ہیں۔
وما من غائبة في السماء والارض الا في كتاب

مبین (۱۱)

"ور زمین اور آسمان میں کوئی پوشیدہ امر نہیں جو کتاب مبین میں نہیں ہے۔
کلام "من وراء حجاب" کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ خارجی کائنات کی
اشیاء کے تصورات ہیں اور یہ صورتیں ہیں جن میں حقائق اشیاء درونما ہوتے ہیں۔
بیداری میں ہم عقلاً مذکور و تذکرہ و تظہر سے ان حقائق پر مطلع ہوتے ہیں۔ اور
خواب میں بلا ارادہ ہی صورتیں یا ان کے تصورات ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ فرق صرف
اتنا ہے کہ خواب میں ہمارے حواس ظاہری کا حجاب اٹھ جاتا ہے اور ہمارے
قلب کی قوتیں اپنی پوری قوت سے مگرم عمل ہوتی ہیں۔ تمام کائنات جس کا نقش ہمارے قلب
پر ارادہ یا بلا ارادہ ثبت ہو چکا ہے۔ اب خارجی سے ہمارے نفوس میں آچکی ہے
اگر ہمارے نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ بذریعہ تقویٰ ہو چکا ہے تو اس
میں جسے لسان قرآن میں "طل" سے موسوم کیا گیا ہے اور کائنات خارجی
میں عین مطابقت ہوگی اور اسی مطابقت کا شور ہے جسے "علم" کہتے ہیں۔

چھپت علم، اس قدر بیچوں

نظم جمعیت، ظہور و بطول

ہم بیان کر چکے ہیں کہ کتاب کائنات مہر ہے اور اس کی زبان کے
حروف ہیں۔ ان صورتوں کو ان حقائق سے جو ان میں درونما ہوتے ہیں۔
خاص مناسبت ہے۔ اگر اس تعبیری زبان سے واقف ہوں اور نظر واقف
ہوں تو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ پھر جو کچھ اشیاء ہم سے بیداری اور خواب میں کلام
کرتی ہیں۔

نطق آہستہ، نطق تاک و نطق کل

سنت محسوس، حواس اہل ذرا

ارشاد قرآنی ہے کہ

”وَلَدِينَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ (۱۱/۱۰۰)

”اور ہمارے پاس کتاب ہے جو سچ ہی بولتی ہے“

اس حقیقت کے فہم کے لیے زیادہ ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں، ہمارے تمام عملی اکتشافات ناممکن ہوتے اگر اشیاء کائنات ہم سے گفتگو نہ کرتی۔ اہل فکر کو بیداری میں بھی جب کامل انہماک کسی موضوع میں ہوتا ہے تو ان پر خواب کی سی حالت طاری ہوتی ہے وہ اس موضوع پر جب کامل توجہ مبذول کرتے ہیں تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتے ہیں فہم و تفہیم کے لیے یہ اشارات جن میں سے ہر ایک مستقل موضوع ہے کافی ہیں۔ عالم انسانی کا آئندہ مذہب یہی ”دین الحق“ ہوگا۔ لیکن جب تک عالم انسانی اس منزل تک پہنچے اسے کچھ مرحلے بھی طے کرنے میں، اور اسی راستے کو اختیار کرنا پڑے گا جو

سیدھا منزل مقصود تک جاتا ہے۔ اسے قرآن میں ”صراط مستقیم“ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس صراط مستقیم پر قرآن انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ انسان کج روی بھی اختیار کرتا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ ایسا گمراہ شخص عذاب کے سزا آتا ہے۔ اور کس ندیدم کہ گم شدہ از روہ راست۔ ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان خواہ کتنی ہی کج روی اختیار کرے۔ اور اگر چاہے اس راستہ پر نہیں آتا اسے کراہنا پڑتا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو عالم انسانی میں ایک تنفس ہی ہلاکت سے نہ بچتا۔ ”ایحسب الانسان ان یتروك سجداً“ ”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا تقاضہ ہے کہ انسان کو گمراہی سے بچائے۔ اور اگر نہ بچاتا تو یہ ذہنی اور مادی ترقی بھی ناممکن ہوتی

”صا من دابة الا هو اخذ بناصيته ان ربي على صراط

مستقیم (۱۲/۱۰۰)

”اور کوئی چنے والا ایسا نہیں کہ اس کی پیشانی میرے پروردگار کی گرفت

میں ہو۔ اور میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے“

کسی شے کی تخلیق کا مقصد اس شے کا خالق ہی جانتا ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس کی ربوبیت ان اسباب سے کرتا ہے۔ جو اس شے کے قبضہ تصرف میں دیتا ہے۔
 ”الاولیٰ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین“ (۱۱)

”سن رکھو کہ پیدا کرنا اور پیرائش کا مقصد مفرد کرنا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ربوبیت کرنا، اللہ رب العالمین کا کام ہے جو بہت برکات والا ہے۔“

ہم نے اس کتاب میں قدر بہ جبر یہ اور صفاتیہ و غیرہم کا ذکر کیا ہے۔ ان کے ذہن میں اپنے تصورات صاف صاف میز نہ تھے۔ اس لئے غلو سے کام لیا۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔ اگر اذراط و تفریط میں نہ پڑتے تو یقیناً ان کے عقائد میں اختلاف بھی نہ ہوتا ہمیں تو سبک اتفاق ہے۔ البتہ اہل ہوا و ہوس جو ظنیات میں الجھے ہوئے ہیں۔ تحقیق سے بعید تر ہیں۔ لیکن ”بے مصلحت نیست ظہور شیطان“ بعض فرقوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ظاہری رسوم شرعیہ جنہیں تکالیف شرعیہ سے موسوم کرتے ہیں فردی نہیں تو قرآن میں یہ ”داعیال“ ہیں۔ جس میں دینی حکومت نے لوگوں کو جکڑ رکھا ہے۔ اور اسی کا خاتمہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ عبادات یعنی تعلق باخدا جسے صلوات سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور معاملات یعنی تعلق باخلق خدا جو ”زکوٰۃ“ کا مفہیم ہے۔ نہایت سادہ ہیں۔ اگر تعلق باخدا صحیح ہو تو تعلق باخلق خدا خود بخود صحیح ہوگا۔ خالق صورتوں ہی میں متصور ہو سکتے ہیں۔ ان تعلقات کی مناسب صورت (FORM) بھی واجب ہے۔

بعض فرقوں نے انبیاء اور رسل اور ائمہ دین کو خدائی کا درجہ دیا ہے۔ اگرچہ سب بشر تھے۔ اور ہم بحث کر چکے ہیں کہ ”انما بشر“ مثلکدہ کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب بشر ہی تھے تو ان فرقوں کے اصل موضوع کے مطابق ہر ایک بشر خدائی کے درجہ پر فائز ہے۔ اور اگر یہ بشر کی مثل ہی تھے تو امتیاز میں کیا کرنا قیاس صحیح الفارق ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان نفوس قدسیہ کو اخلاق کے ایسے درجہ پر دیکھا کہ جہاں ان کی رسائی نہ تھی اور ان کو ذوق البشریاں کیا۔ حالانکہ ان کے ”اسوۂ حسنہ“ کا تقاضہ تھا کہ وہ خود ان اخلاق حسنہ سے متخلق ہوتے نہ کہ ان کی پوجا کرتے۔

یہ نہایت ذلت شرافت انسانی کی ہے۔ انہی تصورات کا جن میں افراط و تفریط
 کار فرما ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عقائد کی زنجیروں میں انسانی آرا و فطرت جکڑی گئی۔
 اور یہ وہ زنجیریں اور طوق ہیں جن سے آنحضرت (ص) نے عالم انسانی کو سبک دوش
 کیا اور ان کی گتہ خلاصی کی۔

بجز میں کوئی آشنا نہ سمجھو اپنی کشتی بھی آسرا نہ سمجھو

موج بھی ہے کسی کے بس کا لوگ

نا خدا کو فتنہ خدا نہ سمجھو

دیگر مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

انگریزی

English
آئے ورپے

- (۱) اسلامک اینڈیا لوجی (مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم) ایم۔ اے۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ ڈی
۸-۸
- (۲) فنڈیشنل مین ریٹیر (مصنف) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی
۰-۵
- (۳) وی ٹیلیسی آف مارکسزم (مصنف ڈاکٹر محمد رفیع الدین) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی
۰-۱۰

اردو

- (۴) عقائد و اعمال (مصنف مظہر الدین صدیقی) ۰-۲
- (۵) اسلام میں حرمت و مساوات - اخوت (مصنف) خواجہ عباد اللہ اختر ۱-۰
- (۶) اسلام اور حقوق انسانی (مصنف خواجہ عباد اللہ اختر) ۱-۲
- (۷) اسلام کا معاشی نظریہ (مصنف محمد مظہر الدین صدیقی) ۱-۸
- (۸) دین فطرت (مصنف محمد مظہر الدین صدیقی) ۱-۸
- (۹) اسلام کی بنیادی حقیقتیں (مصنف خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم دیگر ثقافتی ادارہ) ۲-۸
- (۱۰) اسلام کا نظریہ تعلیم (مصنف ڈاکٹر محمد رفیع الدین) ۱-۰
- (۱۱) اسلام کا نظریہ اخلاق (مصنف محمد مظہر الدین صدیقی) ۱-۱۲
- (۱۲) علم تصوف (مصنف خواجہ عباد اللہ اختر) ۲-۰
- (۱۳) مقام ملت (مصنف میرانا محمد جعفر ندوی) ۶-۰
- (۱۴) خلافت اسلامیہ (مصنف خواجہ عباد اللہ اختر) ۵-۸
- (۱۵) اصول فقہ اسلامی اور حدود اللہ و تعزیرات (مصنف خواجہ عباد اللہ اختر) ۲-۸
- (۱۶) اسلام کا نظریہ تاریخ (مصنف محمد مظہر الدین صدیقی) ۳-۰
- (۱۷) تہذیب و تمدن اسلامی حصار اول (مصنف رشید اختر ندوی) ۵-۰
- (۱۸) تہذیب و تمدن اسلامی حصار دوم (مصنف رشید اختر ندوی) ۶-۸

ذیل طبع کتابیں

- (۱) مسئلہ اجتهاد
(۲) قرآن اور علم جدید
(۳) اسلام میں حیثیت نساء
(۴) ویمن این اسلام
(۵) اسلام اینڈ کامیونزم
(۶) اکنامکس آف اسلام

ادارہ ثقافت اسلامیہ - کلب روڈ - لاہور

ادب اسلامیت

خواجہ عسکرا اللہ اختر
(رہیق ادارہ ثقافت اسلامیہ)

4833

مطبوعات ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
(پاکستان)

ایگزٹ

۱۹۵۲ء

ج اول